قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار

(گفتگو کی شکل میں سوانح عمری)

راشد انور راشد

مطبوعات

تخلیق:

شام ہوتے ہی (غزلیں)

رے میں اُبھرتی پرچھائیں (عشقیہ نظمیں)

تنقید:

مجروح سلطان پوری

ادب کے تعلق سے

شعورِ نقد

فنونِ لطیفہ

پرورشِ لوح و قلم

منتخب نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

فکشن مکالمہ

لفظ آثار

قاضی عبدالستار - اسرار و گفتار

(گفتگو کی شکل میں سوانح)

راشد انور راشد

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

QAZI ABDUL SATTAR: ASRAR-O-GUFTAAR

(Interview)

RASHID ANWAR 'RASHID'

Department of Urdu, A.M.U.

Aligarh-202002

Mobile: 09358257137

email: rashidanwarrashid2012@gmail.com

انتساب

بہترین فکشن نگار

طارق چھتاری

اور

سید محمد اشرف

کے نام

جو قاضی عبدالستار کی آنکھوں کے تارے ہیں!

۲۰۰۷

QAZI ABDUL SATTAR: ASRAR-O-GUFTAAR

(Interview)

RASHID ANWAR 'RASHID'

Edition:............ 2014

Price:............... 300/-

نام کتاب	:	قاضی عبدالستار - اسرار و گفتار
مصنف و ناشر	:	راشد انور راشد
ایڈیشن	:	۲۰۱۴ء
تعداد	:	۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت	:	۳۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	محمد شاہد عالم

ملنے کے پتے:

- ☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
- ☆ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
- ☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
- ☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

arshia publications

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: 9971775969 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

فہرست

OOO

فہرست

ooo

اعتراف

بولنا، انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اسے زبان کے وسیلے سے ادا کرتے ہیں اور اس ترسیل کے ذریعے ہم طمانیت کے جذبوں سے سرشار ہوتے ہیں۔ اپنے دل کی باتوں کو زبان پر لاکر ہمیں سکون ملتا ہے، لیکن اظہارِ خیال کی یہ نوعیت ہماری شعوری کاوشوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ فطری طور پر ہم کچھ باتوں کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں، اس لیے ذہن میں اُبھرنے والے خیالات کو ہم الفاظ کے تابع بناتے ہیں اور زبان کے وسیلے سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان باتوں کی ترسیل کے لیے ہمیں کوئی مجبور نہیں کرتا بلکہ اندرونی طور پر ایک نوع کی بے چینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے مختلف مرحلے آتے ہیں جب وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی دیرینہ کیفیات کو زبان کے ذریعے ادا کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ سرور و انبساط کی کیفیتوں کو محض چہرے کی شادابی نمایاں نہیں کرسکتی۔ خیالات کی زبانی ترسیل اس کیفیت کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس درد و غم کی اذیتیں انسان کو اس قدر خاموش بھی کر دیتی ہیں کہ مجموعی کیفیت دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ حالات کے تحت اگر ہماری زبان پہ مہر لگادی جاتی ہے تو ہم بامعنی طریقے سے اس پر احتجاج بھی کرتے ہیں۔

ان تمام کیفیتوں میں انسان کی شعوری کوششوں کا دخل ہوتا ہے۔ ہم بولتے ہیں، اس لیے کہ ہم بولنا چاہتے ہیں، اپنے خیالات سے دوسروں کو آگاہ کرانا چاہتے ہیں۔ جب تک ہماری خواہش ہوتی ہے، ہم اپنے جذبات کو زبان کے توسط سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے خیالات کی ترسیل مکمل ہوگئی ہے تو ہم فطری طور پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ سننے والے کی دلچسپی ہماری باتوں میں تبھی قائم رہ سکتی ہے جب ہم اپنے خیالات کی مناسب انداز میں ترسیل کر پاتے ہیں۔ ترسیل کے ساتھ خیالات کا اہم ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ ہمارے بیان کرنے کا انداز چاہے جتنا بھی دلچسپ کیوں نہ ہو، اگر بیان کی گئی باتوں میں کوئی قابلِ ذکر پہلو نہیں ہے تو اس سے ہماری دلچسپی کا باقی نہ رہ پانا عین فطری ہے۔ اگر کوئی بات قابلِ توجہ ہو اور اس کا بیان بھی دلچسپ انداز میں کیا جائے تو سننے والا زیادہ متاثر ہوتا ہے، لیکن بیان میں وقفے وقفے سے اگر تکرار کی صورت پیدا ہو جائے تو اہم بات، دلچسپ انداز کے باوجود ذہن و دل پر خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں کر پاتی۔ تکرار سے گریز ہر لحاظ سے بہتر ہے، محتاط رویہ خود ہمارے لیے بے حد معاون ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں ہماری باتیں دوسروں کے لیے دلچسپ اور اہمیت کی حامل قرار پاتی ہیں۔

کبھی کبھی ہمیں اپنی مرضی کے بغیر بھی بولنا پڑتا ہے۔ اس نوع کے اظہار خیال میں ہماری شعوری کوشش کا دخل نہیں ہوتا، لیکن دوسروں کی تحریک پر ہم بولنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ مجبوری میں اختیار کی گئی روش رفتہ رفتہ ہمارے فطری مزاج کا حصہ بن جاتی ہے اور ہم دوسروں کے ذریعے گفتگو میں شریک کیے جانے کے بعد خود ہی اس گفتگو میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ گویا کہ گفتگو کا خاکہ خود ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور بس کسی کی تحریک پر وہ تمام گفتگو زبان کے ذریعے اظہار کے پیرایے تلاش کر لیتی ہے۔ ایسی روش اختیار کرنے والے ہر ماحول میں خود کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی وہ ماحول کو کسی طرح سازگار بنا لیتے ہیں اور اپنی باتوں سے سننے والوں کو متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ایسی روش اختیار کرنے والے

ہر لمحہ اپنی امیج برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی باتوں سے، اپنی نام نہاد صلاحیتوں سے دوسروں کو قائل کرنا ان کی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔

اکثر و بیشتر معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ فطری خواہش نہ ہونے کے باوجود جب ہمیں اظہارِ خیال کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے تو ہم ترسیل میں صرف اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ بس اخلاقیات کا بھرم باقی رہ جائے۔ ایسی صورت میں ہمارے فطری خیالات پوری طرح زبان سے ادا نہیں ہو پاتے۔ ہم دوسروں کی تحریک پر کچھ نہ کچھ بولتے تو ضرور ہیں لیکن اس بولنے میں ہمارے حقیقی جذبات شامل نہیں ہو پاتے۔ نتیجے کے طور پر ہماری زبان سے ادا ہونے والے خیالات میں وہ تاثر شامل نہیں ہوتا جس سے دوسرے بھی متاثر ہو جائیں۔ ایسی صورت میں اہم باتوں سے بھی بے رغبتی عام ہو جاتی ہے اور گفتگو کا سلسلہ ترک کرنے میں ہی سامنے والا عافیت محسوس کرتا ہے۔

بیان کی گئی یہ تمام باتیں انٹرویو کے فن سے براہِ راست تعلق رکھتی ہیں۔ درج بالا سطور میں جن مختلف النوع کیفیات کا ذکر ہوا ہے، وہ تمام باتیں انٹرویو کے مرحلے میں درپیش آتی ہیں۔ بعض لوگوں کے لیے انٹرویو کا مرحلہ حد درجہ دشواریاں پیدا کرتا ہے، تو کچھ لوگ ہنسی خوشی اس منزل سے گزر جاتے ہیں۔ جو لوگ بولنے کے فن سے واقف ہوتے ہیں، یا اس فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں، ان کے لیے بولنا کبھی دشواریاں پیدا نہیں کرتا، لیکن جو لوگ بہت سنبھل سنبھل کر، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کے عادی ہوتے ہیں، ان کے لیے ایسے موقعوں پر یعنی انٹرویو کے دوران کچھ بھی کہنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ زبان سے ادا ہونے والے ہر لفظ کے لیے بے حد محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ زبان سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی۔ چوں کہ بولنے کے دوران انسان مختلف کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، لہٰذا اس کی باتوں میں بعض ایسے پہلو بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ہمیں گفتگو کے دوران کن پہلوؤں کو شامل رکھنا ہے، اس کا خاکہ تو ہم ذہن میں مرتب کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، لیکن ان پہلوؤں کے بیان میں کون سی دوسری باتیں کب اور کس طرح ہماری گفتگو میں شامل

ہو جائیں گی، اس کا ہمیں قطعی اندازہ نہیں ہوتا۔ فطری طور پر کوئی بات ہماری زبان سے ادا تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی نزاکت کا اندازہ ہمیں بعد میں ہوتا ہے۔ زبان پر اختیار رکھنے کے باوجود بہت سی باتیں ہمارے اختیار سے باہر ہو جاتی ہیں اور اس کا خمیازہ ہمیں بعد میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر بہت سے لوگ زبانی انٹرویو سے کتراتے بھی ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ سوالوں کا تحریری جواب رقم کر دیں، لیکن اس نوعیت کے انٹرویوز، بنیادی طور پر انٹرویو کے خانے میں نہیں رکھے جا سکتے۔

انٹرویو، دراصل گفت وشنید، کا عمل ہے۔ سوال کرنے والا کسی سے مخاطب ہوتا ہے اور جواب دینے والا اپنے لحاظ سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی بھی سوال کا کوئی جواب دیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ سوال کرنے والا کسی جواب سے کس حد تک مطمئن ہو پایا ہے اور اس کے مطمئن نہ ہونے کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ اگر وہ اپنی توجیہات پر اصرار اس بنا پر کرتا ہے کہ موضوع سے متعلق کوئی اچھوتا پہلو جواب کی صورت میں سامنے آئے تو وہ اپنے رویے پر قائم رہنے کے لیے پوری طرح حق بہ جانب ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اور گفتگو کے اچھوتے گوشے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کہنے اور سننے کے ذریعے گفتگو کا جو سلسلہ آگے بڑھتا ہے اس میں غضب کی روانی شامل ہوتی ہے۔ ایک بات کا سلسلہ دوسری بات سے قائم ہوتا ہے تبھی اس گفتگو میں فطری حسن پیدا ہوتا ہے۔ ایک اچھے انٹرویو میں ان تمام باتوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کسی بھی انٹرویو کے اچھے برے یا اوسط ہونے میں بنیادی طور پر Interviewer کا رول سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والے یعنی Interviewee کی شخصیت اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ غالباً اردو میں Interviewer اور Interviewee کے لیے کوئی مناسب اصلاح رائج نہیں ہو سکی ہے۔ Interview کے لیے بات چیت، باتیں، یا گفتگو جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں، جو بہت حد تک رائج ہو چکے ہیں، لیکن انٹرویو لینے والا یا جس کا انٹرویو کیا جا رہا ہے، اس کے لیے کوئی بہتر لفظ یا ترکیب وضع نہیں کی جا سکی ہے۔ سوال کرنے والا اگر حاق و جو بند ... موضوع ... بحث ... کرتا ...

کرنے کے ہنر سے واقف ہے تبھی وہ بہتر انٹرویو لے سکتا ہے۔ انٹرویو کے دوران بہت سے مرحلے ایسے آتے ہیں جب اسے ذہنی طور پر حاضر ہونے کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ جواب دینے والا بیشتر معاملات میں راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرسکتا ہے، لیکن انٹرویو لینے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہ برتے۔ جہاں کہیں بھی اسے محسوس ہو کہ جواب دینے والا پہلو بدل رہا ہے، وہیں خوب صورت انداز میں اس کی نشان دہی ضروری ہے۔ موضوع پر اگر اسے گرفت حاصل ہے، تب وہ مختلف موقعوں پر کئی ایسی باتوں کا ذکر بھی کرسکتا ہے جس سے جواب دینے والا گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے مجبور ہو جائے۔ اگر وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر میں طاق ہے تو جواب دینے والے کو مختلف انداز سے مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں دفن بات کو بھی کسی طرح زبان پر لے آئے۔ جواب دینے والے سے اس نوع کی باتوں کا برآمد کرنا ہی انٹرویو کا اصل مقصد ہے۔

بعض لوگ جان بوجھ کر ادبی حلقوں میں ہلچل بلکہ ہنگامہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگ شعوری طور پر انٹرویو کو اس نہج پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ٹھہرے ہوئے پانی میں دائرے بننے کا عمل شروع ہو سکے۔ انٹرویو لینے والا اگر سستی شہرت کا طلب گار ہے تو وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس سے اس کا لیا ہوا انٹرویو لازمی طور پر موضوعِ بحث بنے۔ وہ جواب کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی فاش غلطی بھی کر جاتا ہے اور مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کا انٹرویو کسی طرح مقبول ہو جائے۔ یہ رویہ کسی طرح مناسب نہیں۔ خواہ مخواہ کی شہرت حاصل کرنے کی ہوس اسے قانونی شکنجے میں کس بھی سکتی ہے۔ ہاں جواب دینے والی کی باتوں میں فطری طور پر بعض ایسی باتیں شامل ہو جائیں جس سے ہنگامہ کھڑا ہو جائے تو اس صورت میں انٹرویو لینے والا کچھ نہیں کرسکتا۔ بعض لوگ بلکہ اکثر و بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی طرح سرخیوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ اپنی باتوں میں شعوری طور پر ایسے قابل اعتراض پہلو شامل کر دیتے ہیں جس کی بنا پر ادب کی پُرسکون فضا میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ انتشار

والی بات تو یہاں بھی ہر لحاظ سے نامناسب کہی جائے گی اور جواب دینے والے کو اس پہلو پر سنجیدگی سے ضرور غور کرنا چاہیے، لیکن کسی بنا پر جواب دینے والا اگر اس سنجیدگی کو برقرار نہیں رکھ پایا تو اس کی ذمے داری انٹرویو کرنے والے پر عائد نہیں ہوتی۔ جواب دینے والے نے شعوری طور پر اگر ہنگامہ خود کھڑا کیا ہے تو اس کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔

انٹرویو میں سوال کرنے والے کے لیے نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ انٹرویو میں جب بات سے بات نکلتی ہے تو بہت سی دوسری چیزیں بھی بیان ہوتی چلی جاتی ہیں جن کا اصل موضوع سے تعلق نہیں ہوتا۔ سوال کرنے والا اگر بروقت اس سلسلے میں خوب صورتی کے ساتھ قدغن نہ لگائے تو بہت سی غیر ضروری باتیں انٹرویو کا حصہ بن جائیں گی اور اچھا خاصا انٹرویو بھی غیر سنجیدہ ہو جائے گا۔ لہٰذا جواب دینے والے کو اصل موضوع پر لانا بہت ضروری ہوتا ہے، لیکن یہ مرحلہ اتنا آسان نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔ بعض لوگ غیر ضروری حد تک انا پسند ہوتے ہیں اور اپنی گفتگو میں مداخلت انھیں کسی بھی طرح قبول نہیں ہوتی۔ وہ انٹرویو کی نزاکت پر توجہ نہیں دیتے بلکہ انٹرویو لینے والے کے ٹوکنے کو اپنی ہتک اور توہین سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انٹرویو لینے والا نفسیات کا بہتر شعور رکھتا ہو اور اسی شعور کا استعمال وہ سلیقے سے انٹرویو لینے کے دوران پیش کرے تاکہ جواب دینے والا آپے سے باہر نہ ہو پائے اور انٹرویو کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رہ سکے۔

انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ جس سے گفتگو کی جائے وہ کسی میدان میں خاص شہرت رکھتا ہو یا کسی خاص موقعے پر اسے کسی اہم اعزاز سے نوازا گیا ہو۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کا اپنے میدان میں مقبول ہونا لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ قابل تو بہت ہوتے ہیں لیکن ادبی سطح پر ان کی زیادہ شہرت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کا بھی انٹرویو ممکن ہے، لیکن اشاعت کے سلسلے میں بعض دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ اخبار ورسائل کے مدیران بہ طور خاص یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انٹرویو دینے والا ادبی حلقوں میں خود کتنا متعارف ہے۔ اگر وہ زیادہ مقبول نہیں ہے تو ممکن ہے کہ اس کا بہترین انٹرویو بھی پکی روشنائی

کے مرحلے سے گزر نہ پائے۔ مدیران یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس انٹرویو سے ان کے اخبار یا رسالے کی اہمیت یا مقبولیت میں کیا فرق پڑے گا۔ اگر غیر معروف لوگوں کے انٹرویو اخبار و رسائل میں شائع کیے جائیں تو ممکن ہے قارئین کی عمومی دلچسپی متاثر ہو اور ان کی بنی بنائی امیج بھی خطرے میں پڑ جائے۔

نہ صرف یہ کہ انٹرویو دینے والا اپنے میدان میں ایک خاص شہرت رکھتا ہو، بلکہ انٹرویو لینے والے کی مجموعی شخصیت بھی پُراثر ہونی چاہیے، تبھی ایک بہتر انٹرویو سامنے آ سکتا ہے۔ جواب دینے والا جو ایک خاص مرتبے پر فائز ہے، اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ سوال کرنے والے کی حیثیت ادب کے ایک معمولی طالب علم کی ہے تو وہ نسبتاً غیر سنجیدگی کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہوتا ہے یہ ہے کہ سوال کرنے والا فرماں بردار معتقد کی طرح دوزانو بیٹھا رہ جاتا ہے اور جواب دینے والا اسے کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے مخصوص رعب داب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی لن ترانی جاری رکھتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انٹرویو لینے والا خود بھی بہتر فہم رکھتا ہے اور اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنی کارکردگیوں سے جواب دینے والے کو واقف کرا دیا ہے تو پھر ایک دوسری صورت سامنے آتی ہے۔ اب جواب دینے والا نسبتاً سنبھل کر کچھ بھی کہنے کی کوشش کرتا ہے اور سامنے والے کو اہمیت دینے کی وجہ سے اس کے انداز میں ذہنی ہم آہنگی کا برتاؤ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ انٹرویو دینے والے کی شخصیت وہی رہتی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن صرف انٹرویو لینے والے کے معیار میں تبدیلی ہوتے ہی مجموعی طور پر پورے انٹرویو کا معیار تبدیل ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کے ذریعے خاص آدمی سے لیا گیا انٹرویو بھی عام ہی رہ جاتا ہے، خاص نہیں بن پاتا، لیکن سوال کرنے والا بھی اپنی ایک پہچان رکھتا ہے تو جواب دینے والے کی باتوں سے مساویانہ ذہنی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔

انٹرویو ہنگامی طور پر بھی لیے جاتے ہیں اور انھیں خاصی مقبولیت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک کامیاب ادبی انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ اسے اطمینان اور فرصت سے لیا جائے۔ اگر سوال کی شکل میں بعض باتیں قلم بند کر لی جائیں تو زیادہ مناسب ہے تاکہ

انٹرویو دینے والا انھیں ایک نظر دیکھ کر اپنا ذہن بھی مرتب کر سکے۔ انسان کے ذہن میں بہ یک وقت کئی چیزیں متحرک رہتی ہیں۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ کوئی اہم بات بیان ہونے سے رہ جائے۔ لہٰذا یہ زیادہ مناسب ہے کہ سوال نامے کا خاکہ، جواب دینے والا، انٹرویو سے پہلے ایک نظر دیکھ لے۔ اس بنا پر اسے اپنا جواب منطقی اور ترتیب وار طریقے سے دینے میں آسانی ہوگی۔ کوئی ضروری نہیں کہ سوال نامے میں جو باتیں شامل ہوں، صرف انھیں کی روشنی میں گفتگو کی جائے۔ انٹرویو کے دوران فطری طور پر ایسی باتیں نکلتی چلی جاتی ہیں جن سے نئے پہلو پر گفتگو کے لیے فضا خود بخود ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔ اچھے انٹرویو میں اسی پہلو کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ اگر جواب دینے والا بعض ایسی باتوں کا بیان کر رہا ہے جس سے انٹرویو کرنے والے کو اتفاق یا اختلاف ہے، لیکن ان باتوں سے متعلق کوئی سوال پہلے سے اس کے خاکے میں نہیں ہے تو وہ فوری طور پر کوئی مناسب اور بروقت سوال کے ذریعے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا سکتا ہے۔ ایسا کرنے پر انٹرویو میں ایک فطری حسن پیدا ہو جائے گا جس سے پڑھنے والا زیادہ متاثر ہوگا۔

اطمینان سے لیا گیا انٹرویو زیادہ بامعنی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ انٹرویو لینے والا اگر اپنے مقصد میں ایمان دار نہیں ہے تو سوال و جواب کے نام پر ایک رسمی انٹرویو سامنے آئے گا جس سے نہ تو لوگ متاثر ہوں گے، نہ ہی اس گفتگو سے ادب کی نئی طرفیں کھلیں گی۔ اس کے برعکس گفت وشنید کے مرحلے میں شامل دو لوگ اگر سنجیدہ ہیں تو بامعنی گفتگو سامنے آئے گی۔ جہاں سوال کرنے والے کو اس حقیقت سے واقف ہونا چاہیے کہ لمحۂ موجود میں پوچھی گئی باتیں دستاویزی نوعیت کی حامل ہونے جا رہی ہیں، وہیں جواب دینے والے کو بھی اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ اس کی کہی گئی باتیں کتنی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ اسے کوئی بھی بات پوری ایمان داری اور ذمے داری سے کرنی چاہیے اور اپنے کہے گئے ہر جملے کے لیے پوری طرح ذمے دار ہونا چاہیے۔ جب یہ باتیں سوال کرنے اور جواب دینے والے کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہوں گی تو ایک بہتر انٹرویو سامنے آپائے گا۔

انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ اسے ریکارڈ کرلیا جائے۔ اس سے کئی فائدے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر انٹرویو دینے والے نے ذہنی رو میں بعض قابلِ اعتراض باتیں کہہ دی ہیں اور ان باتوں سے ادبی حلقوں میں ہنگامہ کھڑا ہوگیا، یا کشیدگی کی صورت پیدا ہوگئی تو بڑی عجیب و غریب صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ زیادہ ہنگامہ ہونے کی صورت میں انٹرویو دینے والا ممکن ہے اپنی کہی گئی باتوں سے مکر جائے، یا پھر کوئی اور بہانہ تلاش کرلے کہ میری کہی گئی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور میرا مقصد یہ نہیں کچھ اور تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورت حال اکثر و بیشتر انٹرویو کے بعد سامنے آتی ہے یا آسکتی ہے۔ اگر انٹرویو دینے والے کی شخصیت متنازعہ فیہ رہی ہے تو وہ کتنا ہی سنبھل کر گفتگو کرے، اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ ایسے پہلو ضرور شامل ہوجائیں گے جس سے ادبی حلقوں میں انتشار کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ ایسی صورت میں ریکارڈ کی گئی باتیں ثبوت یا حفاظتی تدابیر کے طور پر انٹرویو لینے والے کے لیے معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بعض موقعوں پر انٹرویو کو ریکارڈ کرنے کی گنجائش نہیں نکل پاتی، اور کاغذ قلم کا سہارا لے کر تمام باتوں کو تحریر کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک حرف کو من و عن نقل کرنا بیشتر اوقات ممکن نہیں ہو پاتا۔ ہم عام طور پر جس روانی کے ساتھ اپنے خیالات کو ادا کرتے ہیں، انھیں اسی روانی کے ساتھ قلم بند نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ہم خاص خاص باتوں کو اشاروں کے طور پر لکھتے چلے جاتے ہیں اور جب ان اشاروں کی مدد سے تمام باتوں کو تفصیلی طور پر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ من و عن باتوں کو لکھنے کے بجائے ہم کچھ ایسی باتوں کو بھی تحریر کردیں، جو جواب دینے والے کی زبان سے ادا نہ ہوئے ہوں۔ اشاروں کی مدد سے تفصیلی باتوں کو لکھنے کے دوران یہ دشواریاں پیش آتی ہیں یا آسکتی ہیں۔ ہم کسی بات کا مجموعی مفہوم تو ذہن میں رکھتے ہیں لیکن جب انھیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو الفاظ اپنے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں، یا جملوں کی تکمیل میں ہماری اپنی سمجھ بوجھ کا دخل ہوتا ہے۔ اس بنا پر قوی امکان رہتا ہے کہ بات کا مفہوم کچھ سے کچھ ہوجائے۔ ایسا ہونے پر اشاعت سے قبل انٹرویو کا اصل مسودہ اگر جواب دینے والے کی نظر سے گزر جائے تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ جواب دینے والا اگر کچھ جملوں کو یا کچھ

الفاظ کو تبدیل کرنا چاہے تو بہت آسانی کے ساتھ اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جواب دینے والا بھی پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے اور جو باتیں جس شکل میں اشاعت کے بعد منظر عام پر آئیں گی، وہ ان باتوں سے اشاعت کے قبل ہی اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے اور ایک بہتر انٹرویو کے لیے یہی زیادہ مناسب ہے۔ اشاعت سے قبل اصل مسودے کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کچھ قابلِ اعتراض باتیں رہ جاتی ہیں اور جواب دینے والا ان اعتراضات کا سامنا کرنے کے لیے خود تیار ہوتا ہے تو پھر سارا معاملہ جواب دینے والے کی ثواب دید پر ہوتا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا اپنی باتوں کو ٹھہر ٹھہر کر اس طرح بیان کرتا چلا جاتا ہے کہ انھیں من وعن ضبطِ تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مفہوم کو ذہن میں رکھ کر اپنے لحاظ سے جملے لکھنے کی نوبت نہیں آتی اور جو کچھ بھی جواب دینے والا اپنی زبان سے ادا کرتا ہے، اسے بالکل اسی طرح لکھ دیا جاتا ہے، لیکن یہاں بھی اپنی مدافعت کے لیے جواب دینے والے کے دستخط لے لینے چاہئیں تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اگر اسے جواب دینے والا اچھی طرح پڑھ لے اور مطمئن ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ انٹرویو دینے والا بھی سکون محسوس کرے گا کہ اس کی باتوں کو غلط طریقے سے بیان نہیں کیا گیا، یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی جملہ یا لفظ نہیں لکھا گیا، ورنہ اس بات کا زیادہ امکان رہتا ہے کہ اپنی طرف سے استعمال کیے گئے لفظ کے ذریعے مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ انٹرویو لینے والا بھی اس عمل کے ذریعے راحت محسوس کرتا ہے کہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر انٹرویو کی اشاعت کے بعد کوئی ہنگامہ ہوا بھی تو اس کی ذمے داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔

تقریری زبان، تحریری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم جس لہجے میں، جس انداز میں گفتگو کرتے ہیں، اسی انداز اور لہجے کو تحریر میں اختیار نہیں کر سکتے۔ زبانی گفتگو میں ایک خاص طرح کی روانی ہوتی ہے۔ اس گفتگو میں وقفے کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے۔ روانی کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے درمیان میں ہی کوئی اور بات ہمارے ذہن

میں آجاتی ہے اور پھر ہم پہلے ادا کی جارہی باتوں کو چند لمحوں کے لیے فراموش کر دیتے ہیں اور فوراً ذہن میں آئی ہوئی باتوں کو ہی گفتگو میں خاص انداز سے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ گفتگو کرنے والے کا ذہن اگر حاضر ہے اور وہ اپنے جوابات کے تئیں سنجیدہ اور ایمان دار ہے تو درمیان کی گفتگو کو مکمل کرنے کے بعد وہ اس پہلو کی طرف دوبارہ واپس آتا ہے جو درمیان میں تشنہ رہ گیا تھا۔ اگر کسی وجہ سے جواب دینے والا اپنی کہی گئی ادھوری باتوں کو مکمل نہیں کر پاتا تو یہ اس کا عیب قرار دیا جائے گا۔ بات سے بات نکلتی ہے تو بہت سی دوسری باتیں بھی گفتگو میں شامل ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن ہمیں اس بات کا اندازہ تو ضرور ہونا چاہیے کہ کون سی باتیں ہماری ترجیحات میں شامل ہیں اور انھیں کس طرح منطقی توجیہ کے سہارے ایک خاص ترتیب میں پیش کرنا ہے۔ زبانی گفتگو میں جو وقفہ آتا ہے، یا اکثر و بیشتر نامکمل جملے جس طرح استعمال ہوتے ہیں، انھیں کے ذریعے انٹرویو کی زبان زیادہ دلچسپ، پُرکشش اور بامعنی ہو پاتی ہے۔ انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تو یہ ساری باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں، اور انٹرویو کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ اگر تحریری طور پر یہ عمل جاری رکھا گیا ہے تو لکھنے والے کو چاہیے کہ ان بنیادی باتوں کو نظر انداز نہ کرے۔ اگر وقفے کو نظر انداز کیا گیا، یا نامکمل جملوں کو غیر ضروری طور پر خود سے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی تو انٹرویو کا فطری حسن متاثر ہوتا ہے۔

انٹرویو کا معاملہ بھی بہت حد تک امتحان کی طرح ہوتا ہے۔ ہم امتحان کی تیاریوں میں طویل عرصے سے مصروف رہتے ہیں، لیکن کامیابی کے لیے صرف یہی تیاری کافی نہیں ہے۔ ہم امتحان گاہ میں بیٹھ کر دو یا تین گھنٹے میں اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال کس طرح کر پائے ہیں، نتیجے کا تمام تر انحصار اسی بات پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بہت اچھی تیاری کے باوجود ہمارا امتحان تشفی بخش نہیں ہو پاتا، اور اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیاری کوئی خاص نہیں ہوتی، لیکن اس کے مقابلے میں امتحان بہتر ہوتا ہے اور نتیجہ بھی ایسا آتا ہے جس سے ہم نہ صرف مطمئن ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات خود بھی حیرت انگیز خوشی سے دوچار ہوتے ہیں۔ گویا کہ ہم نے جیسا کچھ سوچ رکھا تھا، نتیجہ اس سے بہتر برآمد ہوتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ انٹرویو کا بھی ہے۔ انٹرویو کے لیے پہلے سے ذہن کا مرتب ہونا تو ضروری ہے، لیکن ان

لمحات کی ذہنی کیفیات زیادہ اہم ہوتی ہیں، جن لمحات میں ہم کسی اہم شخصیت کے روبرو ہوتے ہیں اور ایسی باتوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں جو اُب تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔ اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اہم شخصیت نے بولنا شروع کیا اور ہم اس کی علمیت سے مرعوب ہوتے چلے گئے۔ پہلے سے ہمارے ذہن میں سوالات کا جو خاکہ تھا، وہ ذہن میں ہی رہ جاتا ہے اور اسے زبان پر لانے کی گنجائش نہیں نکل پاتی۔ اگر جواب دینے والے کی شخصیت زیادہ بھاری بھرکم ہے تو بیشتر اوقات بنیادی اعتراضات کا ذکر کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو پاتی۔ سوال کرنے والا اگر کسی بھی طرح اہم شخصیت سے مرعوب ہو گیا تو وہ اپنے اعتراضات کسی طرح ظاہر نہیں کرسکتا اور خاموشی کے ساتھ گفتگو کو سنتا چلا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انٹرویو مکمل تو ہو جاتا ہے لیکن انٹرویو جس نہج اور معیار کا ہونا چاہیے، اس میں کامیابی نہیں مل پاتی۔

انٹرویو کے ذریعے فن اور فن کار دونوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بعض فن پارے جو کسی بھی طرح فہم کی گرفت میں نہیں آتے، اس مرحلے پر مذکورہ تخلیق کار کا انٹرویو ہی ہماری مدد کرسکتا ہے۔ انٹرویو کے دوران ممکن ہے تخلیق کار نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے فن پاروں کے متعلق گفتگو نہ کی ہو، لیکن مختصر یا اشاراتی گفتگو میں بھی بعض ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو تفہیم کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں معاون ہوں۔ انٹرویو کے ذریعے تخلیق کار کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ تخلیق کار بے تکلف انداز میں اپنے شب و روز کا بیان کرتا ہے۔ فن پارے کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاں تخلیق کار کی ایک مختلف امیج ہمارے ذہن میں بنتی ہے، وہیں انٹرویو میں وہ ایک عام آدمی نظر آتا ہے۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ وہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بعض بنیادی لیکن بہت حد تک پوشیدہ پہلوؤں سے واقف ہونے کے بعد تخلیق کار سے زیادہ ذہنی قربت محسوس ہو سکتی ہے۔

قاضی عبدالستار سے بھرپور گفتگو کا خاکہ طویل عرصے سے ذہن میں مچل رہا تھا۔ میں نے وقفے وقفے سے مختلف ادبی شخصیات سے مختلف رسالوں کے لیے انٹرویوز کیے تھے جنھیں سنجیدہ ادبی حلقوں میں خاطر خواہ سراہا گیا تھا۔ سن ۲۰۰۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے

شعبۂ اردو سے وابستگی کے بعد میں نے انٹرویو کے سلسلے کو منظم طریقے سے انجام دینے کا منصوبہ کئی مرتبہ بنایا، لیکن دیگر مصروفیات کے سبب اس کی گنجائش نہیں نکل پائی۔ علی گڑھ میں ادبی شخصیات کی کہکشاں موجود تھی۔ کئی اہم لوگ اس زمانے میں حیات تھے، لیکن معین احسن جذبی کے علاوہ میں کسی کا انٹرویو نہیں کر پایا۔ آج سوچتا ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے کہ کاش میں نے کچھ اور اہم شخصیات سے بھی گفتگو کی گنجائش نکالی ہوتی۔ بہر حال قاضی عبدالستار کا خیال مجھے اکثر پریشان کرتا اور خواہش ہوتی کہ ہزار مصروفیات کے باوجود ان سے باتیں ضرور کی جائیں تاکہ بیش قیمتی یادوں کو محفوظ کرنے کا سنہرا موقع دستیاب ہو سکے۔

علی گڑھ چوں کہ فاصلوں کا شہر نہیں ہے اور تمام لوگوں سے ملاقات بہت آسانی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں خیال کو عملی جامہ پہنانے میں تاخیر نہیں ہوتی۔ ملاقات کا خیال ذہن میں آیا اور اگلے ہی لمحے اپنی پسندیدہ شخصیت کے روبرو حاضر ہو گئے۔ چوں کہ مجھے قاضی عبدالستار کے پڑوسی ہونے کی سعادت نصیب تھی، اس لیے کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ ان سے انٹرویو کا مرحلہ جلد از جلد مکمل کر لینا چاہیے۔ اکثر و بیشتر ان سے سرِ راہ بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی اور جب بھی ان سے آمنا سامنا ہوتا تو انٹرویو کا خیال ذہن میں تازہ ہو جاتا۔ ایک سال قبل انھوں نے انٹرویو کے لیے حامی بھر لی تھی، لیکن درمیان میں ہی انھیں ہارٹ کا مرض لاحق ہو گیا اور ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دے دیا۔ اس بنا پر انٹرویو کا معاملہ التوا میں پڑا رہا۔ بہت بعد میں جب قاضی صاحب کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے جھجکتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار ایک بار پھر کیا۔ انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ میری درخواست قبول کی اور ۱۲ر نومبر ۲۰۱۳ء کی شام، میں انٹرویو کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارادہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو تین دنوں میں انٹرویو مکمل کر لوں گا، لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو پروگرام رفتہ رفتہ تبدیل ہونے لگا۔ طویل سے طویل انٹرویو بھی ایک نشست میں کیا جا سکتا ہے، لیکن جہاں معاملہ احتیاط کا ہو، وہاں کوشش کے باوجود انٹرویو کو ایک نشست میں مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ قاضی صاحب زیادہ دیر تک نہیں بول سکتے اور اس ضمن میں وہ ڈاکٹر کے مشورے پر سنجیدگی سے عمل کرتے ہیں، لہٰذا اسی خیال کے

پیش نظر میں نے دو تین دنوں میں اپنی باتوں کو مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا، لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ قاضی صاحب کے ذہن و دل میں یادوں اور باتوں کا ایسا ہجوم ہے جو ضبطِ تحریر میں آنے کے لیے مضطرب ہے۔ چوں کہ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح تحریر نہیں کی تھی اور ایک کامیاب تخلیقی زندگی گزاری تھی، ساتھ ہی علی گڑھ کے تعلق سے بھی بیش قیمت یادوں کے سلسلے تھے، لہٰذا ضروری تھا کہ ان سے گفتگو کے سلسلے کو حتی الامکان طول دیا جائے تا کہ انٹرویو اور سوانح کے درمیان کی چیز وجود میں آسکے۔ اسی خیال نے ان سے طویل گفتگو کے لیے مجبور کیا اور میں نے روزانہ دو گھنٹے کا وقت ان سے ملاقات کے لیے مخصوص کرلیا۔ ۱۲ر نومبر ۲۰۰۳ء کو گفتگو کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ۱۴ر اپریل ۲۰۱۴ء تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ گویا کہ چھ مہینے تک ان کی خدمت میں حاضری کے بعد یہ کتاب وجود میں آئی اور مجھے لگتا ہے کہ اس کتاب کو انٹرویو اور سوانح کی ملی جلی شکل کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کتاب ایسی سوانح کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے جو انٹرویو کے فارم میں پیش کی گئی ہو۔ اردو میں اس نوع کی کتابوں کا رواج عام نہیں، لیکن انگریزی میں یہ سلسلہ بہت پہلے سے جاری ہے۔

آغاز میں یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ اردو میں اس نوعیت کا شاید یہ پہلا کام ہے۔ یعنی ایک ادیب سے اتنی طویل مدت تک گفتگو شاید کسی نے نہیں کی ہو، لیکن میری اس غلط فہمی کا ازالہ کوثر مظہری اور شعیب رضا خاں نے فوراً ہی کر دیا۔ اوّل الذکر نے سُمت پرکاش شوق کی کتاب ''باتیں فراق سے'' کی جانب توجہ دلائی، جب کہ آخرالذکر نے جمیل اختر کی مرتبہ کتاب ''نوائے سروش'' کا حوالہ دیا جو قرۃ العین حیدر کے طویل انٹرویو پر مبنی ہے۔ میں نے یہ دونوں کتابیں دیکھیں اور اس بات کا خیال رکھا کہ میری یہ کتاب ان دونوں کتابوں سے مختلف ہو۔ اس مقصد میں مجھے کہاں تک کامیابی مل پائی ہے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

گزشتہ صدی کی چھٹی ساتویں دہائی میں جدیدیت کا شور بلند ہونا شروع ہوا اور اس رجحان کے تحت تجریدیت اور علامت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہی دور قاضی عبدالستار کے عروج کا زمانہ بھی رہا ہے۔ قاضی صاحب

نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں خوب صورت علامتوں کا بھی استعمال کیا لیکن ان کے یہاں کہانی پن کا تصور آن بان اور شان کے ساتھ برقرار رہا۔ جدیدیت کے زیر اثر ابہام نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ ترسیل کا مسئلہ دن بہ دن پیچیدہ ہوتا چلا گیا لیکن تجریدیت کو ہی ادب کا معیار قرار دیا گیا اور واضح انداز میں لکھے گئے بہترین ادب کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔ قاضی عبدالستار جیسے لوگوں کو اس رجحان نے کافی نقصان پہنچایا۔ ان کا تخلیق کردہ ادب، تجریدی ادب کے سامنے قابلِ اعتنا نہیں گردانا گیا اور بحث ومباحثے کے بجائے ان کے فن پاروں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن قاضی صاحب نے کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ چھ مہینے کی مستقل ملاقات کے دوران میں نے قاضی عبدالستار کو ایک مختلف انسان پایا۔ ان سے متعلق ذہن میں جو امیج پہلے تھی، وہ پوری طرح تبدیل ہوگئی۔ میں ابتدا میں انھیں ایک سخت مزاج اور انا پرست ادیب سمجھتا تھا۔ یہ خیال بھی ذہن میں گھر کر گیا تھا کہ وہ انسانی قدروں کو اہمیت نہیں دیتے اور ہر لمحہ خود پسندی کے زعم میں سرشار رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ تمام باتیں اس لیے بھی نقش ہوگئی تھیں کہ اکثر وبیشتر لوگ ان سے متعلق اسی طرح کی باتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی سخت مزاجی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں ان سے متعلق لوگوں کی عمومی باتیں مجھے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ میرے محدود اور ناقص مشاہدات بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں۔ میں نے جب کبھی بھی انھیں کسی فنکشن میں دیکھا وہ تمام لوگوں سے مختلف نظر آئے۔ کسی سے کوئی بات چیت نہیں، بالکل خاموش اور اپنی دنیا میں مگن۔ ہر لمحہ چہرے پر تفکر اور کسی قدر ناگواری کے تاثرات، جیسے ہر شخص سے ناراض ہوں اور تمام لوگوں کی نااہلی پر حقارت سے اُچٹتی نگاہ ڈال رہے ہوں۔ میں نے انھیں کبھی ہنستے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی قہر آلود نگاہوں کی تاب اچھے اچھے نہیں لا سکتے تھے۔ گرج دار آواز کے ساتھ لہجہ بے حد ترش۔ مشاہدات میں شخصیت کے یہ عناصر کارفرما ہوں اور مختلف لوگوں کی بے تکلف آرا سے بھی ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہو، تو آخر کس بنا پر قاضی عبدالستار

کی کوئی دوسری امیج ذہن میں آپاتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا پڑوسی ہوتے ہوئے بھی میں ان سے ملنے میں کتراتا تھا۔ انٹرویو کا معاملہ اگر دو تین دنوں میں ہی مکمل ہو گیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ قاضی عبدالستار کی وہی امیج میرے ذہن میں برقرار رہتی لیکن حسنِ اتفاق سے گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور پھر جب مستقل ملاقاتوں میں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ایک نئے قاضی عبدالستار سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں نہ صرف منکسر المزاج پایا بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ وہ بے حد نرم دل ہیں اور محبت کی دولت فراخ دلی سے لٹانے میں انھیں قلبی سکون نصیب ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آغاز میں وہ بے تکلفی کو راہ نہیں دیتے، لیکن حسنِ اتفاق سے اگر مستقل ملاقاتوں کے مواقع دستیاب ہونے لگیں تو پھر گفتگو میں ایک خاص نوع کی بذلہ سنجی بھی شامل ہوتی چلی جاتی ہے، اور بے تکلف گفتگو کے درمیان شخصیت کے پوشیدہ گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بے تکلف گفتگو کے دوران بھی قاضی صاحب تہذیب اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ گویا کہ گفتگو بے تکلف انداز میں ہوتی ہے، لیکن گفتگو کی سنجیدگی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

قاضی صاحب نے ہمیشہ ہی بڑے لوگوں کے خلاف مورچہ سنبھالا اور چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ اختیار کیا۔ عام طور پر صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ لوگ ہزار اختلافات کے باوجود بڑوں سے ناراضگی مول لینے کی حماقت نہیں کرتے، اور ان کے دل کی تمام تر بھڑاس چھوٹوں کے حصے میں آتی ہے۔ بنیادی طور پر اس رویے کو فروغ دینے والے خود چھوٹی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ بات تو جب ہے کہ ہمارے اختلافات کی بنیادیں مستحکم ہوں تاکہ بڑوں سے ٹکرانے میں بھی ہمیں کوئی جھجک محسوس نہ ہو، جب کہ بعض کمزوریوں کے باوجود ہم اپنے خوردوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کریں، کیوں کہ مستقبل میں ہمیں بعد کی نسل ہی آگے لے جانے میں معاون ثابت ہوگی۔ تمام بڑے لوگوں کی طرح قاضی صاحب نے زندگی میں اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا ہے۔ وہ تمام زندگی بڑوں سے معرکہ آرائی میں مصروف رہے لیکن چھوٹوں کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا، اور زیادہ سے زیادہ ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

قاضی صاحب کی پیش گوئیوں میں غضب کی صداقت ہوتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ انھوں نے جس مدت اور عرصے تک کسی بات کے واقع ہونے کی بات کی ہو، اس میں بعض وجوہات کے سبب تھوڑی تبدیلی آ گئی ہو، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ دیر سویر اس بات کی صداقت سامنے نہ آئے۔ مسلسل غور وفکر کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے جینوئن تخلیقی فن کار کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو پاتی ہے۔ غور وفکر کے لیے تنہائی بنیادی شرط ہے۔ ہم زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اسی وقت سنجیدگی کے ساتھ غور کر سکتے ہیں جب ہمیں تنہائی میسر ہو۔ قاضی صاحب گزشتہ تیس برسوں سے تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور تنہائی انھیں بہت عزیز ہے۔ اس تنہائی کا استعمال جہاں وہ اپنا محاسبہ کرنے کے لیے کرتے ہیں، وہیں تخلیقی زندگی اور اس سے وابستہ مختلف پہلوؤں پر مسلسل غور وفکر کے انوکھے زاویے بھی سامنے آتے ہیں جن کا اظہار وہ پیشن گوئیوں کی شکل میں کرتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر پیشن گوئیاں پہلی نظر میں بے معنی معلوم ہوتی ہیں، لیکن کچھ وقت گزر جانے کے بعد وہ ساری پیشن گوئیاں رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ اختیار کرتی چلی جاتی ہیں۔

قاضی صاحب کے عام جملوں میں بھی ڈائیلاگ کا انداز شامل ہوتا ہے۔ اس بنا پر زیادہ تر لوگ ان کی حقیقی باتوں کو بھی فرضی تصور کر لیتے ہیں۔ دراصل ہمارے مخصوص انداز پر ہی بہت سی باتوں کا انحصار ہوتا ہے۔ بعض لوگ جھوٹ کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے جب کہ بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سچ کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ قاضی صاحب بھی ایسے ہی افراد میں شامل ہیں۔ بہترین فکشن رائٹر ہونے کی بنا پر یہ تو ممکن ہے کہ بعض چیزوں کے بیان میں انھوں نے کچھ مبالغے سے کام لیا ہو، لیکن ان کی باتوں میں صداقت ضرور ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا مخصوص انداز لوگوں کو مصنوعی معلوم ہوتا ہے اور ان کی حقیقی باتیں، پُرتصنع باتوں کے خانے میں ڈال دی جاتی ہیں۔

قاضی صاحب کا ذہن حیرت انگیز طور پر مرتب دکھائی دیتا ہے۔ وہ گفتگو کا سلسلہ چاہے جہاں سے بھی شروع کریں اور جن مرحلوں سے گزارتے ہوئے ان باتوں کو اختتام تک پہنچانے کی کوشش کریں، ان میں منطقی اور استدلالی انداز کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

رواں گفتگو میں بھی وہ جزئیات کو نظر انداز نہیں کرتے اور تمام پہلوؤں میں ایک مخصوص ربط قائم ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اگر کہانی بھی گڑھتے ہیں تو اتنی سرعت اور چابک دستی کے ساتھ کہ ان کی تخلیقی ذہانت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں کہانی بنانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ہو اور وہ اپنے مخصوص انداز میں صرف حقیقی باتوں کا ہی بیان کرتے ہوں۔ دونوں باتیں ممکن ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو میں غالباً دوسرا پہلو ہی حاوی ہوتا ہوگا ورنہ ان کے چہرے کے تاثرات اور ان کے مخصوص انداز میں بلا کا اعتماد شامل نہیں ہوتا۔

قاضی عبدالستار کو اپنی انا، دوسری تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہے، لیکن شاید اسی انا کے ذریعے ان کا وقار بھی قائم ہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہے کہ معاصر منظرنامے پر بحیثیت فکشن رائٹر ان کی کیا اہمیت ہے۔ تخلیق کار اگر بہت زیادہ خاکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کم تر ثابت کرتا ہے تو دنیا والے بھی اسی زاویے سے اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قاضی صاحب اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ مصنف کو اپنی اہمیت کا احساس ہونا ہی چاہیے۔ اسی کے ذریعے اس کے اعتماد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو کم تر اور حقیر سمجھنے لگے تو دنیا کسی بھی طرح اسے بہتر اور برتر تسلیم نہیں کرے گی۔ قاضی صاحب کا یہی رویہ نہ صرف ان کی تحریروں کے ذریعے اجاگر ہوتا ہے بلکہ گفتگو میں بھی اس کی مختلف جہتیں آشکار ہوتی ہیں۔ ممکن ہے دوسرے لوگ ان کے اس رویے کو غرور اور تکبر سے بھی تعبیر کریں، لیکن میں نے اس رویے میں غرور اور تکبر سے زیادہ اپنے اوپر حد درجہ اعتماد اور اپنی تحریروں پر غیر معمولی تیقن کی جھلک دیکھی ہے۔ ایک تخلیقی فن کار اگر اسی نوع کے اعتماد سے محروم ہے تو وہ خود اپنے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ اس کے اعتماد کو دنیا کس زاویے سے دیکھتی ہے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ تخلیقی فن کار کے لیے لوگوں کی وہ مختلف رائے کیا معنی رکھتی ہے، یا تخلیقی فن کار اس رائے سے کتنا متاثر ہوتا ہے، یا اسے ہونا چاہیے، اس پر بھی تفصیل سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ان باتوں کی وضاحت کے بجائے میں اس بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ قاضی عبدالستار نے لوگوں کی آرا کو کبھی اہمیت نہیں دی اور مخالفین کے

منفی رویوں سے کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ ذہن ودل کی رہنمائی قبول کی۔ کبھی دل کی آواز پر لبیک کہتے رہے اور کبھی اپنے مخصوص ذہن کے پیش نظر تمام باتوں کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ یعنی جو کچھ بھی کیا، اپنی سطح پر کیا۔ نہ تو دوسروں سے متاثر ہوئے، نہ ہی منفی رویوں سے پریشان ہو کر اپنی راہ تبدیل کی۔ جن لوگوں نے قاضی عبدالستار کو دور سے دیکھا ہے، وہ ان کے عمومی رویوں کو خود پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن جو لوگ ان کے قریب رہے ہیں، ان کی رائے یقیناً مختلف ہوگی، یا ہو سکتی ہے۔

قاضی عبدالستار کے اخلاقی اور انسانی رویوں سے متعلق بھی لوگوں کے تاثرات قدرے مختلف اور کسی قدر تلخ ہو سکتے ہیں۔ وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور کوئی بھی بات بلا جھجھک کسی کے بھی سامنے اور کہیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ کسی کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے شعوری طور پر ایسا نہیں کرتے۔ یہ رویہ ان کے بنیادی مزاج میں شامل ہے۔ حق گوئی نے انھیں کسی قدر بے باک بنا دیا ہے اور اسی بے باکی کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں میں اعتراضات کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ جو کوئی بھی مصلحت کوشی سے دور ہوگا اور سچائی کے بیان میں پوری طرح ایمان دار اس کے لہجے میں بے باکی تو لازمی طور پر شامل ہو جائے گی۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ہماری بے باکی خواہ کتنی ہی تلخ صداقتوں پر مبنی ہو، وہ بہر حال ہماری ترجیحات کا پرتو ہوتی ہے۔ جو چیز ہمارے لیے مکمل صداقت کا درجہ رکھتی ہے، وہی چیز دوسروں کے لیے کلی طور پر بالکل ویسی نہیں ہو سکتی۔ ہماری رائے میں کہیں نہ کہیں ہماری عصبیت کام کرتی ہے اور ہم شعوری طور پر غیر جانب دار رہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر جانب داری کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کے انسانی اور اخلاقی رویوں کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ان کی سخت مزاجی کے بہت سے قصے مشہور ہیں، لیکن میں ان تاثرات کو کیسے منہا کر دوں جو پانچ ماہ سے زیادہ عرصے کی مسلسل رفاقت کے بعد میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے کہ قاضی عبدالستار سے متعلق لوگوں کے عمومی تاثرات کس قدر تلخ ہوں، لیکن اتفاق سے میرے تاثرات قدرے خوش گوار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مجھے اپنی محبتوں اور شفقتوں سے سیراب کیا بلکہ ایسی فضا کے قیام میں بھی

ہر ممکن تعاون دیا جس سے ذہنی ہم آہنگی کو مزید تقویت ملتی ہے۔ وہ فون کے ذریعے پابندی کے ساتھ خاکسار کی خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں بھولتے۔ وقفے وقفے سے چائے کی دعوت میں شریک کرتے ہیں اور مزے مزے کی باتوں سے مخصوص محفل کو بھی زعفران زار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی عبدالستار گزشتہ تیس برسوں سے تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن وہ تنہائی سے گھبراتے نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک بھرا پرا گھر ہے لیکن وہ اپنی شرطوں پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ گھر کے زیادہ تر لوگ دلّی، آگرہ اور کچھ مچھریٹہ میں قیام پذیر ہیں لیکن وہ علی گڑھ کے سرسید نگر میں کرایے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو بہت آسانی کے ساتھ علی گڑھ میں بھی شان دار کوٹھی بنوا سکتے تھے لیکن اس سلسلے میں وہ کبھی سنجیدہ نہیں رہے اور کرایے کے مکان میں ہی ٹھاٹ سے زندگی گزارتے رہے۔ سرسید نگر میں بھی وہ اپنے چند ملازمین کے ساتھ بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت بستر میں لیٹے لیٹے کسی کتاب یا رسالے کے مطالعے میں صَرف ہوتا ہے۔ اخبار وہ پابندی سے پڑھتے ہیں۔ ملک اور بیرونِ ملک کے سیاسی حالات کے بجائے انھیں اردو کی ادبی دنیا سے متعلق خبروں سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ادبی خبروں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں اور اکثر ان خبروں پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ بھی فرماتے ہیں۔ کوئی بھی ملنے والا جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو اس کی ضیافت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ فوراً ہی ملازم کو آواز دیتے ہیں جو گودریج کی الماری کھول کر عمدہ بسکٹ کا پیکٹ اور گزک کا ڈبہ نکال کر سلیقے سے پیش کرتا ہے اور پھر مہمان کے لیے بہتر چائے کے انتظام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مچھریٹہ اور سیتاپور میں فصل کی کٹائی کے لیے ملازموں کو جانا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں قاضی صاحب کی ذہنی اذیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۸۳ سال کی عمر اور پورے گھر میں وہ تنِ تنہا۔ کبھی بھی کسی بھی چیز کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ دن کا وقت تو خیر کسی طرح گزارا جا سکتا ہے لیکن رات کا مرحلہ کیسے طے ہو۔ اس کے لیے قاضی صاحب پڑوس کے ہی کسی

ملازم کو صرف گھر میں سونے کے لیے بلاتے ہیں اور دو سو روپے یومیہ پیش کرتے ہیں۔ ملازم نہ صرف علیٰحدہ کمرے میں گدے دار بستر کے مزے لیتا ہے بلکہ دو سو روپے یومیہ کے لحاظ سے مہینے ڈیڑھ مہینے میں اس کی اچھی خاصی کمائی بھی ہو جاتی ہے۔

قاضی صاحب اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کے تمام بچے اپنی اپنی فیملی کے ساتھ آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن وقفے وقفے سے جب وہ سرسید نگر کے چھوٹے سے مکان میں جمع ہوتے ہیں تو اس دوران قاضی صاحب کے یہاں جشن کا ماحول ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کو چوں کہ مٹھائیاں پسند ہیں، اس لیے عمدہ قسم کی مٹھائیوں کے ڈبّے ان کے صاحب زادے بڑے شوق سے خدمتِ عالیہ میں پیش کرتے ہیں جب کہ بہوئیں قاضی صاحب کی پسند کے مطابق طرح طرح کے پکوان اور لذیذ کھانوں کی تیاری میں مصروف رہتی ہیں۔ قاضی صاحب کی ویران زندگی میں بہار آ جاتی ہے، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہتا۔ چار پانچ دنوں کے بعد جب سب لوگ آگرہ، دلّی اور مچھریٹہ کی راہ اختیار کرتے ہیں تو پھر قاضی صاحب کے لیے اگلے دو تین دن بڑے صبر آزما ہوتے ہیں۔ جشن کے بعد کا سناٹا انھیں بُری طرح کھلتا ہے اور اس کی اذیتیں بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہیں، لیکن قاضی صاحب جلد ہی ان مشکل حالات پر قابو پا لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ تنہائی کی زندگی معمول پر آنے لگتی ہے۔ گزشتہ چھ مہینوں میں مجھے قاضی صاحب سے جتنی قربت نصیب ہوئی، اس کی روشنی میں یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بیشتر اوقات وہ اپنی تنہائیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں، لیکن بعض اوقات اسی تنہائی نے انھیں ذہنی طور پر منتشر بھی کیا ہے۔ وہ تمام زندگی اپنے ابو جان کی راہ دیکھتے رہے اور جدائی کی اذیتوں سے دوچار ہوتے رہے اور اب ان کی بے قرار آنکھیں اپنے نونہالوں کی واپسی کا خواب جگائے سونے جاگنے کے عمل میں مصروف رہتی ہیں۔

قاضی صاحب اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں متوازن رویہ اختیار کیا جائے، لیکن اگر کسی بنا پر حالات سازگار نہیں ہو پاتے تو وہ شاد و ناشاد تقدیر سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے مرحلوں میں ان کی مخصوص انا

بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ قاضی صاحب کی پہلی بیگم جو کہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، ایک مرتبہ اپنے گھر 'کرسی' جانے کے لیے بضد ہوئیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ دو چار دن کے بعد کسی ملازم کے ساتھ چلی جانا، لیکن وہ اپنی ضد پر بہ دستور قائم رہیں اور قاضی صاحب کی مرضی کے خلاف اپنے ملازم کے ساتھ 'کرسی' تشریف لے گئیں۔ قاضی صاحب کو اس بات سے بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بیگم صاحبہ کو واپس لانے نہیں جائیں گے۔ بیگم صاحبہ کو شاید قاضی صاحب کی اس 'خوبی' کا علم نہیں تھا کہ وہ قول و فعل میں اس قدر استحکام رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بہت آسانی کے ساتھ ساس صاحبہ، ماموں خسر اور بھی دیگر قریبی لوگوں کی گزارشوں کو بہت آسانی کے ساتھ رد کردیا اور اس بات پر اڑی رہیں کہ جب تک قاضی عبدالستار خود انھیں لینے نہیں آئیں گے وہ کسی بھی قیمت پر واپس نہیں آئیں گی۔ قاضی صاحب کا عندیہ بالکل واضح تھا کہ جب میرے منع کرنے کے باوجود وہ خود اپنی مرضی سے گئی ہیں تو میں انھیں لینے کیوں جاؤں۔ وہ اگر کئی لوگوں کی گزارشوں کے باوجود واپس نہیں آئیں تو میں بلا وجہ ہی ان کی چوکھٹ پر ناک رگڑنے قطعی نہیں جاؤں گا، اور وہ نہیں گئے۔ یہاں تک کہ تین دہائیاں گزر گئیں اور بد قسمتی سے بیگم صاحبہ اللہ کو پیاری بھی ہوگئیں، لیکن قاضی صاحب اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے جگر چاہیے اور وہ بھی ایسے لمحے میں جب دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش و پرداخت کا مسئلہ بھی سامنے ہو۔ اس کے باوجود قاضی صاحب نے وہ فیصلہ کیا جس کی ہمت شاید بہت کم لوگ ہی جٹا پائیں۔ قاضی صاحب کو آج بھی اپنے اس رویے پر بالکل پچھتاوا نہیں ہے۔ اپنے اوپر حیرت انگیز طور پر قابو رکھنے کا اس سے نمایاں ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔

قاضی صاحب کا ردِ عمل بھی عام لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ کوئی بھی بات جو اُن کے مزاج کے خلاف ہوتی ہے، اس پر بہت سختی سے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ اگر حالات ایسے نہیں ہیں کہ فوراً ہی اس کا ردِ عمل سامنے آئے تو ایسے موقعوں پر بھلے ہی خاموشی اختیار کرلیتے ہوں، لیکن اندر ہی اندر ایک خاموش ردِ عمل شدت اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور حالات جیسے ہی موافق ہوتے ہیں، اس کی عملی صورت سامنے آنے لگتی ہے۔ قاضی صاحب

کے لمبے اور خوب صورت بال اس کی نمائندہ مثال ہیں۔ بچپن میں والدہ محترمہ کی سخت ہدایت کے باعث وہ برسوں 'منڈن' کی آزمائشوں سے دوچار ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ انٹرمیڈیٹ میں پہنچنے کے بعد بھی 'منڈن' کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ چوں کہ والدہ محترمہ کا سخت رعب شروع سے ہی ان کے ذہن پر طاری تھا، اس لیے وہ چاہ کر بھی 'منڈن' کے خلاف احتجاج نہ کر سکے لیکن ایک خاموش انتقام کا جذبہ ان کے ذہن میں مسلسل پروان چڑھتا رہا اور جب اس انتقام کی عملی صورت سامنے آئی تو پھر انھوں نے اپنے دراز گیسوؤں کو ہاتھ لگانے کی اجازت کسی 'نائی' کو نہیں دی۔ یہ بات کم حیرت انگیز نہیں کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد قاضی صاحب نے اب تک کی زندگی میں کبھی 'سیلون' کا رُخ نہیں کیا۔ ہاں جب کبھی انھیں دراز گیسوؤں کو تھوڑی ترتیب دینے کی ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے اپنے ملازمین کو مخصوص ہدایت کے ساتھ برائے نام زحمت دی۔ مستقل 'منڈن' کے خلاف پوری زندگی 'سیلون' نہ جانے کا عزم قاضی صاحب کی مستقل مزاجی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ بعض لوگ چہرے مہرے سے بھی ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب بھی ایسے ہی چنندہ لوگوں میں ہیں۔ جو شخص بھی براہِ راست ان سے واقف نہیں، وہ بھی قاضی عبدالستار کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ عام لوگوں سے یقیناً مختلف ہیں، اور اس مختلف ہونے میں ان کے دراز گیسوؤں کا خاص دخل ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کی بعض عادتیں بھی دوسروں سے قطعی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ عمر کی چوتھی دہائی پار کرتے ہی لوگ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد محتاط ہو جاتے ہیں اور خاص کر شکر کا کم سے کم استعمال ان کی ترجیحات میں شامل ہو جاتا ہے۔ عمر کی ۸۳ بہاریں دیکھنے کے باوجود قاضی صاحب شکر کے معاملے میں کسی طرح کا پرہیز نہیں کرتے۔ مٹھائیوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ امرتی، برفی، پیڑا، سوہن پاپڑی اور گاجر کا حلوہ انھیں بے حد مرغوب ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں ان کی چائے زیادہ میٹھی ہوتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ انھیں 'شوگر' کی کوئی شکایت نہیں ہے، لہٰذا ڈاکٹروں نے بھی انھیں حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا ہے۔

وہ ڈاکٹروں کی ہدایات پر بہت سنجیدگی سے عمل کرتے ہیں۔ عمر کے لمبے عرصے تک انھوں نے شراب کے سہارے زندگی گزاری لیکن دو سال قبل جب انھیں زبردست ہارٹ اٹیک ہوا اور ڈاکٹر نے سختی کے ساتھ شراب سے پرہیز کی بات کہی تو انھوں نے اپنے مزاج کے برخلاف اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور آج وہ شراب کے بغیر زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں۔ ایک شخص جس نے زندگی کا اچھا خاصا عرصہ شراب کے سہارے گزارا ہو، وہ شراب سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر لے تو ذہنی طور پر وہ کن اذیتوں سے دوچار ہو رہا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی گفتگو میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اب میری زندگی میں دلچسپی نام کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ جوانی کے لمحات گزر چکے ہیں اور گزشتہ تیس برسوں سے تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ گوشت اور شراب سے دلچسپی تھی تو قلب کے عارضے نے وہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ اس کے باوجود انھیں زندگی کے بقیہ ایام بے حد عزیز ہیں۔ صحت کے معاملے میں اب وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تمام ہدایات پر عمل کرتے ہیں، اور اپنی جانب سے ایسی کوئی کوتاہی نہیں برتتے جو اُن کے لیے پریشان کن ثابت ہو۔

قاضی صاحب کو سردی کا موسم ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ دوسروں کے مقابلے انھیں کچھ زیادہ ہی سردی لگتی ہے اور اس سے بچنے کے لیے وہ ہر ممکن تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ سوئٹر اور جیکٹ کے علاوہ دن میں بھی موزے، دستانے اور گرم 'ٹوپا' سے اپنے آپ کو لیس کیے رہتے ہیں۔ چشمے کے موٹے فریم کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی روشن آنکھیں ہی کسی گرم حفاظتی تدبیر سے علیحدہ دکھائی دیتی ہیں۔ سردیوں میں وہ اپنا زیادہ تر وقت گرم لحاف کو اوڑھے ہوئے بتانا پسند کرتے ہیں۔ 'بلوور' سے نکلتی گرم ہواؤں کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہتا ہے۔ اب بند کمرے میں ایسے حفاظتی انتظام کے بعد سردی کی کیا مجال ہے کہ کسی طرح انھیں پریشان کرے۔ اگر غلطی سے کسی ملازم نے کھڑکی یا دروازے کا کوئی سرا کھلا چھوڑ دیا جس سے ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ رہی ہو تو وہ بہت سختی کے ساتھ ملازم کی خبر لیتے ہیں۔ وہ یہ بالکل گوارا نہیں کر سکتے کہ بند اور گرم کمرے میں کسی طرح ٹھنڈی ہوا کا گزر ہو سکے۔ جب تک

گرمی نہیں آجاتی، قاضی صاحب کو سردی لگتی رہتی ہے اور جب باقاعدہ گرمی کی دستک شروع ہوجاتی ہے تب وہ اونی کپڑوں کو تج کر ریشمی کُرتے زیبِ تن کرتے ہیں، اور جب ریشمی کُرتے بھی ناقابلِ برداشت ہوجاتے ہیں، تب کوٹن کے باریک کُرتوں کی باری آتی ہے اور پھر جیسے ہی موسم معتدل ہوتا ہے قاضی صاحب کے دراز گیسو اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ لہرانے لگتے ہیں اور ان کے رنگ برنگے کُرتے حسنِ نظر کی داد لیے بغیر نہیں رہتے۔

قاضی صاحب شروع سے ہی بڑے خوش لباس واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں ایک خاص نوع کی شیروانی اور پاجامے کا استعمال شروع کیا تھا جس کی نقل ان کے شاگرد بڑی شان سے کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے بولنے کا مخصوص انداز بھی شاگردوں کو نقل کے لیے مجبور کرتا تھا۔ ان کے لباس اور وضع قطع سے لوگ آج بھی مرعوب دکھائی دیتے ہیں۔

قاضی صاحب نے زندگی کے نشیب وفراز کا بیان کرتے ہوئے کسی مصلحت سے کام نہیں لیا ہے۔ ہم عصروں کے حوالے سے اگر تلخ تاثرات ظاہر کیے ہیں تو اپنے قریبی لوگوں کا بیان بھی اسی لہجے میں کیا ہے۔ صداقتوں کے بیان میں ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ اپنے بارے میں یا ماں باپ اور بیوی بال بچوں سے متعلق کسی بیان کو انھوں نے دیانت داری کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ چاہتے تو ایسے بیانات کو بہت آسانی کے ساتھ پُرتصنع انداز میں ظاہر کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

قاضی عبدالستار عمر کی جس منزل پر ہیں وہاں یادداشت اکثر و بیشتر دھوکہ دینے لگتی ہے، لیکن گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ان کا حافظہ آج بھی غیر معمولی ہے۔ اپنی زندگی کے یادگار لمحات تو کم و بیش سبھی کو یاد رہتے ہیں، لیکن دوسری بہت سی باتوں کو ترتیب کے ساتھ ذہن میں محفوظ رکھنا اور روانی کے ساتھ ان کا بیان کرتے چلے جانا قابلِ رشک ہے۔ گفتگو کے دوران کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے بیان کیے جا چکے واقعات کو دوبارہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے درمیان میں انھیں ٹوکنے کے بجائے پورا واقعہ ایک مرتبہ پھر سننے کی کوشش کی، صرف یہ جاننے کے لیے کہ ان کی باتوں میں صداقت کتنی ہے اور ان کا حافظہ کہاں تک ساتھ دے رہا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے محسوس کیا کہ

دوبارہ بیان کیا جانے والا واقعہ، گزشتہ بیان کیے گئے واقعے کا من وعن بیان ہے۔ اگر ہمارے قول میں تضاد ہے، یا ہم کسی بات کے بیان میں مبالغے سے کام لیں تو اپنی باتوں کو دُہرانے کے درمیان لازمی طور پر ہمارے بیان میں فرق ہو جائے گا۔ پہلے کے بیان میں جو بات کسی اور حوالے سے بیان کی گئی ہے وہی بات دوسرے بیان میں قطعی مختلف ہو جائے گی اور انھیں باتوں کے ذریعے ہمارے قول کی جزئیات کو بہت آسانی کے ساتھ صداقت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ جہاں کہیں بھی مجھے ایسے مواقع ملے اور میں نے قاضی عبدالستار کی صداقت کو انھیں کی باتوں کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ یہ باتیں ایک طرف جہاں قاضی عبدالستار کی بہترین یادداشت کو ثابت کرتی ہیں، وہیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی باتوں میں تضاد کا عنصر شامل نہیں ہے۔ کم از کم میں نے پانچ ماہ کی مسلسل گفتگو میں ان کی کسی بات میں تضاد محسوس نہیں کیا۔

تحریر اور تقریر دونوں سطحوں پر ایک خاص طرح کا تاثر قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گنے چنے لوگ ہی اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کی تقریر میں بھی غضب کا تاثر شامل ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے اور پڑھنے کے دوران اس کے سحر سے آزاد ہونا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن ان کی تقریر بھی کم دلچسپ نہیں ہوتی۔ وہ جس محفل میں شریک ہوتے ہیں وہاں اپنی ہنگامہ خیز باتوں سے اپنی موجودگی کا احساس ضرور کراتے ہیں۔ یہاں بھی اپنی انفرادیت کے اظہار میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ دوسرے لوگ کسی موضوع کو جس زاویے سے دیکھتے ہیں، قاضی عبدالستار کا زاویہ اس سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ حیرت انگیز اور چونکانے والے پہلوؤں کو اپنی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ باتیں محض چونکانے کے لیے نہیں کہی جاتیں۔ ان میں صداقت موجود ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس صداقت پر لوگوں کی توجہ مرکوز نہیں ہو پاتی۔ قاضی عبدالستار ایسے ہی پہلوؤں کو اپنی گفتگو میں شامل کرتے ہیں جس کی بنا پر ان کی باتیں دوسرے لوگوں سے خاصی مختلف ہو جاتی ہیں۔ وہ شعلہ بیان مقرر ہرگز نہیں ہیں، لیکن جب وہ موڈ میں ہوں تو ان کی گفتگو دیر تک دلچسپی کے

ساتھ سنی جاتی ہے اور یہ بات خاصی اہم ہے کہ وہ زیادہ تر موڈ میں ہی ہوتے ہیں۔ اگر پہلے سے ان کا ذہن پوری طرح حاضر نہیں ہے تو عین موقع پر مختلف لوگوں کے ذریعے کہی گئی باتوں سے وہ اپنے مطلب کی باتیں نکال لیتے ہیں اور قدرے بے باکی کے ساتھ جب ان باتوں کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں تو وہ باتیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان باتوں سے بعض لوگوں کو تکلیف بھی پہنچتی ہے، لیکن قاضی عبدالستار ان باتوں کی قطعی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی باتوں کو بھرپور اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، البتہ اس بات کا خیال بھی رکھتے ہیں کہ گفتگو اشاروں میں کی جائے اور براہِ راست لوگوں کی دل آزاری نہ ہو۔ اس طویل انٹرویو میں قاضی عبدالستار نے گفتگو اشاروں میں بھی کی ہے اور بعض لوگوں کا نام لے کر قدرے بے باک انداز میں اپنے تلخ تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہاں انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ زندہ لوگوں سے متعلق گفتگو اشاروں میں کی جائے، البتہ رفتگاں کے سلسلے میں انھوں نے اشاروں کے بجائے براہِ راست انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا ہے، میں اس سلسلے میں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ یہاں تو مجھے فقط اپنے تاثرات کا مختصر بیان مقصود ہے۔

فکشن نگار جب تک جزئیات پر گہری نظر نہیں رکھے گا، اس کی تحریر اعتبار کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی۔ میں نے محسوس کیا کہ قاضی عبدالستار عام زندگی میں بھی مختلف پہلوؤں پر بہ طور خاص توجہ دیتے ہیں اور ان کی باریک بینی سے جزئیات کی گہرائیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ سامنے والے کے سراپے کا بہ غور جائزہ لیتے ہیں۔ چہرے کے نقوش کو وہ سرسری انداز میں دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ تمام تر باریکیوں پر ان کی گہری نگاہ ہوتی ہے، اور ان باریکیوں کا شخصیت کے مجموعی تاثر سے ایک مخصوص ربط بھی وہ قائم کر لیتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں کہ ان کے مخاطب نے کس نوع کا لباس زیب تن کیا ہے۔ زبان و بیان کی نزاکتیں اور مخصوص لہجے کی ادائیگی پر بھی غور وخوض کرنا ان کی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔ ان باتوں کے ذریعے وہ مخاطب کے معیار کو اپنے مخصوص مزاج کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور جو کوئی بھی اس کسوٹی پر پورا

اُترتا ہے، اس کے تئیں قدرے شفقت اور والہانہ لگاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے جو بھی اس کسوٹی پر پورا نہیں اُترا تو پھر ان کا مشفقانہ رویہ، شمشیر برہنہ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زد میں آنے والے شخص کی حالت کتنی قابلِ رحم اور ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے انھوں نے میرے تئیں کسی منفی رویے کا اظہار نہیں کیا۔ چوں کہ وہ مصلحت پسندی سے کوسوں دور رہتے ہیں، لہٰذا ان کے کسی قدر مثبت رویے کو محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

انٹرویو کے دوران میں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ زبان و بیان پر نہ صرف انھیں زبردست گرفت حاصل ہے بلکہ بولنے کے دوران زبان کی نزاکتوں کا احساس بھی ہمیشہ ان کے ذہن نشیں رہتا ہے۔ تحریر میں تو قدم قدم پر تخلیق کار کی سنجیدگی جھلکتی ہے لیکن بولنے کے دوران عام طور پر اس کی روانی متاثر ہوتی ہے، یا ہوسکتی ہے۔ قاضی صاحب جب اپنے خیالات کو بول کر لکھواتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے چھپی ہوئی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ بولنے کے دوران فصاحت اور بلاغت کی زیادہ گنجائش نہیں نکل پاتی اور فطری طور پر جو باتیں بھی ذہن میں آتی ہیں، انھیں باتوں کا بیان ہم زبان کے وسیلے سے کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن قاضی صاحب جب بول کر اپنی باتوں کو لکھواتے ہیں تو ان میں غضب کی روانی شامل ہوتی ہے۔ لکھوانے کے درمیان اگر ایک جملے میں کوئی لفظ دوبارا استعمال ہوگیا تو فوراً ہی اس کو تبدیل کردیتے ہیں اور اگر تکرارِ لفظی سے زبان و بیان کے حسن میں اضافہ ہورہا ہے تو تبدیلی یا ترمیم سے گریز کرتے ہیں۔ گویا کہ بولنے کے دوران بھی زبان و بیان کی نزاکتیں ان کے پیشِ نگاہ رہتی ہیں اور وہ ان کے ترمیم واضافے کے سلسلے میں اس قدر سنجیدہ رہتے ہیں جیسے بولنے کے بجائے وہ تخلیقی عمل سے دوچار ہوں۔ ان باتوں سے زبان کے تئیں قاضی عبدالستار کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس طویل انٹرویو میں جگہ جگہ ایسے تخلیقی جملے ملیں گے جو لکھوانے کے دوران فطری روانی کے ساتھ ان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں تو دو تین جملے بلکہ پورا پیراگراف خالص تخلیقی عمل کا بے مثل نمونہ معلوم ہوتا ہے جسے پڑھ کر یہ یقین مشکل سے ہی آئے گا کہ

قاضی صاحب نے ان جملوں کو لکھا نہیں بلکہ لکھوایا ہے اور وہ بھی ذہن پر کوئی خاص زور دیے بغیر۔ یعنی دوسری تمام باتیں جس فطری روانی کے ساتھ ان کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، اسی فطری روانی کے ساتھ وہ جملے اور پیراگراف بھی وجود میں آئے ہیں جو سنجیدہ تخلیقی کاوش کے بغیر ممکن نہیں۔

قاضی صاحب پندرہ بیس برسوں تک مختلف ذہنی اذیتوں سے مسلسل دوچار رہے۔ اس عرصے میں تخلیقی سطح پر انھیں بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ زندگی کی دو قیمتی دہائیاں جو خالص تخلیقی عمل میں صَرف ہونی چاہیے تھیں، شدید ذہنی انتشار کی نذر ہو گئیں۔ اس عرصے میں انھوں نے لکھنے پڑھنے سے تقریباً کنارہ کشی اختیار کر لی ورنہ عین ممکن تھا کہ کئی یادگار افسانے اور کچھ بہترین ناول بھی ان کے قلم سے وجود میں آتے اور بحیثیت فکشن رائٹر قاضی صاحب کا قد اور بلند ہوتا۔ ذہنی تناؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ خود انھوں نے ریوالور کے ذریعے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نہ جانے خدا کی کیا مصلحت تھی کہ ٹریگر دبنے کے باوجود فائر نہیں ہو سکا۔ ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ رہی ہے کہ جب جب تخلیقی فن کار ذہنی انتشار کا شکار ہوئے، انھوں نے بہترین ادب تخلیق کیا۔ اس بنا پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ذہنی انتشار کے عالم میں قاضی صاحب کی تخلیقیت پوری قوت کے ساتھ جاری رہتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ جب انسان تھک جاتا ہے تو اسے گہری نیند آ جاتی ہے، لیکن وہی تھکن جب انتہا کو پہنچ جائے تو نیند کا اُچٹ جانا عین فطری ہے۔ انتشار کے اژدہام میں قاضی صاحب کی تخلیقی نارسائی کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

یہاں اس بات کا ذکر بہ طور خاص کرنا چاہتا ہوں کہ قاضی عبدالستار سے لیا گیا یہ طویل انٹرویو، دوسرے انٹرویوز سے قطعی مختلف ہے۔ انٹرویو کو یا تو ریکارڈ کیا جاتا ہے، یا پھر انٹرویو کی خاص خاص باتیں اشارے کے طور پر لکھ لی جاتی ہیں اور پھر انھیں بعد میں تفصیلی طور پر قلم بند کر دیا جاتا ہے۔ ریکارڈ کیے گئے انٹرویو میں تمام باتیں من و عن نقل کی جاتی ہیں، لیکن اشاروں کو جب تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے تو اس میں بہت سی دوسری باتیں بھی

شامل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یادداشت کے سہارے تمام باتوں کو من وعن نقل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ گفتگو کا مجموعی نچوڑ، تفصیل میں موجود ہو، لیکن تمام باتوں کی وضاحت کے لیے ہم اپنے طور پر الفاظ اور جملوں کو استعمال کریں گے اور اس جداگانہ استعمال کی بنا پر بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ میں نے قاضی صاحب سے جو طویل انٹرویو کیا ہے وہ انٹرویو کی ان دونوں شکلوں سے بالکل مختلف ہے۔ اتنی تفصیل کے ساتھ تمام باتوں کو پہلے ریکارڈ کرنا اور پھر انھیں کاغذ میں منتقل کرنا ممکن نہ تھا۔ دوسرا طریقہ مزید آزمائشوں میں مبتلا کرنے والا تھا۔ اشاروں کی مدد سے تمام تفصیلات کو لکھنے کی کوشش کی جاتی تو بہت سی باتیں ضبطِ تحریر میں آنے سے رہ جاتیں، اور پھر جملے میرے ہوتے تو قاضی عبدالستار کی انفرادیت کہاں برقرار رہ پاتی۔ میں ان کی باتوں کا نچوڑ تو پیش کرسکتا ہوں، لیکن عام جملوں میں بھی قاضی صاحب کا جلال یا ان کا مخصوص انداز جس طرح ظاہر ہوتا ہے، اس کی نقل کیسے کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا میں نے مناسب جانا کہ انھیں کے ذریعے لکھوائے گئے ایک ایک حرف کو بس لکھتا جاؤں اور گفتگو میں روانی کو برقرار رکھنے کے لیے بروقت ذہن میں جو سوالات دستک دیں، انھیں کے ذریعے انٹرویو کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ لہٰذا اس طویل انٹرویو میں جو سوالات ہیں، صرف وہی میرے ذہن کی اُپج ہیں۔ ان سوالوں کے جوابات جس طرح قاضی صاحب نے لکھوائے ہیں، میں نے ان کو پوری ایمان داری کے ساتھ اسی طرح لکھ دیا ہے۔ گویا کہ قاضی عبدالستار نے خود اپنی زبانی اپنی سوانح انٹرویو کی شکل میں لکھوائی ہے اور میرا دخل صرف اتنا ہے کہ میں نے ان کی باتوں کو من وعن نقل کر دیا ہے۔ میں نے اپنی جانب سے ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کی ہے اور کتاب کے مسوّدے کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد قاضی صاحب نے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔

مجھے اندازہ ہے کہ اس طویل انٹرویو میں قاضی عبدالستار نے جو لہجہ اختیار کیا ہے اور بعض اہم ادبی شخصیات اس لہجے کی زد میں جس طرح آئی ہیں، اس سے ادبی حلقوں میں خاص ہلچل پیدا ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے شدید عتاب کا نشانہ بھی قاضی صاحب کو بننا پڑے، لیکن یہاں میں ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ قاضی عبدالستار

اپنے لکھوائے ہوئے ایک ایک لفظ کے لیے پوری طرح ذمے دار ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے معنی نہ ہوگا کہ انٹرویو کے دوران بعض جگہوں پر میں نے فرداً فرداً ان سے درخواست بھی کی کہ لہجہ ذرا زیادہ ہی جارحانہ ہورہا ہے، آپ چاہیں تو اسے کچھ معتدل کرلیں، لیکن قاضی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ میں پورے ہوش وحواس میں، پوری دیانت داری کے ساتھ کوئی بات لکھوارہا ہوں تو آپ کو لکھنے میں کیا پریشانی ہورہی ہے۔ میں اپنی تمام باتوں کے لیے ہمیشہ جواب دہ رہا اور کسی بھی ہنگامے کا سامنا کرنے میں مجھے کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اگر میری باتوں سے کسی کو تکلیف پہنچتی بھی ہے تو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا کیوں کہ وہ میرے دل کی صدائیں ہیں جنھیں میں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا ہے اور جو کچھ بھی محسوس کیا، اسے بلا جھجھک بیان کردیا ہے۔ جس کسی کو بھی وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو بلا جھجھک تشریف لائے، میں ابھی زندہ ہوں۔ ظاہر ہے اس وضاحت کے بعد کس کی مجال ہے کہ قاضی عبدالستار کی باتوں کو من وعن تحریر کرنے سے انکار کردے۔

قاضی صاحب کو لوگوں نے کمیونسٹ مشہور کررکھا ہے۔ اس لفظ سے ذاتی طور پر انھیں کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ وہ طویل عرصے سے جن وادی لیکھک سنگھ کے محافظ اعلیٰ ہیں اور آج بھی اس کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ جہاں تک مذہب کی ظاہری رسومات کا تعلق ہے، بلاشبہ قاضی صاحب ان سے بہت دور ہیں، لیکن دل کی پاکیزگی، اگر مذہبی وابستگی کی بنیاد ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ قاضی صاحب بہت مذہبی آدمی ہیں۔ وہ دلوں کا احترام کرتے ہیں اور بات بات میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے ان کے تیقن اور مذہب سے دیرینہ وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قاضی صاحب کی گفتگو سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خاتمۂ زمین داری نے دوسروں کی طرح انھیں بھی سخت ذہنی اذیتوں سے دوچار کیا ہے۔ وہ اکثر وبیشتر اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ زمین داری کے خاتمے سے جہاں بہت سی چیزیں تباہ ہوئیں وہیں باغوں اور تالابوں سے بھی محروم ہونا پڑا۔ بظاہر یہ چیزیں زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن

زمین دارانہ شان میں ان دو چیزوں کے نہیں رہنے سے بہت فرق واقع ہوگیا۔ باغوں کی وجہ سے آم اور دوسرے پھلوں کی بہتات ہوا کرتی تھی جنھیں قرب و جوار کے علاقوں میں تقسیم کر کے زمین دارانہ تفاخر کو تسکین ملتی تھی۔ اسی طرح تالاب کی بدولت مچھلیاں اور آبی پرندے کثرت سے مل جایا کرتے تھے جو فراخ دلی کے ساتھ تقسیم کیے جاتے اور تقسیم کرانے والا زمین دارانہ طمانیت کے جذبے سے سرشار ہوتا۔

اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قاضی عبدالستار، الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ اوہام کے بھی بادشاہ ہیں۔ وہ وہم پالنے کے مرض میں اس قدر مبتلا ہیں کہ بعض اوقات انھیں خود بھی اپنی اس خصلت سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ غیر ضروری باتوں کو اپنے حواس پر حاوی کر لینا خود ان کے لیے نقصان دہ ہے، اس کے باوجود وہ ان چیزوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر پاتے۔ کئی دنوں تک مختلف اوہام کے شکنجے میں رہتے ہیں اور بلا وجہ ہی اپنا سکون غارت کرتے رہتے ہیں۔ کسی طرح جب ایک وہم سے نجات ملتی ہے تو بہت آسانی کے ساتھ دوسرے وہم کو ذہن و دل کا مہمان کر لیتے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ بھی گھلنے ملنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ ان کے بنیادی مزاج کا حصہ تو ہے، لیکن شاید ان کی وہمی طبیعت بھی اس کا بنیادی سبب ہو۔ Numerology سے انھیں خاصی دلچسپی رہی ہے۔ حروف کے اعداد و شمار سے خوش قسمتی یا بدقسمتی کے انکشافات سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ قاضی عبدالستار کے جو نمبر ہیں وہ بدقسمت ہیں جب کہ قاضی عبدل ستار کے نمبر خوش قسمت ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے کچھ عرصے تک قاضی عبدالستار کے بجائے قاضی عبدل ستار لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے 'قاضی عبدل ستار' کا نام رائج نہ ہو سکا اور انھوں نے شاد و ناشاد 'قاضی عبدالستار' کے نام سے ہی سمجھوتا کر لیا۔

قاضی صاحب نے براہِ راست ٹیلی ویژن کے لیے اسکرپٹ کبھی نہیں لکھا، لیکن ان کے کئی افسانوں اور ناولوں کو ٹیلی فلم اور سیریل کی شکل میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے خود ان کی زندگی کی کہانی اتنی دلچسپ اور نشیب و فراز سے دوچار

رہی ہے کہ اسے بہت خوب صورتی کے ساتھ سیریل کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس میڈیم سے وابستہ ہیں، وہ اس خیال کو آسانی کے ساتھ عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

میں نے اس طویل انٹرویو کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ گفتگو کی روانی برقرار رہے۔

پہلا باب مچھریٹہ اور سیتاپور کی ڈھیر ساری یادوں کا احاطہ کرتا ہے۔ بچپن کی یادوں کو جب ایک تخلیق کار از سرِ نو تازہ کرتا ہے تو ان یادوں کے ذریعے بنیادی طور پر شخصیت کی بازیافت کی جا سکتی ہے۔ یوں بھی زندگی کے کسی بھی لمحے انسان اس زمین اور مٹی کی کشش کو فراموش نہیں کر پاتا جو اس کے لڑکپن اور نوجوانی کے زمانوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ مچھریٹہ اور سیتاپور کی یادیں قاضی صاحب کی زندگی میں ایسی ہی یادوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ آج بھی ان علاقوں کی یادوں کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عجیب وغریب چمک دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا باب ''رودادِ عشق'' ہے جس میں قاضی صاحب کے اپنے چار عشقیہ داستانوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ سمیٹا ہے۔ ان کا یہ عشقیہ بیان چار مکمل افسانے کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ان عشقیہ بیانات کے ذریعے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ قاضی صاحب فی البدیہہ افسانہ سنانے کے فن میں بھی خاص مہارت رکھتے ہیں۔

تیسرا باب لکھنؤ کے ایام پر مشتمل ہے جب کہ چوتھے باب میں علی گڑھ کے شب وروز کا تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ابواب خاصے ہنگامہ خیز ہیں، خاص کر علی گڑھ کے حوالے سے قاضی صاحب کے تاثرات جس طرح بیان ہوئے ہیں، وہ ان کی حد درجہ بے باکی کے مظہر ہیں۔ پانچویں باب میں پاکستان کے ادبی دورے کا ذکر ہے جس کی بعض باتیں دلچسپی سے خالی نہیں۔ آخری باب ''ادبی مباحث'' کا احاطہ کرتا ہے جس میں موجودہ ادب اور خود ان کے فکشن سے متعلق تمام ممکنہ پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جتنے ابواب میں نے قائم کیے ہیں، ان سے متعلق تمام باتیں سلسلے وار طریقے سے گفتگو کا حصہ نہیں رہیں۔ کسی ایک موضوع پر لکھواتے ہوئے درمیان میں کوئی اور واقعہ زیرِ بحث آ گیا اور پھر گفتگو اسی نہج پر آگے بڑھنے لگی، لیکن قاضی صاحب نے خود اس بات کا خیال رکھا کہ فلاں بات کے ذیل میں ایک اہم پہلو تو بیان ہونے سے رہ گیا تھا، لہٰذا اس پہلو کو اس گفتگو میں ضرور شامل کر لیا جائے۔ گویا کہ افسانہ یا ناول لکھنے کے دوران جس طرح وہ جزئیات پر بھرپور توجہ صرف کرتے ہیں، ویسی ہی سنجیدگی انھوں نے اپنی سوانح لکھوانے کے درمیان برقرار رکھی ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ چھوٹی ہوئی کوئی بات پندرہ بیس دنوں کے بعد انھوں نے مذکورہ گفتگو کے بیان میں شامل کی، جو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ جو کچھ بھی ان کی زبان سے ادا ہوا ہے وہ بس رسمی طور پر ادا نہیں ہوا ہے بلکہ بیان کا ایک ایک جملہ ایک ایک حرف انھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھوایا ہے اور پندرہ بیس دنوں تک کوئی بیان، لکھوائے جانے کے باوجود ان کے ذہنی سفر کا حصہ رہا۔ ۸۳ سال کی عمر میں ذہنی طور پر ایسی سنجیدگی اور حاضر دماغی قابلِ رشک ہے۔

قاضی عبدالستار اگر چاہتے تو انٹرویو کی شکل میں بیان کی گئی اپنی اس سوانح کو پانچ چھ سو صفحات پر آسانی کے ساتھ پھیلا سکتے تھے۔ ان کے ذہن میں یادوں کا زبردست ہجوم ہے، دلچسپ باتوں کا طویل سلسلہ ہے، حیرت انگیز واقعات کی کثرت ہے۔ اس بنا پر اگر ان کا یہ طویل انٹرویو اچھی خاصی ضخامت اختیار کر لیتا تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی، لیکن قاضی صاحب نے شعوری طور پر زندگی کے واقعات کو محدود کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اگر کتاب زیادہ ضخیم نہیں ہوگی تو لوگ پہلی فرصت میں اس کے مطالعے کی گنجائش نکال لیں گے۔ بھاری بھرکم ہونے کی صورت میں اس سے بے اعتنائی عام ہو جائے گی اور کتاب کی اہمیت سے واقف ہونے کے باوجود لوگ اسے فرصت سے پڑھنے کے لیے کہیں اور اُٹھا کر رکھ دیں گے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتابوں کے سلسلے میں بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ ''حضرت جان'' کے علاوہ ان کی جتنی بھی کتابیں ہیں، وہ ضخامت کے لحاظ سے بے حد مناسب ہیں۔ اردو کے اہم ناولوں کی ضخامت کو ذہن

میں رکھیں تو ''حضرت جان'' کی ضخامت بھی بے معنی ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ قاضی صاحب اپنے سوانحی انٹرویو کو غیر ضروری طور پر طول دینے کی کوشش کرتے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے منتخب واقعات کو ہی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ خاص طور پر ان واقعات کو جن کے ذریعے ان کی شخصیت، ادبی اہمیت یا زندگی کے نشیب و فراز کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

چوں کہ انٹرویو کے دوران ہی میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے قاضی صاحب کی سوانح کو انٹرویو کی شکل میں لکھنا ہے، لہٰذا میں نے اپنی جانب سے کسی بھی قسم کی مداخلت کرنے سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی قاضی صاحب نے تفصیل کے ساتھ واقعات کا بیان کیا ہے، میں نے وہ تمام باتیں اسی طرح نقل کر دی ہیں، البتہ جہاں کہیں بھی بات ادھوری محسوس ہوئی وہاں میں نے سوالات کے ذریعے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی قاضی صاحب نے واقعات کا تفصیلی بیان کیا ہے، وہاں ان کی باتوں کی روانی کو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی پانچ ابواب میں اس تفصیل اور روانی کو بہ طور خاص محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ابواب میں قاضی صاحب کے سوانحی عناصر موجود ہیں۔ آخری باب جو 'ادبی مباحث' پر مشتمل ہے، بنیادی طور پر انٹرویو کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن یہاں بھی بعض باتوں کی وضاحت کے لیے اچھی خاصی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ میں نے اپنی جانب سے کسی تبدیلی کے بجائے تمام چیزوں کو اسی طرح برقرار رکھا ہے تا کہ گفتگو کی روانی متاثر نہ ہو۔

ایک طرف جہاں قاضی صاحب کے شیدائیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے وہیں دوسری جانب ان کے مخالفین کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شیدائیوں کے دلوں میں چوں کہ عقیدت اور احترام کا جذبہ ہوتا ہے، لہٰذا وہ اسی جذبے کے تحت تمام باتوں اور پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مخالفین ہر بات کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بیان کی گئی باتوں کی صداقت پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ یہاں میں پوری ایمان داری کے ساتھ ایک اہم بات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ قاضی عبدالستار

کے مخالفین بھی انھیں اہم فکشن نگار تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کی فکشن نگاری مخالفین کے ذہنوں میں اس قدر حاوی ہے کہ وہ ان کی بیشتر باتوں کو بھی حقیقت کے بجائے فکشن سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ضمن میں بھی کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔ قاضی صاحب کا ماضی میں نے نہیں دیکھا ہے، لہٰذا ان باتوں کی صداقت کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قاضی صاحب اوران کے عہد کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ قاضی عبدالستار ہمارے عہد کے ایک بڑے فکشن رائٹر ہیں اور تحریروں کی طرح ان کی سوانح بھی حددرجہ دلچسپ ہے جسے میں نے انٹرویو کی شکل میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی باتیں کتنی سچی ہیں اوران میں فکشن کتنا ہے، اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔

گفتگو کے دوران میں نے قدم قدم پراس بات کو محسوس کیا ہے کہ قاضی صاحب کے ذہن میں بیش قیمتی یادوں کا مزید خزانہ محفوظ ہے۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ تمام باتیں، ترتیب کے ساتھ سامنے آجائیں، لیکن قاضی صاحب کی خواہش ہے کہ جو باتیں بیان ہونے سے رہ گئی ہیں، وہ کتاب کی دوسری جلد میں آئیں۔ اس بنا پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد بھی انشاء اللہ عنقریب منظرعام پر آئے گی۔ دوسری جلد کی اشاعت کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ اس کتاب کو ادب کے سنجیدہ قارئین کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔

آخر میں بڑے بھائی کوثر مظہری کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کا نام تجویز فرمایا۔

راشد انور راشد

۲۵/اپریل ۲۰۱۴ء

مچھریٹہ اور سیتاپور

راشد: قاضی صاحب آپ نے اپنے شیدائیوں، یہاں تک کہ مستند لوگوں کی مسلسل فرمائشوں کے باوجود اپنی سوانح نہیں لکھی۔ آپ کو چاہنے اور آپ سے عقیدت رکھنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ افسانوں اور ناولوں کی طرح آپ کی زندگی کے اوراق بھی کم دلچسپ نہیں۔ خاص طور پر ذاتی گفتگو کے دوران آپ ماضی کی بیش قیمتی یادوں کو اپنے مخصوص انداز میں جس طرح بیان کرتے ہیں، اس تناظر میں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کا تفصیلی محاکمہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ماشاءاللہ آپ زندگی کی ۸۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ خدا آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ عمر کی اس منزل میں ہر چند آپ کے لکھنے، پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے، لیکن شاید اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اب آپ اپنی سوانح قلم بند کریں، البتہ آپ گفتگو کی شکل میں اپنی سوانح لکھوا سکتے ہیں۔ آپ سے طویل انٹرویو کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے آپ مچھریٹہ اور سیتاپور سے متعلق اپنی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے افسانوں اور ناولوں میں بھی مچھریٹہ اور سیتاپور کا قصباتی ماحول ہر لحہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

قاضی عبدالستار: آپ کی باتوں سے ماضی کا مستقل باب ذہن میں روشن ہو گیا۔ تخلیقی عمل میں ماضی کا دخل اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر تخلیقی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں مچھریٹہ اور سیتاپور کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ضرور کروں گا، لیکن اس سے پہلے ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ ''نقوش'' کے ایڈیٹر محمد طفیل نے جب اپنے رسالے میں میرا پورا ناول ''شکست کی آواز'' ۱۹۵۴ء میں شائع کیا تو اشاعت سے قبل اور بعد میں بھی مسلسل اصرار کرتے رہے کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں تو دس صفحے ہی ضرور لکھ دوں۔ میں نے معذرت کی تو انھوں نے قرۃالعین حیدر سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح مجھے اپنی لائف یعنی ''زندگی نامہ'' لکھنے کے لیے مجبور کریں۔ قرۃالعین حیدر ''شکست کی آواز'' پڑھ چکی تھیں اور مجھ سے ان کا رابطہ بھی ہو چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے مجھے خط لکھا کہ میں کسی طرح 'نقوش' کے لیے 'زندگی نامہ' لکھ دوں۔ میں نے ان سے بھی معذرت کر لی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ میں اپنی لائف لکھوں، اور لوگ مجھے مغرور کہتے ہیں اور میں قبول کرتا ہوں کہ ہاں میں مغرور ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ میں قبول کرتا ہوں کہ ہاں میں کمیونسٹ ہوں۔ میرے مخالفوں نے جتنی باتیں بھی میرے خلاف مشہور کر رکھی تھیں، وہ میں نے سب قبول کر لیں۔ وہ نہتے ہو گئے۔

راشد: مچھریٹہ آپ کا آبائی وطن ہے اور وہاں کی یادیں ہر لمحہ آپ کے ذہن میں متحرک رہتی ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوگا کہ آپ ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے مچھریٹہ اور سیتاپور کی یادوں کو تازہ کرتے چلیں، کیوں کہ ان دونوں علاقوں کا قصباتی ماحول آپ کے افسانوں اور ناولوں میں ہر لمحہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

قاضی عبدالستار: والدہ فرماتی ہیں کہ جب لیڈی ڈاکٹر نے یہ فرمادیا کہ ہم تشریف لانے والے ہیں، تو ہمارے بابا میاں قاضی فرخند علی صاحب نے فوراً کمہار کے یہاں

کچھیا (مٹی کی چھوٹی سی پتیلی) منگوائی۔ وہ پانی میں ڈال دی گئی۔ ایک آدمی نے نیم کے لونگے توڑے، پتیاں صاف کیں، لونگے دھوئے گئے اور آدھی کچھیا میں پانی بھرا گیا اور لونگے اس میں رکھ دیے گئے اور آٹا گوندھ کر اس کے ڈھکن میں لیپ دیا گیا اور اپلے کی دھیمی آنچ پر وہ ساری رات رکھی گئی۔ صبح نماز پڑھنے کے بعد بابا میاں نے بیسن سے اپنے ہاتھ دھوئے اور وہ لونگے اس کے اندر مل دیے۔ پھر اس کو کپڑے سے چھان لیا اور وہ پیالہ ایک عورت کو دیا گیا۔ آگے آگے قاضی صاحب، پیچھے پیچھے وہ عورت۔ اپنے سامنے پورا پیالہ پلواتے تھے۔ نہار منھ۔ اماں کہتی تھیں کہ جس وقت میں یاد کر لیتی ہوں اس کی تلخی کو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پورے پانچ مہینے اور پانچ دن یہ کاڑھا پلایا گیا۔ اس کا اثر یہ ہے کہ آج ۸۲ سال کی عمر میں بھی چوٹ لگ جاتی ہے تو پکتا نہیں ہے، خود بخود خشک ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنی بیوی کو یہ پلانا چاہا، لیکن اس نے انکار کر دیا کہ میں یہ زہر نہیں پی سکتی۔

میرے بسم اللہ کی خصوصیت یہ تھی کہ جن مولوی صاحب نے بسم اللہ کرائی، انھوں نے میرے دادا اور میرے والد کی بسم اللہ بھی کرائی تھی۔ ان کی عمر تقریباً ۱۰۳ سال تھی۔ ایسی نظیریں بہت کم ملیں گی کہ دادا سے پوتے تک بسم اللہ ایک ہی آدمی نے کرائی۔ انھوں نے مجھے پڑھایا بھی تھا، وہ غصے ور بہت تھے، مارتے بھی تھے، دلار بھی کرتے تھے۔ آج ماسٹر مارتا ہے تو والدین پولیس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جب ہمارا نام سیتاپور میں لکھا دیا گیا تو ہر سنیچر کو دو آدمی اسکول پہنچتے تھے۔ ہم ان کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر بستے کے ساتھ اسٹیشن آتے۔ سوا چار بجے گاڑی چھوٹتی تھی سیتاپور سے، پونے پانچ بجے مسرکھ اسٹیشن پہنچتے تھے۔ وہاں لہڑو کھڑا ہوتا تھا۔ ہم اس پر سوار ہوتے اور مچھریٹہ پہنچ جاتے۔ جب تک بابا میاں زندہ رہے، ہم کو لہڑو سے صرف وہی اُتارتے تھے، اور میں انھیں کے پاس رہتا تھا۔ والدہ کی حیثیت صرف ایک انّا کی تھی۔ دوشنبہ کو علی الصباح ناشتہ

کر کے ہم کو لہڑو پر بٹھا دیا جاتا۔ ٹھیک نو بجے مصرک سے گاڑی سیتاپور جاتی۔ ساڑھے نو بجے پہنچتی۔ دونوں آدمی ہمیں بستے کے ساتھ اسکول پہنچا دیتے۔ یہ طریقہ بابامیاں کے بعد بھی چھٹے درجے تک برقرار رہا۔ پھر ہاکی کے شوق میں ہمیں نے اس سلسلے کو ختم کیا۔

مچھریٹہ کی جائداد دو بھائیوں کے پاس تھی۔ میرے حقیقی دادا قاضی فیاض علی کورٹ آفرِ وارڈس (جوریاستیں ضم لیتا تھا) وہاں اسسٹنٹ منیجر تھے۔ ان کے بڑے بھائی قاضی فرخند علی مچھریٹہ میں تھے۔ جائداد کا انتظام تھا۔ وہ میاں کہے جاتے تھے۔ قاضی فیاض علی سرکار کہے جاتے تھے۔ قاضی فرخند علی صاحب کے بیٹے منے میاں شکار کھیلنے گئے۔ معلوم نہیں کس طرح ہاتھی سے گرے کہ ریوالور جو ان کی کمر میں لٹکا تھا، وہ دب گیا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی لاش جب مچھریٹہ آئی اور ان کی والدہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کا جنازہ دیکھا تو بے ہوش ہوگئیں اور بے ہوشی میں ہی انتقال کر گئیں۔ ایک ہی وقت میں دو جنازے نکلے۔ قاضی فرخند علی صاحب پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اپنے آپ کو جائداد کے انتظام اور اپنے بھائی کے بچوں کی تربیت میں مصروف کرلیا۔ مچھریٹہ کی جائداد بہت بڑی نہیں تھی، لیکن نام بہت بڑا تھا۔ ابھی ۲۰۰۵ء میں ہندی کے مشہور ادیب وبھوتی نرائن رائے جو لکھنؤ میں ایڈیشنل ڈی جی تھے، انھوں نے مچھریٹہ کا ویزٹ کیا تھا اور اپنے تھانے دار سے ہم لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے بڑی حیرت سے کہا تھا کہ زمین داری فیل ہوئے اتنا زمانہ ہوگیا، لیکن چار چار کوس تک قاضی صاحبان کی مرضی کے خلاف پتا نہیں ہل سکتا۔ یہ بیان میں نے آپ کو اس لیے سنایا کہ نام بڑا اور درشن تھوڑے۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، لیکن شہرت یہی تھی۔ آخری عمر میں قاضی فرخند علی نے اپنی جائداد کا وارث مجھے بنایا اور جائداد ہبا کر دی۔ میرے والد کو اس لیے محروم کر دیا گیا کہ وہ شکار اور سیاحت کے مرض میں مبتلا تھے۔ میں چھ سال کا تھا

جب جائداد کا وارث ہو گیا تھا اور مجھے اس کا احساس بھی تھا۔ چھ سال کی عمر میں بابا میاں کا انتقال ہو گیا اور میں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گیا۔

راشد: قاضی صاحب آپ کی باتوں سے ماضی کا ایک عہد روشن ہو گیا ہے جس میں ایک طرف جہاں جاگیردارانہ تہذیب کی خصوصیات نمایاں ہو رہی ہیں، وہیں آپ کی محرومیوں کا اندازہ بھی ہونے لگا ہے۔ بابا میاں سے قربت کا معاملہ آپ کے ذہن پر آج بھی تازہ ہے۔ بابا میاں کے حوالے سے کچھ انوکھی یادوں کو تازہ کریں۔

قاضی عبدالستار: بابا میاں مجھے کتنا پیار کرتے تھے اس کا اندازہ آپ ایک واقعے سے کر لیجیے۔ مجھے ربر کی غلیل بنانا تھی، اڈّہ اور ربر آ گئی۔ اب اس کو باندھنا تھا۔ اماں کسی تقریب میں کسی عزیز کے یہاں چلی گئی تھیں۔ ان کا زربخت کا غرارہ تخت پر رکھا تھا۔ میں نے قینچی سے ان کی گوٹ کاٹ لی اور غلیل بنالی۔ اماں نے دیکھا تو کہرام مچ گیا، بہت پٹائی ہوئی میری۔ میں داد فریاد کرتا ہوا بابا میاں کے پاس پہنچا۔ بابا میاں عدالت کر رہے تھے، وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر آئے۔ میری والدہ بہت عبادت گزار تھیں، اس لیے بابا میاں ان کو مولویائین کہتے تھے۔ بہت غصے سے کہا مولویائین ہم تم کو بہت چاہتے ہیں۔ جب تم بیاہ کر آئی ہو تو ہم نے منہ دکھائی میں تم کو اپنے گھر کی چابیاں دے دیں، لیکن اگر تم نے اب بھیا کو مارا تو خدا رسول کی قسم پہنچے سے ہاتھ کٹوا لوں گا۔ یہ عالم تھا، پھر کس کی مجال تھی جو مجھے بول سکے۔ مارنا تو خیر بڑی بات، ان کے مرنے کے بعد یہ تمام باتیں میرے خلاف ہوتی گئیں۔ بابا میاں میونسپل بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ سارے اسکول ان کے انڈر میں تھے۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک پنڈت جی تھے، وہ بابا کے مکھن لگانے کے لیے ایک دن آئے اور مجھے گود میں لے کر اسکول چلے گئے۔ نام لکھ دیا، لیکن عمر کا خانہ کیا کریں۔ بھاگتے ہوئے آئے اور کہا کہ میں نے بھیا کا نام لکھ دیا ہے۔ عمر بتا دیجیے، کیا لکھوں۔ انھوں نے کہا جو جی چاہے لکھ لو۔ کیا اسے نوکری کرانی ہے۔ انھوں نے چار

سال، چار مہینے، چار دن لکھ دیے۔ ہم تین سال کے بھی نہیں تھے۔ وہ عمر آج تک چلی آ رہی ہے۔ ہم بابا میاں کے ساتھ ایک ٹھاکر صاحب رٹھوار پور کے یہاں گئے۔ مکان قریب ہی تھا، ٹھاکر صاحب بیمار تھے۔ ہم بابا میاں کے ساتھ انگلی پکڑے ہوئے جب گنج سے گزرے تو دُکان دار کھڑے ہو کر سلام کرنے لگے۔ ہم نے جواب دیا۔ بابا میاں نے فرمایا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا فرض ہے تمھیں سلام کرنا۔ یعنی ہماری بربادی کا سارا انتظام بابا میاں کر گئے۔ مچھریٹے میں کسی کے یہاں عمدہ بیل آئے۔ آپ سوچیے چھ سات برس کا لڑکا وہ بیل کھلوا لیتا تھا اور لہڑ ووں میں جوڑ کر سواری کرتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سارے چونچلے ختم ہو گئے اور اب ہمارا مچھریٹے میں دل نہیں لگتا تھا۔ سیتاپور میں ہمارا داخلہ ہو گیا تھا، تیسرے درجے میں۔ ہم ہر سنیچر کو آتے تھے مچھریٹہ اور دوشنبے کو جاتے تھے۔ اب ہم نے آنا جانا کم کر دیا لیکن ہمارے ماموں ہم کو یہ کہہ کر اس مکان سے اپنے گھر لے گئے کہ یہ طوائفوں کا محلہ ہے، یہاں بھیا برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم ان کے گھر رہنے لگے۔ پڑھنے لگے اور ایک سخت زندگی گزارنے لگے۔ اس لیے کہ ہمارے ماموں پڑھنے کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ ٹیوٹر تو ایک ہی گھنٹہ پڑھاتا تھا، لیکن ان کی آنکھیں دن بھر پڑھاتی رہتی تھیں۔

راشد: قاضی صاحب جاگیردارانہ ماحول میں خاندانی رقابتیں بھی قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہیں، یہاں تک کہ اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کسی کی جان لے لینا بھی معمولی بات ہوا کرتی تھی۔ حسن اتفاق سے مشترکہ جائداد آپ کے حصے میں آئی تھی۔ اس بنا پر خاندانی رقابت کا کوئی معاملہ سامنے نہیں آیا۔

قاضی عبدالستار: جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مچھریٹہ کی جائداد کے دو مالک تھے۔ ایک بھائی لاولد ہو گئے تھے۔ ان کی پوری جائداد مجھے ملی اور اپنے دادا کی جائداد کے آٹھ آنے کے چار آنے ملے۔ اس طرح میں بارہ آنے کا مالک ہو گیا۔ یہ

بات ہمارے چچا اور سوتیلے چچاؤں کو ناگوار گزری، لیکن وہ لوگ کم عمر تھے۔ اس بات کو انگیز کر چکے تھے، لیکن ہمارے ایک سوتیلے پھوپھا تھے جو حکیم بھی تھے۔ انھوں نے ہمارے سوتیلے چچاؤں کو اُکسایا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔ جائداد پر قبضہ کر لیں۔ رہا مقدمہ تو بقول حکیم ظہور کے، وہ لڑ کے چھڑا لیں گے۔ ایک شام میں والدہ کے پاس بیٹھا قرآن شریف پڑھ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک چچا آ گئے۔ ہمارے دروازے پر پہرہ رہتا تھا۔ بغیر اجازت کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا، لیکن وہ تشریف لے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ ابھی وہ صحن میں تھے کہ ہمارے مکان کی پشت پر ہمارا جو مہمان خانہ تھا اور جس میں ہمارے ایک عزیز ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس پر چڑھ کر حکیم ظہور ہمارے دالان کے چھجے پر آ گئے اور کڑک کر کہا دیکھتے کیا ہو، ذبح کر دو، لیکن ایک تو وہ اکیلے تھے۔ دوسری ہماری ماں بہت دھوم دھام کی خاتون تھیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ انھوں نے تھیلے میں دو بار ہاتھ ڈالا لیکن دونوں بار ہاتھ باہر نکال لیا اور حکیم ظہور ان پر برستے ہوئے چلے گئے۔ ہمارے وہ چچا بھی تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر میں حکیم ظہور ہمارے ایک چچا کے ساتھ اندر آئے اور ہمارے کمروں میں تالے ڈال دیے اور کہہ گئے کہ رات میں چلے جاؤ یہاں سے ورنہ صبح اسی مکان میں آگ لگوا کر جلوا دوں گا۔ اتنے میں عصر کی اذان ہوئی اور ہماری لمبی تڑنگی جمعدارن دوقتی کمانے آتی۔ اس کو اماں نے ایک خط لکھ کر دیا اور ایک روپیہ دیا کہ ابھی جا کر ٹھاکر ہنومان سنگھ تعلق دار بیہٹ کو دے دو۔ ٹھاکر ہنومان سنگھ اور ہمارے بابا میاں کی دوستی پورے ضلع میں مشہور تھی۔ جب ٹھاکر صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوتے تو قاضی صاحب جی جان سے ان کی معاونت کرتے اور جب قاضی صاحب الیکشن کے لیے کھڑے ہوتے تو ٹھاکر صاحب ان کی مدد میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ وہ لوگ تالے ڈال کر چلے گئے تھے۔ مغرب کی اذان کے وقت تک ہم کو اماں

نے باہر نہیں جانے دیا۔ ہمارے بستر تو کمرے کے اندر تھے، ہم لوگ باہر ہی کھڑے پلنگ پر لیٹ رہے۔ رات کے دس بجے قریب دروازے پر ہنگامہ ہوا اور پہرے دار کی آواز آئی کہ ٹھاکر صاحب بہٹ تشریف لائے ہیں۔ دروازے کھلوایئے۔ اماں نے نوکرانی سے دروازے کھلوا دیے۔ ٹھاکر صاحب دروازے سے آنگن میں آ گئے۔ اماں دالان میں چھپ گئیں۔ کڑک کر حکم دیا، لوہاروں کو پکڑ کر لاؤ اور تالے توڑ دو۔ ان کے ساتھ کئی سو آدمی تھے۔ حکیم کا نام سنتے ہی وہ اُلف ہو گئے۔ چیخ کر آدمیوں کو حکم دیا کہ ان کا دروازہ توڑ کر باہر کھینچ لاؤ۔ اتنے میں وہ خود ہی باہر آ گئے۔ ٹھاکر صاحب میری کیا خطا ہے؟ ٹھاکر کو جتنی گالیاں یاد تھیں، سب سنا دیں۔ حکیم ظہور چابیاں لے کر دوڑے کہ تالے کھول دیں۔ ٹھاکر صاحب نے جن کو میں بابا کہتا تھا حکم دیا کہ اب تو تالے توڑے جائیں گے۔ تالے توڑے گئے۔ پھر چچاؤں کو پکڑنے کا حکم دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں سائیکلوں پر کہیں چلے گئے ہیں۔ ٹھاکر نے ہماری ڈیوڑھی پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ یہ پہلا واقعہ ہے۔ اب اگر کچھ ہو گیا، میرے پوتے کا بال بھی بانکا ہو گیا تو گھر کھدوا کر ہل چلوا دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ بارہ پاسیوں اور دو بندوقوں کا پہرہ کھڑا کر دیا جو دن رات قائم رہتا، لیکن وہ ہمارے گھر کی ایک چلم بھی نہیں پیتے تھے۔ اس خوف سے کہ اگر ٹھاکر کو معلوم ہو گیا تو وہ بگڑ جائیں گے۔ دوسرے دن دوشنبہ تھا۔ ہم مسرکھ جانے کے لیے لہڑو کے قریب پہنچے تھے کہ ٹھاکر صاحب کا لہڑو آ گیا۔ ان کے مختار نے کہا کہ آپ اس لہڑو پر جائیں گے اور آپ کے ساتھ ہمارے سپاہی جائیں گے۔ کچھ مہینے تک ہم اسی طرح سیتاپور جاتے اور آتے رہے۔ اس کے بعد ہمارے چچاؤں نے بہت معافی تلافی کی، تب ٹھاکر نے ان کو معاف کیا اور ہم اپنے لہڑو پر جانے آنے لگے۔

راشد: مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے ذہن میں یادوں کے ساتھ باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ محفوظ ہے۔ وہ تمام باتیں کسی نہ کسی صورت میں ضرور سامنے آئیں گی اور

میری یہی کوشش ہوگی کہ انٹرویونما اس سوانح میں آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ پائے۔ فی الحال آپ مچھریٹہ اور سیتاپور کے حوالے سے اپنی یادوں کو ازسرنو تازہ کریں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے گھر اور خاندان کی اہم تفصیلات خود بخود اس بیان میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔

قاضی عبدالستار: ہاں بھئی آپ نے بالکل درست نشان دہی کی۔ باتیں تو اتنی ہیں کہ شروع ہو جائیں تو ختم ہونے کا نام نہ لیں، لیکن ہمارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ موضوع کو ذہن میں رکھ کر ہی گفتگو کی جائے۔ مچھریٹہ اور سیتاپور کے بیان کے لیے بات اپنے خاندان سے شروع کرنی ہوگی۔ ہمارے والد قاضی عبدالعلی عرف ننھے میاں خوب صورت آدمی تھے اور تین بیگمات کے لاڈلے بھی تھے۔ ہمارے دادا قاضی فیاض علی کی پہلی بیگم کے بطن سے والد صاحب تھے۔ ان کا انتقال ہوگیا۔ دادا سرکار قاضی فیاض علی نے دوسری شادی کی۔ اس سے ہمارے چچا لوگ پیدا ہوئے۔ تین چچا پیدا ہوئے، پھر انھوں نے ایک طوائف مندر جہاں سے شادی کی۔ اس کے لیے لکھنؤ میں اصغر علی، محمد علی کی کوٹھی کے برابر چوک میں ایک دو منزلہ کوٹھی بنوائی۔ وہ مندر دادی کی بیٹی منیر پھوا کے نام پر ہے۔ ان کے نام کا پتھر لگا ہے منیر منزل۔ جب لکھنؤ جائیے تو دیکھ لیجیے۔ مندر دادی کے پاس اپنا پیسہ تھا اور دادا سرکار نے ان کو، جس گاؤں میں وہ پیدا ہوئیں، یعنی پرسوا، تقریباً پورا خرید کر دے دیا۔ لکھنؤ میں مکانات تھے ان کے۔ دکانیں تھیں، یعنی امیر کبیر تھیں وہ۔ پھر دادا سرکار پر لکھنؤ کی ایک بیگم عاشق ہوئیں جو بیگم سرکار کہی جاتی تھیں۔ ایک دن وہ اپنے باپ کی گاڑی میں بیٹھ کر لکھیم پور گاؤں مندراسن آگئیں جو اودھ کے میجر جنرل ڈن صاحب کا مستقر تھا۔ ڈن صاحب نے جب ان کے عشق کی کہانی سنی تو دادا سرکار کو بلا کر نکاح پڑھوا دیا۔ ابو جان یعنی ننھے میاں ان تین بیگمات کے دلارے تھے۔ ان کے بگڑنے کے اتنے انتظامات تھے کہ بننے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ انگریزی

اسکول میں بھی داخل کرائے گئے۔ علی گڑھ اور ندوہ بھی بھیجے گئے لیکن کہیں پڑھ کر نہیں دیا۔ آخر آخر مچھریٹہ کے مڈل اسکول میں داخلہ ہوا اور یہاں سے انھوں نے مڈل پاس کیا۔ والدہ کا خیال تھا کہ یہ مڈل پاس بھی نہیں ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ مگر ابو جان یہی کہتے تھے کہ میں مڈل پاس ہوں، شکار کا شوق نہیں تھا ان کو بلکہ شکار کی بیماری تھی۔ مثلاً دادا سرکار مندر ا س میں مقیم ہیں۔ صبح گھوڑا کھولا، بندوقیں نکالیں اور دو چار دوستوں کے ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ رات میں رہنے کی فکر۔ تین تین دن وہ گھر نہیں آتے تھے۔ تین دنوں کے بعد جب وہ آتے بھی تھے تو دادا سرکار کے سپاہی ان کو پکڑ کر لاتے تھے۔ ہمارے دادا سرکار جلالی آدمی تھے، بہت غصے ور لیکن ابو جان کے معاملے میں بالکل نرم ہو جاتے تھے۔ ان کا ایک لطیفہ بھی بہت مشہور ہے۔ ایک دن مچھریٹہ میں دادا سرکار نے ابو جان کے ایک جھانپڑ مار دیا۔ ان کی سوتیلی ماں نے کہرام برپا کر دیا۔ لکھنؤ سے منور جہاں، مندر دادی آگئیں، بیگم سرکار آگئیں اور دادا سرکار کو جو بیماری کی وجہ سے مچھریٹہ میں مقیم تھے، بہت سخت سست کہا۔ اسکول کے ایک ماسٹر نے ابو جان سے کہا کہ قاضی صاحب (دادا سرکار) نے آپ کے بہت زور کا چانٹا مار دیا۔ خون نکل آیا۔ ابو جان نے کہا ابا سرکار ہمارے سوتیلے باپ ہیں۔ اس لیے ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ ہم تو اپنی اماؤں کی وجہ سے پڑے ہوئے ہیں ورنہ کہیں بھاگ جاتے۔ یہ واقعہ مچھریٹے بھر میں مشہور ہوا۔ دادا سرکار نے بلایا اور کہا کہ بھیا اپنے سوتیلے باپ کی خاطر دو ایک دن ہمارے پاس رہ جاؤ۔ ابو جان نے فوراً جواب دیا کہ اتنے آدمی تو آپ کے پاس رہتے ہیں اور رات میں تو میں بھی رہتا ہوں۔ گھوڑے کھنچوائے، بندوقیں نکلوائیں اور شکار پر روانہ ہو گئے۔ جب کسی طرح قابو میں نہیں آئے تو خاندان کے بزرگوں نے مشورہ دیا کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ دادا سرکار اور بابا میاں دونوں سیہالی پہنچے جو قاضی الاقضات ملا نظام الدین (درسِ نظامیہ جن کی

یادگار ہے) اور ان کی اولاد کا سیہالی مستقر تھا۔ قاضی بخشش الٰہی سے ان کی پوتی (والدہ) کے رشتے کی بات کی گئی۔ قاضی بخشش الٰہی صاحب نے فرمایا ہر چند کہ پھریٹہ کے قاضی صاحبان کے حسب ونسب کے بارے میں کچھ نہیں پوچھنا ہے، تاہم اپنے خاندان کے بزرگوں سے مشورہ کر کے جواب دیا جائے گا۔ تین چار مرتبہ سیہالی کے چکر کاٹنے کے بعد ایک بار قاضی بخشش الٰہی صاحب نے قاضی فرخند علی سے کہا کہ آپ بارات میں سوشیروانی پوش آدمی لائیں گے اور بری کے نام پر کچھ نہیں لائیں گے۔ قاضی فرخند علی نے جواب دیا آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوگی، لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے کہ ہم جہیز کے نام پر کچھ نہیں لیں گے۔ خیر قاضی فرخند علی، قاضی فیاض علی گھوڑے اڑاتے پھریٹہ آئے، گولے داغتے ہوئے بندوقوں سے فائر کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو ہماری دادی جان نے جن کا نام آبادی بیگم تھا، انھوں نے اپنے شوہر قاضی فیاض علی سے پوچھا کہ کون سا قلعہ فتح کر کے آئے ہو جو یہ دھوم مچی ہوئی ہے۔ قاضی فیاض علی صاحب نے جواب دیا ہم نے تمہارے لیے بہو ڈھونڈھ لی ہے اور وہ سیہالی کے قاضی صاحبان کی بیٹی ہے۔ کسی خادمہ نے پوچھا سرکار صورت کیسی ہے؟ جواب ملا صورتیں رنڈیوں اور پتریوں کی دیکھی جاتی ہیں، بہوؤں اور بیٹیوں کی نہیں۔

جب اماں پھریٹہ آئیں تو ان کے ساتھ صرف سات برتن تھے اور سات جوڑے کپڑے تھے، سات برتن اور سات جوڑے کپڑوں کو جہیز نہیں کہا جاتا۔ اماں کی ایک گائے بھی تھی۔ بالکل سیاہ جسے شیاما کہا جاتا ہے۔ وہ بھی شادی کے بعد پھریٹہ آئی تو اس کے سینگوں اور سموں پر چاندی کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ برتن سب چاندی کے تھے، ان کے پلنگ کے پایوں پر بھی چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ جب دلہن کی رونمائی کا وقت آیا تو ناون قاضی فرخند علی کے پاس پہنچی کہ میاں بہو کا منھ دیکھ لیجیے تا کہ رسم شروع ہو۔ جواب ملا فیاض علی کے پاس جاؤ۔

ناون نے سرکار سے کہا بہو کا منھ دیکھ لیجیے، انھوں نے ایک بکس کھولا، چاندی کی کشتی میں سونے کے زیور بھرے اور ناون کو دیے۔ آگے آگے ناون، پیچھے پیچھے قاضی صاحب۔ دلہن کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر فرمایا بہو بیگم ہاتھ نکالیے۔ اماں نے ہاتھ نکالا اور کشتی لی تو سنبھال نہیں پائیں اور کشتی گر پڑی۔ اتنی بھاری تھی وہ۔ اب ناون قاضی فرخند علی کے پاس پہنچی کہ میاں بہو بیگم کا منھ دیکھ لیں۔ بابا میاں اندر تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا۔ بہو بیگم اپنا ہاتھ باہر نکالو۔ کسی خادمہ نے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ قاضی فرخند علی نے چابیوں کا پورا گچھا ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا میں نے منھ دکھائی میں تم کو اپنا سب کچھ دے ڈالا۔ ہمارے یہاں کھانا اس وقت باہر پکتا تھا (سب زمین داروں کے یہاں اس وقت تک کھانا باہر پکتا تھا) لیکن کیا پکے گا یہ گھر کی بی بی بتاتی تھی۔ گاؤں میں بیگم کوئی نہیں کہتا تھا، سب لوگ بی بی صاحب کہتے تھے۔ بڑی بی بی صاحب، منجھلی بی بی صاحب، چھوٹی بی بی صاحب وغیرہ۔

یہ سب کچھ تو تھا، لیکن ابو جان شادی کے تیسرے دن بغیر بتائے ہوئے صبح اُٹھے، گھوڑی خود کھینچی، بندوق کندھے پر ڈالی اور گھر سے نکل گئے۔ بہت تلاش کے بعد تیسرے دن انچولی کے جنگل سے برآمد کیے گئے۔ ابھی اماں کے ہاتھوں کی مہندی میلی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابو جان سیاحت پر نکل گئے اور انتہائی کوششوں کے بعد کئی مہینے گزار کر تشریف لائے۔ یعنی جو خیال تھا کہ شادی کے بعد سنبھل جائیں گے وہ باطل ہوا۔ اب شکار تو خیر شکار تھا، سیاحت بھی شروع ہو گئی۔ میں چار پانچ سال کا تھا جب میں نے ابو جان کو دیکھا۔ تھوڑے دن ابو جان رہے، پھر چلے گئے۔ میری ہڑکن (بے قراری، بے چینی) کو بابا میاں اپنے لاڈ پیار سے بہلاتے رہے، لیکن باپ کی محبت کا جو داغ بچپن میں لگا تھا، وہ ۱۹۸۲ء میں جب ابو جان کے مرنے کی اطلاع مدینہ منورہ سے آئی، ختم تب ہوا۔

راشد: آپ نے اپنے خاندان کی داستان سنانی شروع کی تو ایسا محسوس ہوا کہ سارا منظر نگاہوں کے آگے متحرک ہو گیا ہے۔ ابو جان کی محبت سے آپ پوری زندگی محروم رہے اور شاید یہی محرومی ابتدا سے ہی آپ کے ذہن میں اس طرح رچ بس گئی کہ آپ کے مزاج میں ایک نوع کی کرختگی شامل ہو گئی۔ زندگی میں کسی نوع کی محرومی انسان کو پوری طرح تبدیل کر دیتی ہے۔ آپ کے مزاج کا تیکھا پن شاید اسی محرومی کا سبب ہو۔ ابو جان کی مخصوص طرزِ زندگی نے آپ کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی بری طرح متاثر کیا ہوگا۔ تمام باتیں اچھی طرح محسوس کی جا سکتی ہیں، لیکن آپ نے اچانک ہی ابو جان کی موت کا ذکر کر دیا۔ درمیان میں کچھ اور کڑیاں بھی تو ہوں گی، ان کے اچانک انتقال کی کچھ تفصیل تو بتائیں۔

قاضی عبدالستار: اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو جان کے ایک بہت عزیز دوست سندھ میں میجر تھے۔ انھوں نے ابو جان کو بسٹرڈ کا شکار (ایک پرندہ جس کے لیے آج بھی سعودی پرنسز شکار کھیلنے آتے ہیں۔ یہ سندھ میں ہی ہوتا ہے) کھیلنے کے لیے بلایا۔ ابو جان شکار کھیل رہے تھے کہ پاکستان تولد ہو گیا۔ شروع میں تو وہ اس لیے نہیں آتے کہ ٹرینوں میں مار کاٹ جاری تھی۔ بعد میں جب انھوں نے آنا چاہا تو کرنل آفاق چچا جن کے وہ مہمان تھے، آڑے آ گئے۔ فوج کے افسر کے مہمان کو ہندوستان نے ویزا نہیں دیا۔ ہم لوگ تڑپتے رہے۔ ہم لوگ کیا، ہم ماں بیٹے تڑپتے رہے۔ اب کرنل آفاق کابل میں ملٹری اتاشی ہو کر چلے گئے۔ ان کی کوششوں سے ابو جان کو وہاں کی شہریت مل گئی۔ اب ہندوستان کا ویزا بھی مل گیا اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کب آئے، گئے تھے ۱۹۴۶ء میں اور آئے ۱۹۶۶ء میں۔ میں علی گڑھ میں لکچرر تھا۔ اتفاق سے اماں بھی میرے ساتھ تھیں۔ ابو جان کا حسن و جمال ختم ہو چکا تھا، ان کا رنگ و روپ اڑ چکا تھا۔ وہ مچھریٹہ کے رئیس بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ جب انھوں نے دستک دی اور میں نے باہر نکل کر ان کو دیکھا تو انھوں نے دیکھتے ہی کہا چھبن۔ میں ان کو پہچانے بغیر

یہ سمجھ گیا کہ یہ میرے باپ ہیں اور ہم دونوں لپٹے ہوئے دیر تک کھڑے رہے۔ پھر والدہ ہم لوگوں کو اندر لے گئیں، چند روز وہ علی گڑھ میں رہے، میں نے یونیورسٹی سے چھٹی لے لی، سارا وقت ان کے ساتھ گزارتا رہا۔ پھر وہ مچھریٹہ چلے گئے۔ وہاں وہ کئی مہینے رہے، ہم بھی چھٹی لے کر پہنچے تو گھر میں جشن کا ماحول تھا۔ اماں دو تین عورتوں کے ساتھ دن دن بھر اور آدھی آدھی رات تک باورچی خانے میں مبتلا رہتیں، اور ابوجان کی پسند کے کھانے، حلوے اور مربے بناتی رہتی تھیں۔ ایک بار بھی میری ماں نے میرے باپ سے شکایت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ابوجان جب باہر سے آتے تو چیخ کر کہتے کہ تم باورچی خانے سے باہر نہیں آؤ گی۔ اماں مسکرا کر کہتیں باورچی خانہ بھی تو تمہارا ہے۔ تمہارے لیے یہ چیزیں پکا رہی ہوں۔ ہم سنتے، ہمارا کیا حال ہوتا وہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ اس زمانے میں ہماری بہن کا رشتہ آ گیا۔ ہماری اور اماں کی خواہش تھی کہ ابوجان کے سامنے شادی ہو جائے۔ اس لیے کہ یہ اندیشہ برقرار تھا کہ معلوم نہیں یہ کب رختِ سفر باندھیں اور رخصت ہو جائیں۔

ایک صبح معلوم ہوا کہ ابوجان نہیں ہیں۔ ایک ملازم نے ایک خط لا کر اماں کو دیا۔ میں علی گڑھ میں تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں ہندوستان سے جا رہا ہوں۔ اماں نے مجھے فوراً تار دیا، لیکن میں مچھریٹہ جا کر کیا کرتا۔ وہ کابل پہنچ گئے۔ ایک بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ ان کا خرچ کون پورا کرتا تھا۔ والدہ کے بیان کے مطابق ان کے پاس سو دو سو روپے بھی نہیں تھے، جب وہ گئے ہیں۔ خیر چند برس کے بعد آفاق چچا بریگیڈیر ہو گئے اور ابوجان کو سعودی عرب کی شہریت مل گئی۔ خط آیا آفاق چچا کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابوجان کسی شہزادے کے اتالیق ہو گئے ہیں۔ شہزادے کو بندوق کا نشانہ اور گھوڑے کی سواری سکھانے کے سلسلے میں انھیں ملازمت مل گئی تھی۔ ہمارے مختار مولوی افتخار احمد جن کو ہم چھوٹے دادا کہتے تھے، کبھی کبھی رو رو کر ذکر کرتے تھے کہ ہمارے دادا

سرکار قاضی فیاض علی اپنے دوستوں میں بیٹھ کر کہا کرتے تھے کہ ہم نے بڑی بڑی ریاستوں کے چابک سواروں کو دیکھا ہے، لیکن ننھے جیسا سوار نظر سے نہیں گزرا۔ بڑے بڑے سرکش گھوڑوں کو بغیر زین کے دوڑا دوڑا کر پسینوں میں نہلا ڈالتے تھے اور یہ کہہ کر وہ رونے لگتے۔ ایک خط آیا ۱۹۷۰ء میں کہ میں حج کرنے جارہا ہوں، تم اپنی ایک خواہش لکھو کہ میں تمہارے لیے دعا مانگ سکوں۔ میں نے جواب دیا، میرے لیے دعا کیجیے کہ میں جب تک زندہ رہوں، تندرست رہوں، معزز رہوں اور کماتا رہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی دعائیں مقبول ہوئیں۔ خط و کتابت میجر جنرل آفاق کی معرفت ہوتی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں ایک خط آیا۔ دہلی میں سعودی عرب کے ایمبیسی سے خط آیا کہ قاضی عبدالعلی صاحب کا سامان امانت کے طور پر رکھا ہوا ہے اسے کیا کیا جائے، آپ بتایئے۔ والدہ موجود تھیں۔ پورے صبر وضبط کے ساتھ انھوں نے حکم دیا کہ وہ سب نیلام کر دیا جائے اور وہ روپیہ ان کے نام پر خیرات کر دیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بہت دیا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میں اماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ سفید تو ہوگئی تھیں، لیکن ان کے عمل اور بردباری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اُٹھیں اور جانماز پر بیٹھ گئیں اور ان کا بیٹا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ساری رات شراب پیتا رہا۔

والدہ پہلے بھی معمولی سیدھے سادے کپڑے پہنتی تھیں لیکن صبح جب ناشتے پر آئیں تو سفید ساری پہنے ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں کی چوڑیاں بھی غائب تھیں۔ ناک کی کیل بھی غائب تھی۔ میں نے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ کئی دن تک میں نے ان کے چہرے کو نہیں دیکھا۔ اب ان سے میری ملاقات ناشتے اور کھانے کی میز پر بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانماز پر ہی بیٹھی رہتیں، سو جاتیں، اُٹھ پڑتیں، ضروریات سے فارغ ہوتیں اور پھر جانماز کی خدمت میں چلی جاتیں۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ میں پچھریٹہ جاؤں گی۔

میرا جی چاہا کہ میں چند روز کی چھٹی لے کر ان کو پہنچانے چلا جاؤں، لیکن انھوں نے سختی سے منع کر دیا۔ پھر ایک ملازم کے ساتھ مچھریٹہ چلی گئیں۔ اس تمام عرصے میں میں نے انھیں روتے نہیں دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک گریہ خاموشی تھیں، آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے تھے۔

اماں جانماز پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ سفید براق داؤنی باندھے ہوئے، بالکل فرشتہ معلوم ہو رہی تھیں۔ میں انھیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ابوجان جن کے حصے میں ان کے باپ کے ۱۸ لاکھ روپے آئے تھے اور وہ مچھریٹہ کے قاضی خاندان کی جائداد کے بارہ آنے کے مالک تھے، اگر ذرا بھی نارمل ہوتے تو وہ شکار بھی کھیلتے، دو ایک ملکوں کی سیاحت بھی کر لیتے، ٹھاٹ سے زندگی گزارتے۔ ان کی آخری عمر کی ملازمت کے تصور سے میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ ابوجان جب رات میں سوتے تھے تو ان کے پیر دابے جاتے۔ اگر پیر دابنے والے کو دیر ہو جائے تو غصہ کرتے تھے۔ نہیں معلوم کہ مدینہ منورہ کی زندگی میں ان پر کیا گزری ہوگی۔ دہلی میں میری سسرال کے کچھ لوگ حج کرنے گئے تو ان کو بتایا گیا کہ یہاں علی گڑھ کے ایک پروفیسر صاحب جو پدم شری ہیں، ان کے باپ ولی اللہ کی طرح رہتے ہیں۔ وہ لوگ ملنے گئے۔ ابوجان ان سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کو بہترین کھانا کھلایا، تحائف دیے، قیمتی تحائف دیے۔ انھوں نے تکلف کیا۔ ابوجان نے فرمایا کہ یہ تحفے میں اپنے بیٹے کے عزیزوں کو دے رہا ہوں۔ انھیں قبول کر لیجیے۔ مجھے خوشی ہوگی۔ ان لوگوں نے جب یہ تفصیل مجھے سنائی تو میری آنکھیں گھنٹوں آنسوؤں سے کھیلتی رہیں، اور میں سوچتا رہا کہ ٹھیک ہے ابوجان آخری وقت میں ولی اللہ تو ہو گئے لیکن جوانی کے شیطان کی حیثیت سے انھوں نے دو لوگوں کی زندگی برباد کر دی۔ میری ماں کو سہاگن بیوہ کر دیا اور مجھ کو باپ کی موجودگی میں یتیم بنا دیا۔ اماں ساری زندگی نارمل نہیں رہیں۔ اس کا سبب ابوجان کا ہجر تھا۔ ایک

رئیس گھرانے کی خاتون مدتوں تیل[1] میں بگھری ہوئی دال اور روٹی کھاتی رہی اور اس کی ڈیوڑھی پر ہر جمعرات کو چار چار پانچ پانچ فقیر دیسی گھی میں پکا ہوا گوشت اور روٹی کھاتے رہے۔ میری ماں نے مجھے انتہائی ضبط اور تحمل کے ساتھ انتہائی لاڈ پیار کے ساتھ پالا، لیکن ابو جان کا غم میری شخصیت میں گھن کی طرح لگ گیا۔ میں ذرا سی بات پر جب بگڑ جاتا ہوں، یا اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہوں، یا انتہائی غیر دانش مندی کا ثبوت دیتا ہوں تو یقین جانیے یہ سب ابو جان کے فراق کی دین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ابو جان پچھریٹہ میں ہوتے اور ان کے چھتر کا سایہ مجھے نصیب ہوتا تو میں دوسری طرح کا انسان ہوتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ اگر ابو جان ایسے نہ ہوتے جیسے تھے تو شاید میں بھی ایسا نہ ہوتا جیسا ہوں۔ یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے بجائے ایک زمیندار ہوتا۔ ادیب ہونے کے بجائے محض ایک مدرس ہوتا۔ آج ادیب کی حیثیت سے میری جو شناخت ہے تو شاید یہ بھی ابو جان کی ہجرت کی عطا ہے۔

ابو جان کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بتانا تو بھول ہی گیا۔ ابو جان سندھ میں متعین اپنے دوست بریگیڈیر آفاق کے مہمان تھے اور شکار کھیل رہے تھے۔ خیال ہوا کہ یہاں سے ٹھٹھا (سندھ کا بہت بڑا قبرستان جہاں بے شمار قبریں ہیں) بہت نزدیک ہے، اس کی زیارت کی جائے۔ آفاق چچا کسی سرکاری کام سے صدر گئے ہوئے تھے۔ ابو جان ٹھٹھا کے لیے بس پر بیٹھے۔ خیال تھا کہ شام تک پہنچ جائیں گے، لیکن بس خراب ہوگئی اور راستے ہی میں مسافر یہ کہہ کر اُتار دیے گئے کہ رات آپ لوگ یہیں گزار لیجیے۔ صبح دوسری بس آئے گی اور آپ لوگوں کو لے جائے گی۔ سامنے ایک گاؤں تھا۔ ابو جان دوسرے مسافروں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچے۔ حلوائی کی دوکان سے کچھ خریدا اور کھالیا اور ایک مسجد میں چلے گئے۔ عشا کی نماز کے بعد درود وظائف

[1] ترکِ حیوانات۔

پڑھتے رہے۔ اس اثنا میں مسجد کا مؤذن مسجد میں تالا ڈال کر گھر چلا گیا۔ ابو جان سوتے رہے۔ صبح فجر کے وقت اس نے تالا کھولا اور حسبِ دستور مسجد میں قدم رکھتے ہی کہا السلام علیکم! ابو جان نے کڑک کر جواب دیا۔ وعلیکم السلام۔ وہ بدبد بدبد بھاگا اور آگے جا کر گر پڑا۔ لوگ دوڑے۔ ابو جان سمجھ گئے کہ یہ حماقت ہوگئی۔ فوراً اپنا سامان سمیٹا اور پیچھے سے نکل گئے۔ ڈیڑھ دو میل کے بعد بس ملی، اس سے ٹھٹھا پہنچ گئے۔ ٹھٹھا کی زیارت کے بعد اسی گاؤں میں اُترے اور معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص مرگیا یہ سوچ کر کہ جنات سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ابو جان اس واقعے کو بہت افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ ہمارے وہم میں کتنی طاقت ہے جو ہم سے کچھ بھی کرا سکتا ہے۔

راشد: قاضی صاحب آپ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آپ نے واقعی سخت آزمائشوں کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کے ابتدائی ایام گزارے اور نفسیاتی الجھنوں نے پوری زندگی آپ کو بھی چین لینے نہیں دیا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ ابو جان کے ہجر نے دو لوگوں کی زندگی تباہ کردی۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی آپ یتیمی کے کرب سے گزرتے رہے اور اس اذیت کا احساس آپ کی باتوں اور چہرے کے تاثرات کے ذریعے بھی شدت کے ساتھ ہو رہا ہے، لیکن اس تناظر میں جب میں آپ کی والدہ محترمہ کی کرب و اذیت کا تصور کر رہا ہوں تو ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہو رہا ہوں۔ رئیس گھرانے کی ایک معزز خاتون نے پوری زندگی اپنے شوہر کے ہجر میں گزار دی اور زبان سے شکایت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ یہاں تک کہ ابو جان کی وفات کی خبر سن کر بھی وہ نہیں روئیں اور ان کی پوری شخصیت گریہ خاموشی میں تبدیل ہوگئی۔ قاضی صاحب میری خواہش ہے کہ آپ والدہ محترمہ کے متعلق بھی کچھ تفصیل سے بتائیں تاکہ آپ کے گھریلو پس منظر کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

قاضی عبدالستار: اماں کے بارے میں جب میں کچھ سوچتا ہوں تو ایک انتہائی بدنصیب عورت کا تصور آتا ہے۔ وہ ایک بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں بیاہ کر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی مہندی سوکھی بھی نہیں تھی کہ ابو جان کی ہجرت نے بیوگی کا جوڑا پہنا دیا۔ چھوٹا قد، ہلکا بدن، ہلکا گندمی رنگ، ذہین چمک دار چہرہ، چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا، لیکن چہرے پر تمکنت۔ آنکھیں اوسط لیکن بہت روشن۔ چال میں غرور کی حد تک اہمیت کا احساس۔ اماں بہترین کھانا پکاتی تھیں۔ جب بابا میاں نے ان کے ہاتھ کا قورمہ دو چار مرتبہ کھایا تو باورچی خانے کے اندر تشریف لائے۔ اماں گھونگھٹ کاڑھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولے تم کو تکلیف تو ہوگی لیکن پاؤ آدھ سیر گوشت کا قورمہ تم ہی پکا دیا کرو۔ روز ایک وقت، اور یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے جیسا بتایا کہ کھانا باہر پکتا تھا، لیکن بابا میاں کی ہانڈی والدہ پکاتی تھیں۔ ان کا تین چھٹاک بھر کا پاؤ کا پیالہ ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد ملازم آتا تھا کہ یہ قورمہ رات کے لیے رکھ دو۔ بابا میاں، اماں کے ہاتھ کے قورمے کے علاوہ کوئی چیز باسی نہیں کھاتے تھے۔ اماں کی دوسری خصوصیت ورقی پراٹھے تھے۔ جس نے ایک بار کھا لیے، اس نے فرمائش ضرور کی۔ بابا میاں کی زندگی میں ڈپٹی کمشنر، کمشنر، ایس پی، ڈی آئی جی، مجسٹریٹ آتے ہی رہتے تھے۔ بابا میاں اندر آتے، حسبِ دستور دوسری طرف دیکھتے ہوتے اور فرماتے۔ کبھی کبھی آپ کہتے، آپ کو تکلیف تو ہوگی، اتنی عورتیں تو ہیں۔ دو ایک کو اور بلوا لیجیے، لیکن چار پراٹھے پکا دیجیے۔ شیرینی میں مزعفر (سیویوں کا زردہ) بے نظیر پکاتی تھیں۔ میں نے ان کے مرنے کے بعد ویسا مزعفر نہیں کھایا۔ میری بہن بھی نہیں پکا پاتی۔ میری پہلی بیوی جو ایک بہت بڑے گھر کی بیٹی تھی وہ بھی نہیں پکا پاتی تھی۔ میں غصہ کر کے کہتا کہ تم لوگوں نے سیکھا کیوں نہیں۔ منتظم وہ ایسی تھیں کہ بابا میاں جائداد کے انتظام میں ان کو شریک کرتے تھے۔ مثلاً کہیں کی تحصیل وصولی آئی ہے اور بابا میاں عدالت پر

بیٹھے ہوئے ہیں، وہیں سے حکم دیتے جاؤ بی بی صاحب کے پاس جمع کرآؤ۔ کبھی کبھی نوکروں کو نکالنے اور رکھنے میں بھی مشورہ لیتے۔ ان کا ایک لکڑی کا بکس تھا۔ چھ فٹ لمبا، چار فٹ چوڑا اور ساڑھے چار فٹ اونچا۔ اس میں ان کے دھراؤ کپڑے یعنی قیمتی کپڑے، گرم اور ٹھنڈے، دوشالے، اسلحے، کارتوس اور بہت اہم کاغذات میں رکھے جاتے تھے۔ اس کی چابی اماں کے پاس تھی، جسے وہ قرآن شریف کے غلاف میں رکھتی تھیں۔ بابا میاں کو جب وہ بکس کھولنا ہوتا تو وہ چابی مانگتے۔ جو سامان ان کو لینا ہوتا، لیتے یا رکھتے اور چابی ان کے ہاتھ میں دے دیتے۔

آخری زمانے میں جب بابا میاں بیمار رہنے لگے اور وہ کم وبیش دو تین برس بیمار رہے تو باہر کے تمام فرائض اماں ادا کرتی تھیں۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید، محرم، دسہرہ، یہ سارے مراسم بابا میاں کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر ادا کرتیں۔ ایک بار بابا میاں کسی شخص سے ناخوش ہوگئے اور حکم دیا کہ اب میرے سامنے مت پڑنا۔ وہ باہر کے کسی خاص کام پر متعین تھا، وہ اماں کے پاس آتا رہا۔ ایک دن بابا میاں اندر آئے اور فرمایا کہ آج میں کھانا یہیں کھاؤں گا۔ اماں نے بہت عمدہ قورمہ پکایا۔ زعفران کے استعمال کے ساتھ پکایا۔ بابا میاں نے ایک لقمہ منھ میں رکھا اور کہا واہ۔ اماں نے گھونگھٹ کے اندر سے عرض کیا میاں میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔ بابا میاں نے کہا ہاں ہاں شوق سے کہو۔ اماں نے بہت آہستہ سے اس نوکر کا نام لیا اور کہا کہ وہ روز میرے پاس آکر روتا ہے۔ اگر مناسب سمجھئے تو معاف کر دیجیے۔ بابا میاں نے کھانا کھاتے ہوئے آواز دی۔ پہرے پہ کون ہے۔ آدمی دروازے پر آگیا۔ جاؤ فلانے شخص کو بلالاؤ اور کہو کہ حسبِ دستور کام کرے۔ ہمارے دھوبی کو پولیس نے ایک قتل میں پھانس دیا۔ پورا مجسٹریٹ کہتا تھا کہ یہ قتل میں شامل ہے لیکن اماں کو اس کی بیوی نے کس طرح رو رو کر اس کی بے گناہی کا یقین دلا دیا۔ اماں نے مزعفر پکایا اور

دوپہر کے کھانے میں پیش کیا۔ بابامیاں نے خوش ہوکر ایک چمچہ کھایا کہ اماں نے عرض کیا میاں اگر مناسب سمجھئے تو فلاں شخص کو پولیس سے کہہ کر تحقیقات میں نکلوادیجیے۔ وہ واقعی بے گناہ ہے، ورنہ میں ہرگز آپ کے حضور میں یہ گزارش پیش نہیں کرتی۔ بابامیاں نے دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے حکم دیا کہ مختار عام کو بلاؤ اور اسے اسی دن خط لکھ کر تھانے روانہ کردیا۔ رات کو تھانے دار نے اسے چھوڑ دیا۔ اور بھی بہت سے واقعات ہیں کہ اماں پراٹھے، قورمے یا مزعفر کی پلیٹ پر بابامیاں سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرالیتی تھیں۔ آخری زمانے میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اماں کے پاس مچھریٹہ اور قرب وجوار کے لوگ سفارش کے لیے نہ آتے ہوں۔ میں سب دیکھا کرتا تھا۔ آج خیال آتا ہے کہ بابامیاں ان کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔ بابامیاں جب بیمار ہوئے، مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اماں نے اتنی خدمت کی کہ ان کے دونوں پیر سوج کر ڈبل روٹی ہوگئے۔ وہ ساری ساری رات بابامیاں کی خدمت میں کھڑی رہتیں۔ بابامیاں کی آنکھ کھلتی تو ڈانٹتے کہ لیٹو جا کر۔ اماں کو وہ بھورانی کہتے تھے۔ بھورانی لیٹو جا کر۔ یہ اتنے آدمی بھرے ہوئے ہیں، کاہے کے لیے ہیں، یہ جاگتے رہیں گے۔ مگر اماں اسی طرح مجسمے کی طرح کھڑی رہتیں۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور خیرآباد کے حکیم انوار حسین ان کو آخری بار دیکھنے آئے اور پیروں پر ہاتھ رکھا۔ بابامیاں نے فرمایا، انوارحسین وہاں کیا دیکھتے ہو، گھٹنوں کا دم نکل چکا۔ ہاں تم بھورانی سے پوچھو کہ وہ مجھ سے کچھ کہلوانا چاہتی ہے۔ اماں گھونگھٹ کاڑھ کر آئیں، پائنتی کھڑی ہوئیں، کہا، میاں آپ نے کیا نہیں دیا، جو میں کچھ مانگوں اور رونے لگیں اور بابامیاں کا انتقال ہوگیا۔ اماں نے ان کے چالیسویں میں شہر بھانجی دی یعنی مچھریٹہ اور اس سے ملحق چھ گاؤں کی ساری آبادی کو ایک دن کا کھانا دیا۔ ہندوؤں کو جن کی اکثریت تھی، پوری کچوری، دوترکاریاں اور ایک مٹھائی۔

مسلمانوں کو نان گوشت اور پلاؤ زردہ، اور جو بیمار تھے ان سے پوچھ پوچھ کر پرہیزی کھانے پکوائے گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قاضی صاحب نے چاندی کا استی نوّے ہزار روپیہ چھوڑا ہے جو اماں نے ان کے فاتحوں اور ان کے نام سے صدقے اور خیرات میں بے حساب خرچ کیا، اور اس طرح خرچ کیا کہ گھر کے مصارف کے لیے ربیع کی تحصیل وصولی پر بھروسہ کرنا پڑا۔ ساری بستی میں نہیں، قرب و جوار میں اماں کی فیاضی کی شہرت ہوئی۔ راج گان (راجاؤں کی جمع) اور تعلقے داران میں ان کی غیر معمولی عزت ہوئی۔

بارہ تیرہ برس کی عمر میں جب میں شکار کھیلنے کی ضد کرنے لگا تو اماں نے مجھے بھیجا۔ وہاں میں نے ایک بار گولی چلادی جو تین میل جا کر ایک گاؤں میں گری۔ ہمارے جمعدار نے اماں کو یہ واقعہ سنایا تو اماں ڈر گئیں اور فوراً اٹھا کر ہنومان سنگھ تعلقے دار بہیٹ کو خط لکھا کہ اپنے پوتے کے شکار کے لیے ہاتھی بھیج دیجیے۔ قاضیوں کے یہاں گھوڑے تو رہے لیکن ہاتھی کبھی کسی کے یہاں نہیں پالا گیا، اس لیے کہ حضورؐ نے اس کی سواری کو مکروہ کہا ہے۔ ہم ہاتھی پر جاتے تو اوّل تو گولی چلانے کی اجازت نہیں تھی، اور اگر کبھی چلاتے بھی تو آنکھوں کے سامنے گرتی۔ جب ہم شکار کے لیے رخصت ہوتے تو اماں جانماز پر بیٹھ کر ہماری تندرستی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتیں۔ ہمارے چچا قاضی محمود علی نے ہم سے بہت پیار سے کہا تھا کہ مغرب کے وقت واپس آجایا کرو۔ بھابھی صاحبہ مغرب کی نماز کے بعد تمہاری وجہ سے سجدے میں گر پڑتی ہیں اور مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔ اس وقت مجھ سے اماں کے دکھ کو سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ آج سوچتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔ میں پتریوں کا ناچ اور نوٹنکی اور سپیرا (چھوٹی نوٹنکی جس میں نقل ہوتی ہے) دیکھنے جاتا تو جب تک واپس نہیں آتا، اماں جانماز پر بیٹھی رہتیں۔ جب میں لکھنؤ پڑھنے کے لیے جانے لگا تو اماں نے مجھ سے کہا کہ اگر تین دن کی چھٹی بھی ہو تو تم سیتاپور آجانا۔ میں سیتاپور آکر

تمہیں دیکھ لوں گی۔ آج ان کی شفقتِ بے پایاں اور محبتِ بے کنار یاد آتی ہے تو گھنٹوں اُداس بیٹھا رہتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ بابامیاں کے انتقال کے بعد ہم لوگ تقریباً لاوارث ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ ابو جان حسبِ روایت سیاحت پر روانہ ہو چکے تھے۔ ایک دن ہمارے مختار نے اطلاع دی کہ ہمارے باغ کا ایک سر سبز شاداب درخت فلانے صاحب کاٹ رہے ہیں۔ ہماری اماں نے پالکی منگوائی۔ ہم کو گھر میں چھوڑا۔ دونوں بندوقیں ملازموں کو دیں اور باغ میں داخل ہو گئیں اور کہا کہ اگر ہمت ہے تو کاٹ کے دکھاؤ۔ ایک پتے کے لیے گولی چلواؤں گی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ ہماری ماں کے انتظامی امور کا ایک ثبوت ہے۔ اسی طرح محرم کے ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں کو محتاجوں کو جتنے کھانے دیے جاتے تھے بابامیاں کے زمانے میں، اس میں ایک کھانا بھی انھوں نے کم نہیں کیا۔ اماں جب تک پچھریٹہ میں رہیں، اس روایت کو برقرار رکھا۔ جن لوگوں کے لحاف اور توشک اور ماہانہ پیسے بابامیاں کے زمانے میں مقرر تھے، وہ جائداد کی تقسیم کے باوجود پوری دیانت داری کے ساتھ دیتی رہیں۔ اس میں وہ پریشان بھی ہو جاتی تھیں۔ زمین داری فیل ہونے کے باوجود وہ کافی دنوں تک یہ فرائض ادا کرتی رہیں، لیکن جب یہ سنبھالنا مشکل ہو گیا تو انھوں نے پچھریٹہ چھوڑ دیا اور مہمانوں کی طرح آنے جانے لگیں۔ ان کا زیادہ تر وقت سیتاپور میں اپنے بھائی کے پاس اور بقیہ وقت علی گڑھ میں میرے پاس اور میری بہن کے پاس گزرنے لگا۔

راشد: بلاشبہ والدہ محترمہ کی خصوصی توجہ نے آپ کو بکھرنے سے بچایا اور ان کے حوالے سے جو خصوصیات آپ نے بیان کی ہیں اس بنا پر وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل خاتون کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کا

آخری وقت علی گڑھ میں ہی گزرا اور آپ نے ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی۔ آپ سے ان کا حددرجہ جذباتی لگاؤ فطری تھا۔ شوہر کی عدم موجودگی میں اکلوتے بیٹے سے عورت کی جو اُنسیت ہوگی، وہ سمجھی جاسکتی ہے۔ ایسے میں ماں بیٹے کا جذباتی رشتہ کچھ اور شدت اختیار کرلیتا ہے۔ بہت زیادہ لاڈ پیار سے بچے کے بگڑنے کا خطرہ بھی بنا رہتا ہے۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں جائز مقام پر بھی تنبیہ کے بجائے خاموشی کو ہی ترجیح دیتی ہے، اور اس طرح ایک مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ والدہ محترمہ کے ساتھ آپ کے رشتے ہمیشہ خوش گوار رہے اور آپ نے ہر قدم پر ایک فرماں بردار فرزند کا ثبوت پیش کیا۔ والدہ محترمہ کے حوالے سے کچھ اور باتوں کا بیان کریں تاکہ ان کے آخری وقت کی جھلکیاں بھی سامنے آسکیں۔

قاضی عبدالستار: علی گڑھ میں جس دن مجھے وظیفہ ملا، اس دن سے اماں کے آخری وقت تک میں نے ان سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ قرض مانگا اور دس دس ہزار روپیہ مانگا جو اس زمانے میں خاصی رقم ہوا کرتا تھا اور جب میں جوڑ کر پورے دس ہزار ان کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ رونے لگتیں اور کہتیں کہ یہ سب کچھ تیرا ہے۔ میں کیا جہیز میں لائی تھی۔ اپنے پاس رکھ، لیکن میں اصرار کرکے واپس کرتا اور وہ آنسوؤں سے بھیگے ہاتھوں سے روپیہ رکھ لیتیں۔ علی گڑھ میں وہ ایک بار ڈاکٹر کو دکھلانے گئیں۔ دانت کے ڈاکٹر نے کہا کہ اماں یہ دوا بہت مہنگی ہے۔ اماں اپنی وہبی انکساری اور خاکساری کے باوجود بھڑک گئیں۔ فرمایا تم مجھے جانتے ہو، میں قاضی عبدالستار کی ماں ہوں۔ اس نے بہت معذرت کی، تب وہ نارمل ہوئیں۔ یہ واقعہ بھی مجھے اسی ڈاکٹر نے بتایا۔ بیماری کے عالم میں وہ اپنے پوتوں سے کہتی تھیں کہ اپنے باپ کی اسی طرح خدمت کرنا جس طرح تمہارا باپ میری خدمت کرتا ہے۔ میری زندگی میں مسرت کے لمحے بہت کم آئے، لیکن ان میں

ایک جگمگاتا ہوا لمحہ وہ بھی تھا جب مجھے یقین ہوا کہ میری ماں مجھ سے خوش گئی ہیں۔ جس رات سوتے میں ان کا انتقال ہوا تو اس دن دوپہر میں مجھ کو بلایا اور کہا کہ جمعدارن نے اس کمرے میں فینائل کا پونچھا لگا دیا ہے۔ اس کی بو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے ان کو اُٹھایا اور دالان میں بٹھا دیا اور نوکر سے پانی کی بالٹی بھروائی اور ڈیٹول ڈال کر میں نے کمرے کو دھونا شروع کیا۔ میرے دونوں بیٹے دریز اور شاویز جو بچے تھے، لیکن میرا ہاتھ بٹانا چاہتے تھے، میں نے منع کر دیا۔ دریز نے پوچھا، پاپا آپ ہم لوگوں سے کچھ ناخوش ہیں۔ ہم نے کہا نہیں بیٹے ہم تم دونوں سے خوش ہیں، لیکن تمہاری دادی جان کے کمرے کی دھلائی اس لیے کر رہے ہیں کہ شاید خدا میرے گناہوں کو دھو ڈالے۔ اماں نے پوری عمر میں دوسری بار مجھے بلایا، سینے سے لگایا اور پھپھکنے لگیں۔ پہلی بار اس وقت گلے لگایا تھا جب میں یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا تھا اور مجھ رہتہ گیا تھا۔ انھوں نے مجھے لپٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا جس کی گرمی قبر تک جائے گی انشاءاللہ۔ ہاں اسی دن شام میں اماں نے اصرار کیا کہ تم کلب چلے جاؤ۔ یہاں دونوں نوکر ہیں اور دونوں پوتے ہیں، یہ سنبھال لیں گے۔ اگر کوئی بات ہوئی تو، ورنہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دس بجے رات کو واپس آیا تو اماں کے کمرے میں دونوں بچوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ میں گیا، اماں سے خیریت پوچھی۔ خوشی سے کہا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے بچوں سے کہا کہ تم لوگ اب لیٹو۔ دادی کو سونے دو، لیکن اماں نے فرمایا جب ان کا جی چاہے گا، چلے جائیں گے۔ بچے گیارہ بجے کے قریب واپس آئے۔ اپنے کمرے میں گیا، میں بھی سو گیا۔ صبح ہوئی تو میرا ملازم چھیدو چائے لے کر آیا۔ میرا طریقہ تھا کہ صبح کی چائے پہلے اماں کے پاس جاتی، پھر میری، کوثر (بیگم) اور بچوں کے لیے آتی، لیکن اس وقت کوثر موجود نہیں تھیں۔ دہلی گئی ہوئی تھیں اور بیمار ہو چکی تھیں۔ شدید بیمار ہو چکی تھیں۔ خیر چھیدو نے کہا کہ چار بجے تو سوئی ہیں بی بی،

اب سو رہی ہیں۔ نو بجے کے قریب میں نے پھر چھیدو کو بھیجا تو اس نے کہا کہ سو رہی ہیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ نبض ٹٹولنے کی کوشش کی تو نہ صرف ہاتھ کانپنے لگے بلکہ سارے بدن میں لرزہ طاری ہو گیا۔ میں جیسے کھڑا ہوا تھا، ویسے ہی پروفیسر طارق جیلانی کے گھر گیا اور ڈاکٹر عذرا جیلانی سے گزارش کی کہ آپ میری ماں کو دیکھ لیجیے۔ وہ بھی از راہِ سعادت جو کپڑے پہنے بیٹھی تھیں، انھیں میں کھڑی ہو گئیں۔ مجھ کو اور طارق کو لے کر گھر آئیں۔ اماں کو دیکھا اور میرے قریب آکر چپکے سے کہا۔ صبر کیجیے، وہ شاید سوتے میں انتقال کر چکی ہیں۔ طارق جیلانی اور مسعود عالم نے میری ماں کی تجہیز و تکفین میں پوری معاونت کی۔ میں آج بھی ان دونوں کا احسان مند ہوں۔

راشد: قاضی صاحب مچھریٹہ اور سیتاپور کی یادیں آپ کے ذہن میں اس تازگی کے ساتھ محفوظ ہیں کہ جب بھی ان کا ذکر آپ کی زبان پر آتا ہے، ایک خاص طرح کی چمک آنکھوں میں نمودار ہو جاتی ہے۔ قصباتی زندگی میں قدرے مختلف تجربوں سے روشناس کراتی ہے۔ والدین کے انفرادی ذکر کے بعد آپ اجتماعی طور پر ان یادوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کریں جو مچھریٹہ اور سیتاپور کے مختلف واقعات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان دونوں علاقوں میں ہولی، دیوالی کے علاوہ محرم کے تعزیے جوش و خروش کے ساتھ آج بھی نکالے جاتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں تو ان چیزوں کا مزید رواج ہوگا۔ ظاہر ہے بچپن بہت سی یادیں آپ کے ذہن میں بکھری ہوں گی جن کا بیان آپ نے شروع کیا تو ڈھیر ساری سی باتیں، خود بخود شامل ہوتی چلی جائیں گی۔

قاضی عبدالستار: جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ میرے بابا میاں قاضی فرخند علی صاحب کے انتقال کے بعد میں اپنے آپ کو اپنے باپ کی زندگی میں یتیم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے کہ ابو جان مسلسل شکار اور سیاحی پر رہتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ بابا میاں کی زندگی میں ہولی آتی تھی تو مختلف گاؤں سے نقلیں اور تماشے ہڑک

بجاتے ہوئے آتے تھے اور جب ہجوم بابا میاں کے پاؤں چھونے کے لیے
بڑھتا تو وہ اپنے پیر سمیٹ لیتے اور میرے پاؤں بڑھا دیتے۔ دیوالی میں
ہمارے یہاں گنا ہوا ایک ہزار چراغ جلتا تھا اور جھوٗے (ہزار ٹوکرا) میں
آتش بازی آتی تھی اور ہم کو صرف مہتاب اور پھلجھڑی چھوڑنے کی اجازت تھی۔
باقی تمام آتش بازی بچوں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ دیوالی میں ہمارے لیے
گھروندا بنتا تھا۔ چوڑے، لاے اور بتاشے اور کھلونوں سے گھروندا بھر دیا
جاتا تھا۔ ہم شکر کے جانور، شکر کے پالکی، اور آتش بازیاں جو گولے اور چھچھوندر
کی شکل میں ہوتی تھیں، ان کو اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے تھے۔ بابا میاں کے
انتقال کے بعد جب دیوالی آئی تو نہ چراغ جلے، نہ جھوٗے میں آتش بازی آئی،
نہ گھروندے میں چوڑے، لائے اور کھلونے بھرے گئے۔ والدہ نے رسمی طور پر
ہر چیز منگوائی، لیکن وہ ہماری نظروں میں کیا سما سکتی تھی، پھر محرم آ گیا۔ ہمارے
یہاں آٹھ محرم کو مجلس ہوتی تھی لیکن تعزیہ نہیں رکھا جاتا تھا۔ مجلس ہوئی لیکن وہ
شان نہیں تھی جو بابا میاں کی زندگی میں ہوتی تھی۔ دس محرم کو میں تعزیوں کے
جلوس میں چل رہا تھا کہ ایک شخص نے دوسرے کہا کہ اگر کوئی شخص جب تعزیہ
چوک پر رکھا جائے اور کوئی دعا مانگے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس خبر سے مجھ پر
عجیب عالم گزر گیا۔ پہلی بار خیال آیا کہ اگر ہم نے تعزیہ رکھ کر ابو جان کی مستقل
رہائش کے لیے دعا مانگی ہوتی تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔ وہ محرم گزر گئے۔ سب
تہوار آئے، لیکن مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ جب دوبارہ محرم آئے تو
میں نے اپنے دوستوں کے سامنے اپنا پلان رکھا کہ اسی سال میں تعزیہ رکھوں گا،
اور اپنے دوست قربان علی حجام کے چوک پر رکھوں گا۔ ہمارے حلقے کے
حسینی گدی رام داس بقال، کڑھیلے پاسی، جمیل انصاری جو ہمارے دوست تھے،
ان سب نے بہت گرم جوشی سے تائید کی۔ ہمارے پاس تین روپے تھے۔ ایک روپیہ
ہم کو دادی جان نے دیا تھا۔ ایک پھوپھی جان نے اور ایک والدہ نے۔ ہم نے

ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا اور تعزیہ خریدنے پہنچ گیا۔ آٹھ نوانچ کی ضریح کسی ٹھاکر نے اپنے بیٹے کے لیے بنوائی تھی۔ ہم نے پوچھا اس کا ہدیہ کیا ہے۔ اس نے کہا آٹھ آنے، لیکن اس کا ہدیہ آچکا ہے۔ ہم ضدی آدمی تھے۔ ہم نے آٹھ آنے دیے اور ضریح لے آئے (صحیح قیمت یاد نہیں) اور اب یہ طے ہوا کہ تعزیہ تو رکھ دیا جائے گا، روشنی کا بھی انتظام ہونا چاہیے، چائے کا بھی انتظام ہونا چاہیے اور ماتم ہونا چاہیے۔ اسی پریشانی میں ہم مبتلا تھے کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔

رام دین پاسی جو ہماری جائداد کا نگراں تھا اور جو والدہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا، وہ نظر آگیا۔ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر پھاٹک کی سہ دری میں لے گئے اور رونے لگے۔ اس نے خود رو رو کر کہا کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ میں نے کہا کہ میں نے ابو جان کی منت کا تعزیہ قربان علی کے چوک پر رکھا ہے۔ وہ نہیں سمجھا، لیکن پھر سمجھ گیا اور چیخ مار کر بولا کہ تم ہم کا پہلے کاہے نہیں بتائے۔ ابھے سب انتجام ہوت۔ اب باجے بجنے لگے اور بستی کا سب سے بڑا تعزیہ چوک پر آگیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب تمام تعزیے چوک پر آسکتے ہیں۔ ہم نے تعزیہ چوک پر رکھ دیا۔

اتنے میں دیکھا کہ ایک طرف سے ہمارے چچا قاضی اختر علی دس پانچ آدمیوں کے ساتھ نکل پڑے۔ حجام کے چوک پر بڑی رونق دیکھی اور ہم کو بہت مصروف پایا۔ ٹھٹھک کر دیکھا، چلے گئے کہ تھناپاسی کندھے پر بندوق رکھے کارتوسوں کی پٹی گلے میں پہنے آیا اور کہا کہ چلو بھیا بلا رہے ہیں۔ اختر چچا چپو والی لمبی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رام دین اکڑوں ان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اختر چچا نے ہمیں دیکھتے ہی لپک کر دبوچ لیا اور چیخ ماری کہ تم نے ہم کو کیوں نہیں بتایا۔ ہم تعزیہ رکھتے اور ایسا رکھتے کہ سب تماشا دیکھتے۔ رام دین، بھیا کے تعزیے کے لیے سارا انتظام ہو۔ ہم آنسو پونچھتے، اچھلتے کودتے اپنے دوستوں کے پاس آئے اور خوش خبری سنائی۔ پھر ایک دوسرا آدمی آیا اور کہا کہ آپ کو بی بی صاحب (والدہ) نے بلایا ہے۔ ہم ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر پہنچے تھے کہ اماں

کے سسکنے کی آواز آئی۔ ہم دروازے پر ہی کھڑے ہو گئے۔ اختر چچا نے ان کو پوری کہانی سنا دی تھی، اور کہا تھا کہ بھابھی صاحب آپ کوئی ڈانٹ ڈپٹ مت کیجیے گا، یہ بہت خطرناک عمر ہے۔ اماں نے ایک بار اپنے آنسو پونچھے اور کہا کہ چوری سے یا شہ زوری سے کسی طرح تعزیہ رکھ دیا گیا۔ اب سارے مراسم اس ڈیوڑھی کی شان کے مطابق ہوں گے۔ ہم بھاگ آئے وہاں سے، اس لیے کہ باجوں کا شور بہت قریب آ گیا تھا۔ دوڑتے ہوئے پہنچے۔ رام دین دو جوڑ باجے لے کر آ گئے تھے اور وہ تعزیے کے سامنے محرم کی دھن میں بجنے لگے تھے اور میں رونے لگا تھا کہ کسی نے مجھے گود میں اُٹھا لیا وہ رام دین بابا تھے اور کہا کہ چلو بی بی صاحب بلاوت ہے۔ اماں نے ہمیں لپٹایا اور کہا کہ تم کو مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ خیر تمہارے جو ہندو دوست ہیں ان کو بھگوان دین حلوائی کے پاس بھیج دو کھانا کھانے کے لیے اور جو مسلمان دوست ہیں ان کو گھر بھیج دو میرے پاس۔ تمہارے تعزیے کے سامنے نوحے بھی پڑھے جائیں گے، ماتم بھی ہوگا اور چائے کی سبیل بھی ہوگی۔ سارا انتظام ابھی ہوتا ہے، اور جاؤ دیکھو رونا مت۔
ہماری بستی میں چار باجے محرم کے ہوتے تھے اور ایک ارگن باجا ہوتا تھا۔ اختر چچا کے حکم سے چاروں باجے مع ارگن باجے کے ایک گھنٹے تک چوک پر بجتے رہے۔ روشنی کے بارہ پھاٹک جو ساتویں اور آٹھویں کے جلوس میں نکلتے تھے، وہ سب چوک کے چاروں طرف لگائے گئے اور چار ہنڈے اور چار گیسیں روشن کی گئیں اور چائے کی سبیل کا تخت لگ گیا۔ ہمارے اور ہمارے دوستوں کو کسی کو بھوک اور پیاس نہیں تھی۔ جب باجے بجتے تو نہ صرف ہم بلکہ ہمارے دوست بھی ابو جان کے آنے کی منت مانگتے، دعائیں کرتے اور رونے لگتے۔ گیارہ بجے رات کو ہمارے خاندان کی بیبیوں کا جلوس آیا اور ڈھیروں مٹھائی تعزیے کے سامنے رکھ دی گئیں۔ دو بجے رات تک نوحے پڑھے جاتے رہے، ماتم ہوتا رہا، تب کہیں ہمیں بھوک لگی۔ ہم لوگ کھانا کھا کر پھر آئے اور دیکھا کہ

پیال (پوال) بچھا ہوا ہے، چاندنی لگی ہوئی ہے، گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں اور ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم کو نہیں معلوم کہ ہم کب سوئے لیکن جب آنکھ کھلی تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری مراد پوری ہو گئی اور ابو جان ضرور آئیں گے۔ ہم جلوس کے ساتھ کربلا پہنچے۔ کربلا کے سامنے گرکھیت کا ماتم ہوتا تھا۔ یعنی ہجوم کے حلقے میں دس بارہ لوگ دیوانگی کی حد تک جوش وخروش سے ماتم کرتے تھے۔ اس حلقے میں ہم بھی پھاند پڑے۔ ہم نے اتنا ماتم کیا کہ ہم بے ہوش ہو گئے۔ ہمیں گود میں اُٹھا کر لایا گیا۔ ساری بستی میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔

ہماری بستی میں عشرہ ہوتا تھا، دسواں نہیں ہوتا تھا۔ اگلے محرم میں ہم نے اپنے چچا قاضی اختر علی صاحب سے ضد کی کہ دسواں ہوگا۔ انھوں نے سمجھایا کہ حکومت کی اجازت لینی پڑے گی اور بہت سے جھنجھٹ ہوں گے، لیکن بالآخر وہ رضامند ہو گئے۔ اجازت حاصل کر لی گئی۔ عشرے کا جلوس جو اپنے عروج پر تھا، تب باجے بند کر دیے گئے اور اختر چچا ایک بھونپو لے کر ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ چھبّن بھیا دسواں کریں گے۔ جتنے اچھے تعزیے ہیں وہ روک لیے جائیں، دسویں کو دکانوں سے کوئی محصول نہیں لیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ، اور اگر کسی کو کوئی اعتراض ہے تو بولے۔ اس کے جواب میں نعرۂ تکبیر بلند ہوئی۔ اختر چچا نے جتنا روپیہ مانگا، وہ سب میری ماں نے دیا اور اتنا بڑا دسواں ہوا کہ اس کے بعد لوگ آج تک عشرہ دیکھنے نہیں آتے ہیں، مچھریٹے کا دسواں دیکھنے آتے ہیں۔ یہ سب میں نے کیا اور لطف یہ کہ ابو جان آ گئے۔ وہ دو تین مہینے ہمارے پاس رہے، پھر سیاحت کو نکل گئے، لیکن تعزیہ اور دسواں آج بھی ہوتا ہے۔ ہاں محرم کے حوالے سے ایک بات اور یاد آئی۔ میرے بابا میاں قاضی فرخند علی صاحب نے جوگیوں کو حکم دیا کہ تمہارا تعزیہ اتنی اونچائی کا ہوگا تا کہ پیپل کی شاخ نہ کاٹنی پڑے، لیکن جوگی تو جوگی، دو چار انگل اور اونچا لے آئے۔ جب ان کا تعزیہ ایک خاص مقام پر پہنچا تو یہ ہوا کہ

شاخ کاٹی جائے۔ بابا میاں برہم ہوگئے۔ حکم دیا تعزیے زمین پر رکھ دو اور چالیس پچاس مزدور طلب ہوئے۔ ہدایت ہوئی کہ سڑک تین فٹ گہری کھود دو اور کھدی ہوئی سڑک سے تعزیوں کا جلوس نکلوا دیا۔ عشرے کے بعد جوگی طلب ہوئے اور کھمبے میں بندھوائے گئے اور دس دس پانچ پانچ جوتوں سے سب کی مدارات ہوئی۔ اس دن کے بعد سے آج تک جوگیوں کا تعزیہ جو مچھریٹہ کا سب سے بلند تعزیہ ہوتا ہے، ایک مخصوص اونچائی سے آگے نہیں بڑھتا۔ بابا میاں کے انتقال کو ایک زمانہ ہوگیا، لیکن ان کا یہ انصاف کہانی کے طور پر مشہور ہے۔

راشد: قاضی صاحب آپ کی باتیں اتنی دلچسپ ہیں کہ سننے والا خود بھی ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے اور ہم مچھریٹہ اور سیتاپور کے قصباتی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تعلق دارانہ اور زمین دارانہ ماحول کی جب بات کی جائے تو فطری طور پر بعض خصوصیات ناگزیر حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ رقص و موسیقی سے خصوصی شغف یا شراب و شباب کا سلسلہ اور پھر شکار میں غیر معمولی دلچسپی وغیرہ کی باتیں سامنے کی ہیں۔ آپ کے افسانوں اور ناولوں کی فضا اسی ماحول کی عکاسی کرتی ہے لیکن یہ ساری باتیں حقیقی اور فطری انداز میں شاید تحریروں کا حصہ نہیں بن پاتیں اگر آپ کا تعلق بھی زمین دارانہ ماحول سے قائم نہ ہوتا۔ چوں کہ ان تمام چیزوں کو یقیناً آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا، لہٰذا اپنے مخصوص تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

قاضی عبدالستار: اس سے پہلے کہ میں ماضی کے سفر پر روانہ ہو جاؤں، دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ غالباً آپ نے تعلقے دار اور زمین دار کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان دونوں میں واضح فرق ہے۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مخبری کی، انگریزوں کا ساتھ دیا، ان کو صرف اودھ میں تعلقے داری کی سند دی گئی اور باقی لوگ زمین دار کے زمین دار رہے۔ مثلاً بلرام پور کا مہاراجہ ۶۰ لاکھ کی سالانہ ریاست کے باوجود تعلقے دار تھا اور مچھریٹہ کے

قریب ایک صاحب جن کے پاس صرف ۵۰ بیگھا زمین تھی، وہ بھی تعلو تے دار تھے۔ جن لوگوں کے پاس سند نہیں تھی وہ زمین دار تھے۔ خواہ ان کے پاس پچاس گاؤں ہوں، اور تعلو تے دار کے پاس پچاس بیگھے ہوں، تعلو تے داری کی شان کے لیے سات چیزیں ضروری تھیں۔ گڑگڑی (حقہ)، تڑتڑی (گالیاں)، ہاتھی، پٹریا (تعلو تے دار اگر ۹۰ برس کا ہو تب بھی ۱۶ برس کی رنڈی نوکر رکھے گا) کرجا (قرض ہونا ضروری ہے)، گھنٹہ (گھنٹہ بجنا ضروری ہے) اور عدالت۔ یہ ساتوں چیزیں تعلو تے داری کے لیے لازمی ہیں۔ عدالت کے کئی معنی ہیں۔ صحیح معنی یہ ہے کہ وہ انصاف کرے گا، بے ایمانی نہیں کرے گا رعایا کے ساتھ اور یہ بھی کہ وہ گورنمنٹ کی طرف سے آنریری مجسٹریٹ ہوگا۔ پورے ہندوستان میں اودھ واحد علاقہ تھا جہاں تعلو تے داری نظام تھا اور مسلمان رئیس بھی راجا کہا جاتا تھا، ورنہ سارے ہندوستان میں مسلمان رئیس نواب کہا جاتا تھا۔ مثلاً محمود آباد راجہ تھے اور لیاقت علی خاں نواب تھے۔ یہ مغربی یوپی میں تھے، وہ اودھ میں تھے۔ میرا خیال ہے کہ جو باتیں میں واضح کرنا چاہتا تھا وہ شاید واضح ہوگئی ہیں۔ اب میں آپ کے سوال کی طرف لوٹتا ہوں۔

میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی جب ابو جان ایک مرتبہ پھر سیاحت پر نکل گئے اور میری آنکھیں آنسوؤں کی پوٹلیاں بن گئیں اور میری ماں، اپنے غم کو بھول کر مجھے بہلانے کی کوشش کرنے لگیں۔ مچھریٹے میں ہی نہیں، بلکہ کوسوں کوس کے اندر بھی اگر نوٹنکی ہوتی یا سپڑہ (ولگر چھوٹا ڈرامہ) ہوتا یا پتریا کا ناچ ہوتا تو والدہ اپنی ساری ثقاہت کے باوجود میرے دل کو بہلانے کے لیے وہاں بھیج دیتیں۔ جب تحصیل مسرکھ کا مشہور میلہ ہوتا اور اس میں زمین داروں کے کیمپ لگتے اور میلے میں مشہور نوٹنکیاں آتیں جیسے ترموہن کی نوٹنکی اور نمبردار کی نوٹنکی بہت مشہور تھی، تو میں مغرب کے بعد کھانا کھاتا۔ چار آدمیوں اور دو بندوقوں کے ساتھ روانہ ہو جاتا اور نوٹنکی دیکھتا بلکہ نوٹنکی کی رقاصہ گلاب جان کا

رقص دیکھتا۔ چار بجے صبح گلاب جان کا آخری رقص ہوتا۔ وہ دیکھ کر ہم واپس چلے آتے۔ اس کی آواز کا طلسم یہ تھا کہ میں ۱۹۵۱ء میں جب لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم تھا، ایک بار پروفیسر احتشام حسین کے ساتھ دانش محل سے حضرت گنج جارہا تھا۔ ایک ریکارڈ بجا— ''دیوانہ گیا دامن سے لپٹ/کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ''۔ احتشام صاحب ٹھٹھک گئے۔ ایسی زندہ خوب صورت اور بے نظیر آواز تھی۔ مجھ سے پوچھا۔ یہ کون گارہی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ استاد نے مجھ سے کیوں پوچھا۔ پہلے میں شرمایا، پھر میں نے چپکے سے عرض کیا کہ گلاب جان ہے۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں مسرکھ کے میلے کی نوٹنکی میں اس کو بارہا سن چکا ہوں۔ پھر جب میلہ ختم ہوجاتا تو میرے چچا قاضی اختر علی صاحب گلاب جان کو مچھریٹہ طلب کرتے اور رقص دیکھتے۔ احتشام صاحب چپ ہوگئے۔ یہ تو میں نے آپ کو اس لیے سنایا راشد صاحب کہ گلاب جان کی آواز اس قیامت کی آواز تھی۔ ہمارے مچھریٹے کی طوائفوں کا ذکر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کیا ہے۔ ہمارے لڑکپن میں مچھریٹے کی طوائفوں کا مرکز امام باڑہ مشہور تھا۔ نواب واجد علی شاہ کے وزیر نواب علی نقی خاں نے جن کی ایک پھوپھی نے امام باڑہ بنوایا تھا، جو بادشاہ کی محل تھی اور نواب نقی کی نمک حرامی جب جھنڈے پر چڑھی تو مچھریٹہ اس کم بخت کی نمک حرامی کی بنا پر بدنام ہوا۔ ہمارے لڑکپن میں وہاں ایک پتریا تھی جس کا نام تھا جلیبی جان۔ اس کی آواز گلاب جان سے بھی بڑھ کر تھی۔ صورت شکل معمولی نہیں، بلکہ غیر معمولی حد تک خراب تھی لیکن جب پشواز پہن کر ساز کے ساتھ تان لیتی تو سماعت میں چراغ جل جاتے۔ ہم تیرہ چودہ سال کے تھے، جب مچھریٹہ میں طاعون چلا۔ ہمارے گھر نے مچھریٹہ چھوڑ کر اپنے گاؤں مرزا پور کے کوٹھار میں پناہ لی۔ ہم اپنے چچا قاضی محمود علی کے ساتھ کوٹھار کی چھت پر لیٹے تھے۔ کوٹھار سے مچھریٹہ کم از کم ایک کوس تھا۔ ہوا ہمارے موافق تھی کہ اب تان آئی —

''محمد میر محفل بود شب جائے کہ من بودم'' محمود چچا تو خیر محمود چچا، ہم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پوری غزل ختم ہوگئی، لیکن ہم دونوں دیر تک اس کے سحر میں مبتلا رہے۔

ایک اور واقعہ مشہور ہے کہ بہٹ بیرم (گاؤں) کے کسی تعلو قے دار کے یہاں شادی تھی۔ لکھنؤ اور بنارس سے طوائفیں آئی تھیں۔ مجرے ہورہے تھے کہ ٹھاکر نے جو صاحبِ خانہ تھے، جلیبی جان کو آواز دی۔ جب وہ محفل میں آئیں تو ساری محفل ان کی بدصورتی پر ہنسنے لگی، لیکن جب انھوں نے غزل چھیڑی تو سناٹا ہوگیا۔ ٹھاکر کی دونوں جیبیں خالی ہوگئیں تو اپنے کانوں سے موتی اُتار کر پھینک دیے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ جلیبی جان کا مجرا فوراً ختم کر دیا گیا ورنہ معلوم نہیں کہ اس محفل سے کتنا لوٹ لیتی۔ نوٹنکی، رقص کے علاوہ ہماری دوسری تفریح شکار تھی۔ ہم تیرہ برس کی عمر میں شکار کھیلنے جانے لگے تھے۔ ہم بندوق سنبھال نہیں پاتے تھے۔ ایک آدمی گھٹنوں پر کھڑا ہوتا، ہم اس کے کندھے پر بندوق رکھتے اور فائر کرتے۔ نشانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہم دَن کی آواز سے خوش ہوجاتے تھے۔ یہی ہمارے لیے Pleasure تھا۔ کبھی لہڑو (چھوٹی سی بیل گاڑی) پر اور کبھی ہاتھی پر سوار ہم صبح سے شام تک جنگلوں میں خاک چھانتے رہتے۔ شکار کے نام پر فائر کرتے رہتے اور کبھی کوئی پرتک نصیب نہیں ہوتا، لیکن ہم خوش خوش اپنے گھر واپس آتے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں جب ہم قدرے بہتر کھیلنے لگے تب بھی ہمارا نشانہ خدا کے فضل و کرم سے چودہ پندرہ فی صد سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

راشد: جہاں تک افسانے اور ناول میں قصے کی پیش کش کا سوال ہے، بنیادی تقسیم کے سلسلے میں آپ کا نشانہ غیر معمولی رہا ہے، یعنی جو مقصد آپ کے پیشِ نگاہ ہوتا ہے، اس کی موثر اور بھرپور ترجمانی میں آپ کو کامیابی نصیب ہوتی ہے لیکن یہ معاملات زندگی کے بنیادی تجربات سے متعلق ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو فن کار تصوراتی سطح پر جتنا مستحکم نظر آئے، اس کی عملی زندگی بھی اتنی ہی کامیاب دکھائی دے۔ زمین دار طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ کی بنیادی ترجیحات میں

شکار شامل نہیں ہو پایا اور غالباً سی بنا پر آپ نے اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت نہیں کیے، لیکن شکار کے سلسلے میں بھی کچھ واقعات ایسے تو ضرور ہوتے ہوں گے جن کی یادیں آپ کے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ بعض اوقات ویسے بھی زندگی میں منظم ترتیب سے زیادہ بے ترتیبی یا نا تکمیلیت کا جذبہ زیادہ تازگی کے ساتھ ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار: ہاں یہ بات آپ نے بالکل درست فرمائی۔ شکار کے معاملے میں ناقص ہونے کے باوجود دو شکار ایسے ہیں جو ساری زندگی مجھے یاد رہیں گے۔ ۱۹۵۷ء میں میری شادی ہوئی۔ میں اپنے سسرال 'کرسی' گیا۔ میرے خسر چودھری محمود وہاں کے تعلوقے دار تھے۔ ہر چند میرے خسر خاتمۂ زمین داری کے بعد شکار چھوڑ چکے تھے، تاہم ان کے بڑے بیٹے چودھری حبیب کی دھوم تھی اور ہمیں شکار کی دعوت دی گئی۔ ہم نے بہت جان بچانا چاہی لیکن مجبوراً جانا پڑا۔ چار بجے صبح شکاری لباس پہن کر ہم جیپ پر بیٹھے۔ جھیل کے کنارے پہنچے۔ سرمائی پرندوں کی ڈاریں اس طرح اُٹھیں کہ آسمان کالا ہو گیا۔ چودھری حبیب نے آواز دی، بھائی صاحب ماریے، مگر میری ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جس وقت یہ طے ہوا کہ مجھے شکار پر جانا ہے، اس وقت سے شکار گاہ تک میں دعا مانگتا رہا کہ اللہ میاں آج ایک چڑیا گروا دیجیے۔ چودھری حبیب شکار کھیلتے رہے اور میری خاموشی پر افسوس کرتے رہے۔ اچانک سون (بڑی مرغابی) کی ایک ڈار سر کے اوپر سے گزری۔ میں نے بندوق سیدھی کی، آنکھیں بند کیں اور دعائیں مانگ کر فائر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے آسمان سے کوئی گٹھری گر پڑی۔ وہ نر پرندہ تھا۔ سارے میں دھوم مچ گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بندوق رکھ دی۔ فوراً گھر آیا۔ چودھری صاحب نے فرمایا کہ آپ کا بیگ سب سے بڑا ہے۔ اس لیے کہ سون ہے، نر ہے اور ایک ہی کارتوس کا شکار ہے۔ ہم اتراتے پھرے۔ بہت اصرار کیا گیا، لیکن پھر ہم شکار پر نہیں گئے۔

ہم مچھریٹہ میں تھے اور لکچرر ہو چکے تھے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں گھر گئے۔ اپنے چچا قاضی محمود علی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ آدمی آئے اور کہا کہ مرزاپور کے اوکھ کے چک میں بڑیلا (بڑا جنگلی سور) آگیا ہے۔ اس کے دانت چھ انگل کے ہیں۔ محمود چچا نے فوراً حکم دیا کہ گاڑی پر تم لوگ بیٹھ جاؤ، ہم آرہے ہیں۔ ہم نے بھی ضد کی۔ محمود چچا ہم کو بھی لے گئے، لیکن تین طرف سے آدمی کھڑے کیے گئے اور مجھے اس جگہ بٹھایا گیا جہاں بڑیلا کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہانکا ہوا۔ بڑیلا نکلا اور میرے سامنے نکلا۔ میرے دونوں طرف دو آدمی بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ دونوں کے نشانے بہت اچھے تھے۔ دونوں نے کہا بھیا ماریے۔ ہم نے ٹریگر دبانے کے بجائے بندوق کھول دی۔ کارتوس باہر نکل گئے، اور بڑیلا تیس گز تک آگیا۔ ایک آدمی نے جلدی سے اپنی بندوق مجھے دی، کہا ماریے۔ میں نے بندوق سیدھی کی، نشانہ لیا، انگلی ٹریگر تک پہنچی تھی کہ دوسری بندوق سے فائر ہوگیا۔ کسی نے گولی چلائی تھی۔ بڑیلا اُچھلا اور ڈھیر ہوگیا۔ شور ہوا بھیا نے مار دیا، بھیا نے مار دیا۔ اتنے لوگوں نے مبارک باد دی کہ میں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ قبول کرلیا۔ جب رات کا کھانا لگا تو محمود چچا نے پوچھا اب آپ سچ سچ بتایئے کہ بڑیلے کا چکر کیا تھا۔ میں دیر تک ہنستا رہا۔ پھر میں نے پوری رام کہانی سنادی۔ انھوں نے چچی جان کو مخاطب کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ بھیا نے فائر نہیں کیا ہے، فائر جمعدار نے کیا ہے، سچ ہوا نا۔ چچی جان نے کہا کہ اب آپ باہر نہیں کہیں گے کہ بھیا نے فائر نہیں کیا۔ مچھریٹہ میں آج تک ہمارے اس شکار کا افسانہ سنایا جاتا ہے۔ ہمارے متعلق بہت سی جھوٹی باتوں کی طرح اس کی بھی بڑی شہرت ہے۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کی زبانی جب مچھریٹہ اور سیتاپور کا بیان سنتا ہوں تو مجھے آر.کے. نارائن کی ''مالگڈی ڈیز'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات جو عام دنوں میں رونما ہوتے ہیں، آر.کے. نارائن

نے 'مالگڈی ڈیز' میں انھیں اس خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کا نقش دلوں سے محو نہیں ہوتا۔ بالکل یہی کیفیت پھریٹہ اور سیتاپور کے بیان میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ آپ نے کئی واقعات کو تفصیل سے بیان کیا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب بھی آپ کے ذہن میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو قصباتی زندگی کے مخصوص ماحول پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

قاضی عبدالستار: راشد میاں باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن میں تمام باتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ خاص خاص باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عامیانہ پن شامل نہ ہو پائے۔ قصبے کی زندگی میں بہت سی باتیں شہروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ زندگی گزارنے کے طریقے، سوچنے سمجھنے کے رویے، تمام چیزیں مخصوص ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ہم نے اپنے حقیقی دادا کی طرح اپنی حقیقی دادی کو بھی نہیں دیکھا۔ ہم چھ مہینے کے تھے جب ہمارے حقیقی دادا سرکار کا انتقال ہوا اور ہمارے ابوجان پانچ سال کے تھے جب ہماری حقیقی دادی کا انتقال ہوا، لیکن ہماری دوسری دادی جو نعمت پور کی رئیس زادی تھیں، وہ مجھ سے غیر معمولی محبت کرتی تھیں۔ حقیقی دادی اگر زندہ ہوتیں تو رشک میں مبتلا ہو جاتیں۔ وہ ہر دو چار مہینوں کے بعد 'بیمار' ہو جاتیں اور ہم کو طلب کرتیں اور فرماتیں کہ ہمارے لیے ہمارا بیٹا جب تک آبِ حیات نہیں لائے گا، ہم اچھے نہیں ہوں گے۔ ہماری بستی میں ایک صاحب تھے سلارا انصاری۔ وہ بابا میاں کے حاضر باشوں میں تھے۔ ان کے گھر میں چار یاری کٹورا (رسول مقبولؐ اور چاروں خلفاے راشدین کے نام کھدے ہوئے تھے، اس لیے اس کو چار یاری کٹورا کہتے تھے) تھا۔ ہم دو چار آدمیوں کے ساتھ جاتے۔ کٹورا مانگتے اور ٹھاکر رگھبر سنگھ جن کو ہم بابا کہتے تھے، ان کے گھر جاتے اور ان سے کہتے ہماری دادی بیمار ہیں، آبِ حیات دیجیے۔ ٹھاکر بابا ہم کو اندر لے جاتے، دلار کرتے، مٹھائی کھلاتے اور کٹورے میں ذرا سا گنگا جل ڈال کر تھوڑا سا پانی ملاتے اور ہم وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چپکے

چپکے دادی کے پاس آتے ۔ دادی دو تین گھونٹ میں پیالہ پی لیتیں اور کہتیں اب میں بالکل اچھی ہوگئی ہوں اور ہم اچکتے پھاندتے چلے آتے ۔ ہماری دادی جو بڑی بی بی کہی جاتیں، کھانے کی بہت شوقین تھیں ۔ ہماری والدہ پھوپھیوں سے اور چچیوں سے اکثر چپکے چپکے کہتیں کہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ گوشت تو بڑی بی بی بھونتے میں کھا لیتیں اور موسم کے کھانوں کا ان کا ایسا سخت انتظام تھا کہ چار بوندیں پڑیں اور عورتوں کو حکم ہوا کہ میدا چھانو ۔ برئیاں (وہ پوری جس میں چنے کی دال بھری جاتی ہے) اور پوریاں اور دوسرے پکوان تیار ہونے لگتے ۔ ہمارے یہاں گوشت کی دوکان صبح سے دس بجے تک ختم ہو جاتی تھی اور پانی برسا ہے تین بجے تو دادی بی بی کٹہل اور اروی کے پتوں اور آلوؤں اور مرچوں کو بیسن میں لپیٹ کر تلواتیں اور پورے خاندان میں تقسیم کراتیں ۔ ان کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا ۔ اس کے بعد مجھ ریٹہ سے برسات کے چونچلے ختم ہو گئے ۔

دادی بی بی کے ذکر میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا ۔ ہم کو قرآن شریف پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب خیر آباد سے بلائے گئے ۔ وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں لڑکوں کو پڑھاتے اور اس کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مسجد سے ہی میرے گھر آجاتے اور مجھ کو قرآن شریف پڑھاتے ۔ ان کی تنخواہ پانچ روپے ماہوار تھی، اور روزانہ ایک پاؤ گوشت ملتا تھا ۔ ایک بوڑھا قصاب صبح پاؤ بھر گوشت مولوی صاحب کی بیوی کو دے جاتا تھا ۔ ایک دن بکر قصاب بیمار ہو گیا، تو اس کا نوجوان بیٹا جو پہلوانی کرتا تھا، ڈنڈ بیٹھک لگاتا تھا اور ایک بھینس کا دودھ پیتا تھا، وہ باپ کے بجائے خود گوشت لے کر آیا ۔ مولوی کی بیوی نے دیکھا اور شاید ملتفت ہو گئیں ۔ اب روزانہ وہی گوشت لانے لگا، اور جب وہ گوشت لے کر آتا تو اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا جاتا ۔ ایک دن ہمارے چچا ہاتھی پر کہیں سے آرہے تھے ۔ جب مولوی صاحب کے مکان کے سامنے

سے گزرے تو یہ لوگ دالان میں بے لباس عشق و محبت میں مصروف تھے۔
ہمارے اختر چچا بہت دھوم دھام کے آدمی تھے۔ چائے وائے پینے کے بعد بکر قصاب کا لڑکا بلایا گیا۔ ابھی اس کی دھنائی ہو رہی تھی کہ مولوی صاحب آ گئے۔ داد و فریاد کرتے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کو معلوم تو پہلے سے تھا لیکن بدنامی کے خوف سے خاموش تھے۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ بکر قصاب کا لڑکا پٹ رہا ہے اور پٹائی کا سبب موصوف کی بیگم صاحبہ ہیں تو وہ خود بھی داد فریاد کرتے آ گئے۔ اختر چچا مرحوم نے ان کی کہانی سنی اور پوچھا کہ تمہاری بیوی کو شک ہوا تمہارے اوپر کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب بولے اللہ رسول کی قسم اسے ذرا بھی شک نہیں ہے۔ شک تو مجھے تھا لیکن میں آپ کے خوف سے چپ تھا۔ جب آپ کو معلوم ہو ہی گیا تو بتا دیا۔ اختر چچا نے مولوی صاحب کو حکم دیا کہ آپ ہرگز ہرگز کسی طرح بھی اظہار نہیں ہونے دیں گے اور اگر معلوم ہو گیا تو آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ دوسرے دن بہت صبح ہاتھی کھنچوایا گیا۔ اختر چچا اس پر بیٹھے اور دوسری دیوار سے ہاتھی لگا دیا۔
حسبِ دستور بکر قصاب کا لڑکا گوشت لے کر آیا۔ دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہوا اور وظیفۂ عشق میں مبتلا ہوا کہ اختر چچا ہاتھی کی پیٹھ سے دیوار پر آئے اور دیوار سے صحن میں اُتر آئے۔ اس نے بھیا کو دیکھا تو اپنی لنگی ہاتھ میں لیتا ہوا دیوار تڑک گیا۔ اختر چچا مرحوم نے محترمہ کو غسل کا حکم دیا اور بعد میں دوسرے احکامات دیے گئے۔ جب ہر طرح سرفراز ہو گئے تو باہری دروازے سے گھر آ گئے۔ اب یہ معمول ہو گیا کہ اختر چچا کا سپاہی گوشت لاتا، دروازہ کھلواتا، گوشت دے کر چلا جاتا اور اختر چچا مرحوم ورودِ مسعود فرماتے۔ ایک دن ہماری دادی بی بی کو فجر کے وقت دوسری منزل پر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہماری ایک دیوار کے کونے سے مولوی صاحب کے گھر کا دروازہ نظر آتا تھا۔ دادی بی بی نے دیکھا کہ اختر چچا مرحوم لپ سے گھر کے اندر داخل ہوئے اور

اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ دادی بی بی طبقۂ اشرافیہ کی ایک گھاگھ خاتون تھیں۔ فوراً نیچے اُتریں، ڈیوڑھی پر آئیں، ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور حکم دیا کہ دستک دو۔ اختر چچا مرحوم، بکر قصاب کے لڑکے کی طرح دیوار سے پھاندنے کی سکت نہیں رکھتے، چنانچہ بڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور دادی بی بی نے دروازے سے اختر چچا کو نکلتے دیکھا۔ حکم ہوا کہ اس کو پکڑ کر لاؤ۔ اختر چچا اندر آئے تو حکم دیا گیا کہ اگر کل تم مولوی کے گھر میں داخل ہوئے تو میں ننگے سر پاؤں گھر سے نکل جاؤں گی۔ ہر چند کہ اختر چچا مرحوم، دادی بی بی کی اولادِ اکبر تھے اور بہت دلارے تھے، لیکن ان کو معلوم تھا کہ دادی بی بی نے جو کچھ کہا ہے وہ کر گزریں گی۔ خیر یہ قصہ ختم ہوا۔

راشد: قاضی صاحب! اسی بنا پر تو میں نے آپ کے بیان کو آر. کے. نارائن سے ملایا تھا۔ میں جس قصباتی زندگی کا ذکر کر رہا تھا، اس کی خصوصیات انھیں واقعات سے اجاگر ہوتی ہیں۔ زمین داری نظام کیا، دوسرے ماحول میں بھی اس نوع کا تضاد دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو لوگ اصول وضوابط کے نفاذ کی بات کرتے ہیں، اکثر و بیشتر وہ خود انھیں توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آپ کی بے باکی اور حق گوئی جہاں زندگی کے دوسرے رویوں میں نسبتاً تلخ انداز سے ظاہر ہوتی ہے، آپ کے بیان میں وہی بے باکی زندگی کے مختلف گوشوں اور زاویوں کو نمایاں کرتی ہے۔ جو قصہ ابھی آپ نے بیان کیا ہے، کیا واقعی وہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا یا اس کی کچھ کڑیاں مزید باقی ہیں۔

قاضی عبدالستار: ہاں بھئی کچھ کڑیاں تو باقی رہ گئی ہیں۔ ہم لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے، ٹیلی گرام ملا کہ اختر چچا کا انتقال ہو گیا۔ ہم فوراً مچھریٹہ آ گئے تو دیکھا دادی بی بی، ہماری پھوپھیاں، ہماری والدہ اور ہماری چچی جان سب رو رہی ہیں اور ان کے ساتھ ایک کافی خوب صورت ادھیڑ عمر کی عورت بھی رو رہی ہے۔ ہم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیوں رو رہی ہے۔ ہم نے اپنے جمعدار رام دین بابا سے پوچھا کہ کیا

چکر ہے۔ وہ مونچھوں کے اندر مسکرائے۔ دوئی ایک دن رک جاؤ، سب بتائے
دیں گے۔ دوسرے دن ہم نے پھر پوچھا۔ وہ ٹالنے لگے۔ جب ہم نے سختی سے
پوچھا تو معلوم ہوا کہ موصوفہ کی حیثیت ایسی رکھیل کی تھی جن سے موقع و محل کے
مطابق، انتہائی خاموشی سے ملاقات کی صورت پیدا کی جاتی اور یہ صورت خود
مولوی صاحب کی مرضی سے پیدا ہوتی۔ اختر چچا مرحوم کے حوالے سے بھی کچھ
باتیں یاد آرہی ہیں۔ اختر چچا مسرکھ کے میلے میں اپنے کیمپ میں بیٹھے تھے کہ
ایک آواز آئی، ''دیوانہ گیا دامن سے لپٹ/کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ''
اختر چچا بے قرار ہو گئے۔ آواز اتنی عمدہ اور ہوس ناک تھی کہ وہ بے چین ہو گئے۔
فوراً حکم ہوا معلوم کرو کہ وہ کون ہے۔ بتلایا گیا کہ ترموہن کی نوٹنکی کی ناچنے والی اور
گانے والی گلاب جان کی آواز ہے۔ اختر چچا اسے دیکھنے کے لیے نوٹنکی جانے لگے۔
جب نوٹنکی اکھڑی تو اختر چچا نے گلاب جان کو مچھریٹہ آنے کی دعوت دی۔
وہ آئی۔ تین دن اس نے قیام کیا اور اختر چچا کی سماعت کو سیراب کرتی رہی۔
آنکھوں پر اپنے رقص سے بہشت کے دروازے کھولتی رہی۔ یہ گلاب جان کی
نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ہم نے مچھریٹہ میں یہ گانا سنا۔ اس کے بعد ہم بھی نوٹنکی
دیکھنے جانے لگے اور ہم نے گلاب جان کا رقص دیکھا اور گانا سنا۔

راشد: قاضی صاحب! انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول
کرتا ہے۔ زمین دارانہ ماحول میں جہاں لڑکیوں اور عورتوں کی حصولیابی کوئی
بڑا مسئلہ نہیں ہوتی، اس ماحول میں اپنے آپ کو بچالینا واقعی بہت مشکل ہے۔
شرافت اور تہذیب کا لحاظ رکھنے کی بات اپنی جگہ، لیکن بعض چیزیں لاشعوری
طور پر بھی انسان کے مزاج اور نفسیات کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ زمین دارانہ
ماحول میں تجربہ کار خواتین کی جانب سے سختی بھی برتی جاتی ہے اور بہت سنجیدگی
کے ساتھ تمام حرکات وسکنات پر نظر رکھی جاتی ہے، اس کے باوجود کچھ نہ کچھ
واقعات ایسے ضرور رونما ہو جاتے ہیں جنھیں روک پانا خود انسان کے لیے ممکن

نہیں ہوتا۔ جوشؔ نے اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ اعتراض کرنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں کہ زیادہ تر معاشقے فرضی ہیں اور جوشؔ کے تخیل کا نتیجہ ہیں، لیکن اگر زمین دارانہ ماحول کی باریکیوں کا جسے علم ہے، وہ ان واقعات کو فرضی تصور نہیں کرسکتا۔ آپ چوں کہ اسی ماحول کے پروردہ ہیں، لہٰذا آپ زیادہ بہتر طریقے سے ان تمام باتوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ آپ کی بے باکی اور حق گوئی کے پیشِ نظر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر آپ نے بھی اس ماحول کا کچھ اثر قبول کیا ہوگا تو اس واقعے سے ضرور روشناس کرائیں گے۔

قاضی عبدالستار: آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ جولوگ جوشؔ کے اٹھارہ معاشقوں کو فرضی تصور کرتے ہیں، انھیں اس ماحول کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔ جوشؔ جس ماحول کے پروردہ تھے، اس کے نشیب وفراز سے اگر کوئی واقف ہے تو وہ اس نوع کا اعتراض نہیں کرے گا۔ جب میرے جیسا آدمی جو حد درجہ شرمیلا ہے اور کسی چیز کی پہل کرنے میں ہمیشہ پیچھے رہتا ہے، وہ بے حد سخت نگرانی کے باوجود اس ماحول سے نہیں بچ پایا تو جوشؔ جو صنفِ نازک کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، وہ اگر ان اٹھارہ معاشقوں سے دوچار ہوئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اودھ کے زمین داروں کے گھروں کی طرح ہمارے گھروں میں بھی دس بیس عورتیں ہر وقت رہتی تھیں۔ ان کی بیٹیاں اور بہوئیں، گاؤں سے آنے والی، بے گار میں کام کرنے والی جوان اور حسین وجمیل عورتیں بھی آیا جایا کرتی تھیں، لیکن طبقۂ اشرافیہ کی خواتین ان عورتوں سے اپنے بچوں کو اس طرح محفوظ رکھتیں جیسے مرغی اپنے چوزوں کو بلی سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں اکلوتا بیٹا تھا اور اماں میری خواہش کو پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں، لیکن مجھے براہِ راست کسی کو پکارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کسی سے ہمارا کوئی کام ہے یا ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اپنی نوکرانی سے

کہیں گے، وہ اس عورت یا لڑکی سے بات کرے گی، نہ صرف یہ بلکہ دھوبن، ناون، جمعدارن تک سے بھی تخاطب کی اجازت نہیں تھی۔ دس بارہ سال کی عمر میں سمجھادیا جاتا کہ اپنے دوستوں کی بہنوں کو غور سے مت دیکھو۔ اپنے استادوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو اپنی ماں اور بہن سمجھو۔ یہ سب کچھ جیسے خون میں شامل ہوجاتا۔ آج اس عمر میں بھی میں اجنبی عورتوں سے اس طرح نہیں مل پاتا جس طرح آج کے لوگ عام طور پر ملتے ہیں۔ ان خواتین کی نگاہیں اس قدر رسدھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس قدر سچی اور کھری حقیقتوں کی کسوٹی پر کسی ہوتیں کہ کوئی چور حرکت ان سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ وہ چال ڈھال، ہاؤ بھاؤ، بات چیت، نگاہوں تک کی زبان پڑھ لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خواتین ایسی نہ ہوتیں تو زمین داروں کے گھر چکلے ہوجاتے اور جن زمین داروں کے گھر میں بیبیاں الہڑ ہوتیں، ناسمجھ ہوتیں، یعنی کڑھی ہوئی نہیں ہوتیں، ان کے گھر رُسوا اور بدنام ہوجاتے۔ ہماری نیکی اور شرافت کی جو کہانیاں مچھریٹہ میں مشہور ہیں، وہ سب ہماری ماں کی تربیت کی دین ہیں۔ کتنی لڑکیوں سے بات کرنے کو جی چاہا کرتا، لیکن مسکرا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

ہم شاید بی اے میں تھے کہ ہماری ممانی جان یعنی بیگم قاضی جمیل الدین مچھریٹہ تشریف لائیں اور فرمایا کہ مجھ کو ایک فقیر نے ایک وظیفہ بتایا تھا کہ اگر میں تہجد کی نماز پڑھ کر اور نیا لباس پہن کر وظیفہ پڑھوں تو میں خواب میں جس کو چاہے دیکھ لوں۔ میں نے وہ وظیفہ پڑھا اور شفیع بھائی کو دیکھنے کی خواہش کی۔ شفیع احمد قدوائی، رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی تھے اور دہرہ دون کے ایڈمنسٹریٹر تھے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں قتل ہوئے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں کیوں تنگ کرتی ہو، میں بالکل ٹھیک ہوں اور آج کل تمہاری نند کے قصبے مچھریٹہ میں تعینات ہوں تو مجھے مچھریٹہ دیکھنے کی خواہش ہوئی اور میں آ گئی۔ ہمارے ساتھ اماں بھی حیرت زدہ ہوگئیں۔ گرمیوں کا زمانہ

تھا۔ صحن میں چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ بستر لگائے گئے تھے، مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھالیا گیا۔ تھوڑی دیر بات چیت کرکے سب اپنے اپنے بستر پر پہنچ گئے۔ میرا پلنگ اماں اور ممانی جان کے پلنگوں سے فاصلے پر تھا۔ یہ لوگ باتیں کرتی رہیں۔ ایک بار اماں نے پوچھا کہ کیا بھیا سوگیا۔ ہم خاموش رہے، ممانی جان نے کہا شکار سے آیا ہے، سوگیا ہوگا۔ اماں بولیں، بھابھی جان آپ تو جانتی ہیں کہ چھبّن کے ابو جان مجھے کہاں کہاں لیے پھرے، دلّی، بمبئی، کلکتہ، لاہور، مدراس، میسور، کہاں کہاں لے گئے مجھے۔ کیسی کیسی عورتیں دیکھیں، گوری عورتوں میں رانی آنٹ سے زیادہ خوب میں نے نہیں دیکھی اور سانولی عورتوں میں کڑ ھیلے تیلی کی دلہن سے زیادہ خوب صورت عورت نہیں دیکھی۔ میں یہ بات سن کر دنگ رہ گیا کہ یہ کون عورت ہے جس کو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ پھر وہ لوگ اور باتیں کرتی رہیں، ہم سو گئے۔

دوسرے دن ہم نے اپنے دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا تو رام لعل بقال نے مسکرا کر کہا، دکھلا دیں گے آپ کو۔ ایک دن کے بعد ممانی جان اور اماں گنج مراد آباد کے لیے سوار ہوگئیں۔ اب ہم گھر میں اکیلے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے سب عورتوں کی چھٹی کردی، اور کہا کہ ہم آنگن میں کرکٹ کھیلیں گے، تم لوگ جاؤ اور اپنے ایک سپاہی کو ہم نے بھیجا کہ کڑ ھیلے کی دلہن کے پاس جاؤ اور کہو کہ بی بی نے تیل منگایا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سارے لڑکے اوپر تھے۔ ہم دالان میں آرام کرسی پر بیٹھے انتظار کررہے تھے۔ ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ کھلا اور کڑ ھیلے کی دلہن، سیاہ لہنگا، سیاہ کرتی اور سیاہ دوپٹہ اوڑھے، سر پر میٹروا اور میٹروے پر تیل کا، مٹی کا برتن رکھے چھمک چھمک کرتی آئی۔ دالان میں پہنچ کر اس نے تیل کا برتن اُتارا۔ مجھ کو سلام کیا اور کہا بی بی صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا وہ تو کہیں گئی ہیں۔ تم تیل تول دو۔ وہ دوسرے دالان کے کونے میں رکھے ترازو کو اُٹھانے گئی، مگر وہاں سے ترازو اُٹھا کر ہم نے پہلے

ہی کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے کہا یہاں ترازو تھا۔ میں نے کہا وہ کمرے میں رکھ دیا گیا ہے۔ جیسے ہی وہ گئی، ہم پیچھے پیچھے کمرے میں گئے اور اس کو کمر سے پکڑ لیا۔ وہ ہائیں بھیا، ہائیں ہائیں کرتی رہی۔ وہ کسمساتی رہی اور مسکراتی رہی، ہم اسے چومتے رہے، اور یہ ہماری عیاشی کی انتہا تھی۔ اس کے جسم کا معائنہ کیا تو وہ نہایت خوب صورت تھی۔ جب وہ جانے لگی تو ڈیوڑھی کے دروازے پر پہنچ کر پوچھا کہ بھیا اب کب بلئیو۔ ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتے۔ ہم مسلسل سوچتے رہے تھے کہ اگر اس نے اماں سے کہہ دیا تو کیا حشر ہوگا، مگر ہم اب اس کے سوال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ ہمارے دوست احباب آ گئے۔ تین دن اماں نہیں آئیں۔ تینوں دن کڑھیلے کی دلہن آتی رہی اور ہم ان کے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے رہے۔ وہ سمجھتی تو کیا رہی ہوگی، لیکن خوش ہوتی رہی اور ہم ہر بار اس کو بس پانچ سیر سرسوں دیتے رہے۔ کالج میں پڑھنے والا طالب علم بوس و کنار سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ اماں کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا۔ جب وہ چلی جاتی تو ہم اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے، اور فیصلہ کرتے کہ اب کی جب آئے گی تو ہم حدود سے گزر جائیں گے، لیکن جب وہ آتی تو اماں کا خوف سر پر مسلط ہو جاتا اور ہم اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

اسی کڑھیلے کی دلہن کو ایک تھانے دار نے دیکھ لیا۔ عاشق ہو گیا۔ جھوٹے مقدمے میں کڑھیلے کو پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ اپنی دلہن کو بلاؤ۔ خیر وہ بلائی گئی لیکن جب دست درازی کی نوبت آئی تو وہ عورت اور اس کا شوہر چیخنے چلانے لگے۔ وہ عورت ہمارے ابوجان کے پاس آئی اور کڑھیلے کے ساتھ وہ بھی رونے لگی کہ ہماری مریادا پر حملہ کیا گیا۔ کیا ہم غریبوں کی عزت نہیں ہوتی۔ ابوجان نے اپنے مختار کو بھیجا کہ تھانے دار زاہد علی کو سمجھا دیں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہوگی۔ مختار اس وقت پہنچے جب وہ اپنی ناکامی کو شراب میں ڈبو رہا تھا۔ بگڑ کر بولا کہ قاضی صاحب سے کہہ دیجیے کہ میں سندنا تھانے کا انچارج

ہوں، ہتھکڑی لگا دوں گا۔ ابو جان نے یہ جملہ سنا تو ان کے آگ لگ گئی۔ یہ چار بجے شام کا واقعہ تھا۔ ابو جان نے گاؤں میں خبر بھیجی، اور سوڈیڑھ سو آدمی رات میں آ گئے۔

ہمارے قصبے میں ایک محلہ بروارہ (نٹوں کی طرح ایک قوم) کا تھا۔ اس میں ایک شخص تھا جس کا نام کنہیا تھا۔ اس کے پاس ایک گوہ تھی جس کے سہارے وہ کسی بھی درخت، کسی بھی عمارت پر چڑھ جاتا تھا۔ بارہ بجے رات کو ابو جان نے اسے بلایا اور کہا کہ تم میرا ایک کام کر سکتے ہو۔ اس نے کہا کہ حکم دیجیے۔ جاؤ اور کسی طرح تھانے دار کا پستول لے آؤ۔ تھانے دار پرائمری اسکول میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی۔ اسکول کے قریب قریب جامن اور آم کے درخت تھے۔ وہ ان درختوں کے سہارے دیوار کے نیچے پہنچا۔ گوہ کو اوپر پھینکا اور رسّی کے سہارے چھت پر پہنچ گیا۔ کچی چھت کو آہستہ آہستہ کاٹا تاکہ مٹی زور سے نہ گرے۔ تھانے دار تو دو بجے سے پی رہا تھا۔ تین بجے رات کو اس کے فرشتے بھی پیے پڑے تھے۔ کنہیا نیچے گیا۔ ریوالور البٹی میں رکھا، دوسری طرف ان کا پرس رکھا اور اسی رسّی کے سہارے چھت پر پہنچا۔ چھت سے نیچے اُترا، اور فجر کے وقت جب ابو جان بیٹھے حقہ پی رہے تھے، پستول لا کر دے دیا۔ پرس کھولا گیا تو اس میں گیارہ سو روپے اور کچھ محبت نامے تھے کسی عورت کے لیے۔ ابو جان نے روپیہ تو کنہیا کو دے دیا اور ریوالور اپنے پاس رکھا۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔

داروغہ جی صبح آٹھ نو بجے سو کر اُٹھے تو سرہانہ صاف تھا۔ نہ ریوالور تھا، نہ پرس تھا۔ ایک کہرام مچ گیا۔ پرانے کانسٹبل نے ان کو بتایا کہ ہم نے آپ کو سمجھایا تھا کہ قاضی صاحب کے معاملے میں دخل مت دیجیے۔ ان کی طاقت کا اندازہ آپ کو نہیں۔ اب جائیے ہاتھ پیر جوڑیے تو پستول مل سکتا ہے۔ خیر وہ آئے۔ مختار نے کہا کہ ابو جان سیتاپور گئے ہیں۔ اسے ڈر ہوا کہ سیتاپور جا کر یہ پستول کہیں ایس پی کو نہ دے دیں۔ اس نے بستی کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ

کیا کہ کیا کروں۔ انھوں نے کہا کہ آپ بیہٹ کے ٹھاکر ہنومان سنگھ کے پاس جائیے۔ ان کے اس گھر سے بہت پرانے مراسم ہیں۔ اگر وہ چاہیں گے تو بڑے بھیا خود پستول لے کر تھانے پہنچ جائیں گے۔ تھانے دار بیہٹ گیا اور پیروں پر گر پڑا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میری نوکری بچا لیجیے۔ ٹھاکر ہاتھی پر چڑھ کر مچھریٹہ آئے اور آدمی سے کہا بڑے بھیا کو بلاؤ۔ دو بجے دن کا وقت تھا۔ ابوجان کھانا کھا کر لیٹ گئے تھے۔ ٹھاکر نے پہلے تو پوری کہانی سنی۔ کہا بھیا آپ نے ان کو سزا تو دے دی۔ اب ہمارے کہنے سے معاف کر دیجیے۔ اس کی پستول دے دیجیے۔ ابوجان نے کہا کہ ٹھاکر صاحب اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ ٹھاکر صاحب نے اپنا سینہ ٹھوک کر کہا کہ وہ ہماری ذمے داری ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ مچھریٹہ سے تین کوس کے فاصلے پر دھن دھاری کے جنگل میں ایک اندھے کنویں میں پستول پھینک دیا ہے۔ چوکیدار کو اطلاع دی گئی کہ وہاں پڑا ہوا ہے، داروغہ جی واپس لے آئیں۔ ابوجان نے ان کے خطوط بھی واپس کر دیے۔ داروغہ جی نے دوسرے دن ہارٹ اٹیک کا ڈرامہ کیا اور افسر دوم کو تھانے کا چارج دیا اور اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہی طے ہوا تھا۔ پھر کسی کی ہمت تھی کہ کڑ ھیلے کی دلہن کو آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے، لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس واقعے سے صرف ایک برس بعد اس کے سانپ نے کاٹ لیا اور وہ مر گئی۔ کتنی ہی عورتیں میں نے دیکھی ہیں، لیکن آج تک سانولے رنگ کی کوئی عورت اتنی خوب صورت نہیں دیکھی۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کی دلچسپ باتوں کے ذریعے مچھریٹہ کا ذکر تو خوب ہوا، لیکن سیتاپور کا ذکر ہر جگہ سرسری طور پر ہوتا رہا، جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سیتاپور میں آپ نے نہ صرف ابتدائی درجوں کی تعلیم حاصل کی بلکہ شاعری سے ذوق کے معاملات بھی وہیں پروان چڑھے۔ آپ کا بنیادی میدان فکشن ہے، لیکن اپنے ابتدائی ادبی سفر میں دوسروں کی طرح آپ نے بھی شاعری سے

اچھی خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ نہ صرف مقامی مشاعروں میں شرکت کر کے اپنی موجودگی کا احساس کرایا بلکہ ایک باقاعدہ استاد کی شاگردی اختیار کی اور اپنی شعوری کوششوں کے ذریعے شعری صلاحیتوں کو نکھارنے کی کوشش بھی کی۔ آج آپ کی شناخت فکشن کے ایک منجھے ہوئے فن کار کی حیثیت سے قائم ہو چکی ہے تو اس تناظر میں آپ کے شعری پس منظر سے آگاہی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ تمام باتیں آپ تفصیل سے بتائیں تا کہ یہ پہلو بھی سامنے آسکے کہ فکشن کا معتبر فن کار، شاعری کو کس زاویے سے دیکھتا ہے؟

قاضی عبدالستار: ہاں بھئی آپ نے صحیح نشانہ ہی کی۔ سیتاپور کے بجائے مچھریٹہ کا ہی بیان غالب رہا، لیکن سیتاپور کی یادیں بھی میرے ذہن میں اسی تازگی کے ساتھ قائم ہیں۔ سیتاپور سے بھی مجھے خاص اُنسیت رہی کیوں کہ بچپن کا اچھا خاصا وقت میں نے سیتاپور میں بھی گزارا۔ سیتاپور میں ہمارا داخلہ تھرڈ کلاس میں کرا دیا گیا۔ اس وقت بابا میاں حیات سے تھے۔ بابا میاں نے داخلہ کرانے کا حکم تو دے دیا، لیکن اس شرط پر کہ بھیا ہر سنیچر کو آئیں گے اور دوشنبے کو جائیں گے۔ سیتاپور میں ہمارے دو مکان تھے۔ بڑے مکان میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام ہوا۔ ایک خانساماں اور ایک سپاہی تعینات ہوئے۔ ابھی داخلہ ہی ہوا تھا کہ ہمارے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین ایڈووکیٹ سیتاپور، مچھریٹہ آئے، اور ہماری والدہ سے اور قاضی صاحب دونوں سے کہا کہ مکان عالم نگر میں ہے۔ عالم نگر طوائفوں کا محلّہ ہے اور بھیا بہت ہی شریر ہے، بگڑنے کے پورے امکانات ہیں۔ اس لیے اس کو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ اس وقت ہمارے ماموں صاحب اپنی پھوپھی کے یہاں وارث منزل میں رہتے تھے۔ ہم بھی وہیں بھیج دیے گئے اور ہماری پڑھائی شروع ہوگئی۔ ہمارے ایک ٹیوٹر رکھے گئے۔ ان کا نام تھا ماسٹر گڈین، جو کرسچین تھے۔ ایک جانگھیہ اور کرتی مارکین کی پہنتے تھے۔ صبح سے شام تک چائے پیتے رہتے تھے، اور بالوں میں المونیم کی کسی چیز سے

لہریں بناتے تھے۔ وہ پورا مکتب تھا۔ مختلف درجوں کے طالب علم ٹاٹ پر بیٹھے ملتے تھے۔ تیسرے درجے سے دسویں درجے تک کے طالب علم ان سے پڑھنے آتے تھے۔ ہم خدا کے فضل سے دو بار فیل ہوئے۔ ایک بار چھٹے میں، ایک بار آٹھویں میں۔ چھٹے میں بیمار ہو گئے۔ ٹائی فائڈ میں امتحان نہیں دے پائے اور آٹھویں میں بھی بیمار ہو گئے تھے، اور ایسا بیمار ہوئے کہ خبر اُڑ گئی کہ ہم کو خدانخواستہ ٹی بی ہے۔ ہمارے ایک عزیز جو بدقسمتی سے ہمارے گھر کے حکیم بھی تھے، انھوں نے فتویٰ دیا کہ مجھے پیدائشی ٹی بی ہے۔

خیر ہم لکھنؤ بھیجے گئے۔ ڈاکٹر عبدالحمید کا علاج ہوا۔ انھوں نے میری روتی ہوئی ماں سے کہا کہ بیگم صاحبہ میں ان دو انگلیوں کو سینے پر جہاں رکھ دیتا ہوں، اسی طرح دیکھ لیتا ہوں جس طرح آپ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ آپ کے بیٹے کو ہرگز ٹی بی نہیں ہے۔ اس کی حرارتِ غریضی نارمل سے زیادہ ہے۔ یہ جملے مجھے آج تک یاد ہیں اور ہم کو اسی دن سے صحت ہونے لگی۔

ہم نے پوری طالب علمی کا زمانہ ہاکی کھیلنے اور غزل کہنے میں گزارا۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہم آٹھویں میں تھے، ہم نے ایک افسانہ لکھا۔ اس کا نام تھا ''اندھا''۔ لکھنؤ سے ایک رسالہ نکلتا تھا ''جواب''۔ اس کے ایڈیٹر استاد شارب لکھنوی تھے۔ ہمارے استاد شیدا نبی نگری صاحب (جن کا ذکر تفصیل سے ابھی کروں گا) نے حکم دیا کہ میں افسانہ ان کو بھیج دوں۔ افسانہ چھپا۔ آدھے صفحے کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا۔ شیدا نبی نگری صاحب سیتاپور کے ایک پرائیویٹ کالج، آر. ایم. کالج میں وائس پرنسپل تھے۔ ان کا تعلق نبی نگر راج سے تھا۔ بہت سے لوگ ان کو راجہ بابو بھی کہتے تھے۔ نبی نگر سے روز ان کے لیے گوشت اور سبزیاں آتی تھیں۔ ان کی تنخواہ اس زمانے میں دو سو روپیہ ماہوار تھی جو ساری کی ساری شراب کی خدمت میں صَرف ہوتی تھی۔ سیتاپور میں ہم چار لوگ تھے۔ کوثر بسوانی، ابوالحسن نغمی اور فضل حق اختر۔ ہم چاروں کبھی کبھی،

اور ہم تقریباً دوسرے تیسرے دن استاد کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ استاد سلام کے جواب میں پوچھتے، غزل کہی؟ اگر ہم کہتے کہ نہیں تو ڈانٹے جاتے، اور اگر ہم کہہ دیتے کہ کہی ہے تو حکم ہوتا فوراً سناؤ۔ اب وہ اپنی مسہری پر نیم دراز ہیں، الوان (بڑی چادر) ان کے پیروں پر پڑا ہے۔ پہلو کی میز پر شراب کی بوتل اور ان کا گلاس سجا ہوا ہے۔ سگریٹ پی رہے ہیں، گھونٹ لے رہے ہیں اور اصلاح دے رہے ہیں۔ ہماری غزل دس منٹ کے اندر ان کی غزل ہو جاتی تھی۔ پھر حکم ہوتا سناؤ۔ ہم سناتے تو استاد کے ساتھ جو لوگ وہاں حاضر ہوتے، وہ بھی واہ واہ کرتے۔

اب ہم دسویں میں آگئے کہ ایک دن ترین پور میں وارث منزل کے قریب راجہ بابو سروپ نرائن کی کوٹھی میں مشاعرہ تھا۔ استاد کے ساتھ ہم بھی گئے۔ اتفاق سے ہم کو وارث منزل کے نوکروں میں سے کسی نے وہاں جاتے دیکھ لیا اور مچھریٹہ سے جو آدمی آیا والدہ کا خط لے کر، اس کو بتلا دیا کہ بھیا فلاں جگہ ہیں۔ وہ کم بخت دندناتا ہوا پہنچ گیا۔ اس وقت ہم غزل سرائی فرما رہے تھے اور ترنم سے فرما رہے تھے۔ اس کم بخت نے دیکھا۔ چپ چاپ چلا آیا۔ مچھریٹہ جا کر میری والدہ سے کہا کہ بھیا گا وے بجا وے لگے۔ اماں دوسرے ہی دن پالکی پر سوار ہوئیں اور سیتا پور میں نازل۔ پہلے ہماری شکایت اپنے بھائی ماموں صاحب سے کی، پھر ہم کو سینکڑوں گالیاں دیں۔ ماموں صاحب تو ماشاء اللہ چھ فٹ کے تھے۔ تندرست ہاتھ سے جھانپڑ مارا تو ہم لڑھک گئے۔ حکم ہوا کہ خبردار جو اَب مشاعرہ میں گیا۔ ہم دوسرے دن داد فریاد کرتے ہوئے استاد کے پاس حاضر ہوئے۔ استاد نے گاڑی منگائی، ہم کو بھی سوار کرایا اور ترین پور آگئے۔ ماموں صاحب سے کہا کہ آپ اس کے ماموں ہیں، میں اس کا بابا ہوں۔ اس لیے کہ قاضی فیاض علی صاحب جو نبی نگر راج کے منیجر تھے، ان سے خوردی اور بزرگی کے مراسم تھے میرے۔ آپ کے بھانجے کا مستقبل مجھے بھی

آپ ہی کی طرح عزیز ہے۔ وہ شعر کہتا ہے اور ہاکی کھیلتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ کسی برے فعل میں نہیں ہے۔ ماموں صاحب خاموش ہو گئے۔ یعنی ہم کو شعر کہنے کی خاموش اجازت میسر آ گئی۔

اب مشاعروں میں ہم چار لوگ جاتے۔ استاد نے ہمارا تخلص صہبا مچھریٹوی رکھ دیا تھا۔ راشد صاحب کیا سمجھتے ہیں آپ کہ صرف آپ ہی شاعر ہیں۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ ہم لکھنؤ آ گئے۔ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور صہبا کے تخلص سے آزاد ہو گئے۔ نظمیں کہنے لگے اور یونیورسٹی میں باقر مہدی کے ساتھ میرا نام بھی شاعر کی حیثیت سے لیا جانے لگا۔ استاد کے بارے میں ایک بات سن لیں تو آپ دنگ رہ جائیں۔ دنیا کا کوئی ایسا نشہ نہیں تھا جو استاد کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہو۔ ہم لوگ انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں تھے کہ استاد کے کاربنکل پھوڑا (پیٹھ میں نکلنے والا پھوڑا جسے سرطان کہا جاتا ہے) نکلا۔ استاد سیتاپور کے گورنمنٹ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ انگریز سرجن نے فوراً آپریشن کا حکم دیا۔ ایک انگریز نرس نے استاد کو کلوروفارم سنگھانے کی کوشش کی۔ استاد نے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کلوروفارم ہے۔ آپ سونگھ لیجیے۔ استاد اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اس کے ہاتھ سے شیشی چھین لی اور پورا کلوروفارم پی گئے۔ اسپتال میں ہنگامہ ہو گیا۔ انگریز سرجن بھاگا ہوا آیا اور کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ استاد نے کہا ڈاکٹر صاحب اگر کالا ناگ مجھے کاٹ لے تو خدا رسول کی قسم مر جائے، اس لیے کہ میرے خون میں الحمدللہ زہر ہی زہر بھرا ہوا ہے۔ اب آپ بتائیے میں کس کروٹ لیٹ جاؤں۔ وہ حیرت زدہ کھڑا ہو گیا۔ اس لیے کہ استاد پر کلوروفارم کا کوئی اثر نہیں تھا۔ پورے ہوش و حواس کے عالم میں استاد کا آپریشن ہوا، لیکن ایک چیخ تک برآمد نہیں ہوئی۔ یہ تھے ہمارے استاد راجہ بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری۔

۱۹۵۲ء میں ہمارے والد کو گئے ہوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا اور ہم پر ان کی جدائی کا شدید اثر تھا۔ ہم استاد کو سلام کرنے گئے۔ استاد نے ہم کو دیکھا اور

فرمایا میں تیرے دکھ سے واقف ہوں۔ دیکھ تیرا باپ نہ شرابی ہے، نہ جواری ہے، نہ کسی طوائف کا مرید ہے۔ وہ شکاری ہے، اس کے پڑاؤ پڑتے رہتے ہیں۔ وہ سیاح ہے، ملکوں ملکوں گھومتا رہتا ہے۔ اس نے تجھے بھلا دیا ہے تو بھی اسے بھلا دے۔ ان کی باتوں کا اتنا اثر ہوا مجھ پر کہ واقعی میرا دکھ کم ہو گیا جیسے کسی نے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ رات ہی میں میں نے ایک نظم کہی۔ دوسرے دن استاد کو سنائی۔ استاد خاموش بیٹھے رہے۔ وہ نظم آپ بھی سن لیجیے۔ نظم کا عنوان ہے:

''اپنے استاد معظم و محتشم راجہ بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری کے حضور میں۔

گرچرن لال تھا نام اس کا تخلص شیدا

سانولا رنگ، چھریرا سا بدن

اور قد و قامت ایسی

جس طرح صحن چمن میں شمشاد

اس کی پیشانی پہ شفقت کی شرافت کی چمک

کالے ابرو وہ کھڑی ناک وہ ہلکے رخسار

اس کے ہونٹوں پہ بجی رہتی تھی ہلکی سی تبسم کی لکیر

جامہ زیب ہم نے بہت دیکھے مگر اس کی وہ جامہ زیبی

شیروانی میں وہ یوں سجتا تھا کہ دیکھا کیجیے

چوڑی دار اس پہ یوں پھبتا تھا کہ بس کیا کہیے

بولتا تھا کہ گہر رول رہا ہو جیسے

جب وہ ہنستا تھا تو ہنس پڑتے تھے کیسر تختے

جب وہ روتا تھا تو رو دیتے تھے ساون بھادوں

اس کی خدمت سے مشرف بھی رہی حضرتِ مینا اکثر

مگر آداب کی پابند کہ دربار میں سلطاں کے کنیز

اس کی بیوی تھی، نہ بچے، نہ کوئی خاص عزیز

عمر بھر کی تھی کمائی وہ فقط چند ہی دوست
چند شاگرد جو پروانوں کے مانند نثار
اس قدر غور سے سنتا تھا وہ اشعار مرے
آسمانوں سے صدا دیتا ہو جیسے جبریل
میرے اشعار وہ مٹی کے کھلونے ٹوٹے
کیمیا رشک توجہ سے جو ہو جاتے تھے سونا چاندی
ایک دن اس نے اداس ہم کو جو دیکھا تو کہا
اتنی سی عمر میں ماتھے پہ لکیروں کا ہجوم؟
کون سی آگ ہے سینے میں کہ چہروں پہ دھواں اڑتا ہے
تیری آنکھوں میں تو جلتے ہیں، جدائی کے چراغ
میرے بیٹے، میرے صہبا مرے شاگرد عزیز
آج میں تجھ سے جو کہتا ہوں اسے غور سے سن
باپ تیرا ہے رئیس ابنِ رئیس
نہ شرابی، نہ جواری، نہ طوائف کا مرید
اس کو محبوب چکوروں کا کبھی اور کبھی شیروں کا شکار
کبھی منڈی، کبھی میسور، کبھی سندر بن
مختلف سمتوں میں پڑتے ہیں پڑاؤ اس کے
اور سیاح وہ ایسا کہ پھرا کرتا ہے ملکوں ملکوں
کبھی آتا نہیں بہتے ہوئے دریا کو قرار
کس نے پہنائی صبا کو زنجیر
کون کر سکتا ہے خوشبو کو اسیر
میرے بیٹے مرے شاگردِ عزیز
وہ اگر بھول گیا تجھ کو بھلا دے تو بھی

آج بتلاتا ہوں میں تجھ کو ترے غم کی حقیقت کیا ہے
جیسے گر جائے ترے کوٹ کے کالر کا گلاب
کہیں کھو جائے تری پاؤں کی جوتی کا ستارا جیسے
کچھ نہیں اس کے سوا، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ سونے کا قلم
تجھ کو شہزادۂ اقلیم قلم ہونا ہے
کل تجھے بادشہِ ملکِ ادب ہونا ہے
میرے شاگرد مری جان عزیز
وہ تجھے بھول چکا اس کو بھلا دے تو بھی
اس کے ہر نقشِ محبت کو مٹا دے تو بھی
آج ہر رسم کو اُلفت کی اُٹھا دے تو بھی
وہ تجھے بھول چکا اس کو بھلا دے تو بھی

راشد: واہ قاضی صاحب۔ واہ۔ سبحان اللہ۔ کیا کہنے۔ میں تو آپ کی نظم سننے میں محو ہو گیا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں آپ کی منظوم داستانِ حیات سن رہا ہوں۔ نظم تو آپ کے استاد محترم کے حوالے سے ہے لیکن اس میں آپ کی زندگی کا کرب بھی پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ نظم میں آپ نے ڈرامائی انداز بھی اختیار کیا ہے، ابتدا میں استاد کے تئیں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور پھر بعد میں استاد کے مشفقانہ خیالات کو پُر اثر انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ نے یہ نظم ۱۹۵۳ء میں لکھی تھی، یعنی آج سے ۶۱ سال قبل، جب آپ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ایک ۲۱ سال کے نوجوان کے یہ جذبات خاصے پُر اثر سمجھے جائیں گے۔ استاد کی زبانی آپ نے جن دعائیہ کلمات کا ذکر کیا ہے وہ آج حرف بہ حرف درست ثابت ہو گئے ہیں۔ گویا کہ استاد نے اپنی پارکھی نگاہوں سے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا چہیتا شاگرد صہبا مجھر یوی

ایک دن نہ صرف شہزادۂ اقلیمِ قلم ہوگا بلکہ ملکِ ادب کا بادشاہ بھی قرار پائے گا۔ آپ کا اسلوب صرف آپ سے مخصوص ہے۔ اس کا بلاشبہ کوئی ثانی نہیں، اس اسلوب کی نقل نہیں کی جاسکتی۔ اگر آپ نے شاعری کا سلسلہ ترک نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ فکشن میں جو مقام آپ نے حاصل کیا ہے، ویسا ہی مقام آپ کو شاعری میں بھی حاصل ہوتا۔ شاعری میں اتنی دلچسپی کے باوجود آپ نے یہ سلسلہ آخر کیوں ترک کردیا۔ آپ کے استاد نے جب قدم قدم پر آپ کی مدافعت کی تو کیا انھوں نے آپ کو اس خیال کو ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔

قاضی عبدالستار: راشد صاحب، میں نے شاعری اس لیے ترک کی مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میں جو کچھ اور جس طرح کہنا چاہتا ہوں، شاعری میں اس کا اظہار بہتر طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ فکشن میں بھی وہ سب کچھ جو میں کہنا چاہتا ہوں اور جس طرح کہنا چاہتا ہوں، نہیں کہہ سکا، لیکن شاعری کے مقابلے میرے دل کی تسکین ہوئی۔ ہاں تو میں نظم سنا رہا تھا آپ کو۔ اس نظم کو سن کر ہمارے استاد آبدیدہ ہوگئے۔ سیتاپور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ہم نے استاد کے ساتھ شرکت کی اور استاد نے بھرے مشاعرے میں حکم دیا کہ وہ نظم سناؤ جو تم نے اپنے باپ پر لکھی ہے۔ پورا مشاعرہ متوجہ ہوگیا۔ استاد خود صدارت کررہے تھے۔ ملا صاحب جو نواب کہے جاتے تھے اور شاعر بھی تھے اور مشاعروں کے مہتمم بھی تھے ان سے فرمایا، نواب صاحب یہ نظم پابند نظم نہیں ہے، لیکن اس میں موسیقی ہے۔ اس لیے پڑھوا رہا ہوں ورنہ پھاڑ کر پھینک دیتا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو نواب صاحب نے فرمایا۔ شیدا صاحب یہ پوری نظم آپ پر ہی ہے۔ باپ کا ذکر بھی آپ کے وسیلے سے آیا ہے۔ دو تین مشاعروں میں وہ نظم ہم سے پڑھوائی گئی۔ ہم پڑھتے ہوئے رنجور ہوجایا کرتے تھے۔ یہ واحد نظم ہے جو ۱۹۵۳ء کی ہے۔ جب ہم ایک ناول کے مصنف ہوچکے تھے اور ہماری بہت سی نظمیں شاہراہ، ادبِ لطیف وغیرہ میں

چھپ چکی تھیں۔ اب کوئی نظم اس کے سوا میرے پاس موجود نہیں ہے۔ ایک عاشقانہ نظم کے چند مصرعے بھی سن لیجیے۔

راشد: ارشاد عالی۔

قاضی عبدالستار:

سونا بہہ جائے تری زلف کا چاندی بن کر
چاند سا چہرہ مرے دل کی کہانی ہو جائے
اجنبی دیس کو رو دھو کے سدھارو تم بھی
میں بھی اب شہر نگاراں سے چلا جاؤں گا

راشد: سبحان اللہ! فقط چار مصرعوں کے ذریعے آپ نے ایک کہانی بیان کر دی اور وہ بھی مؤثر انداز میں۔ محبت، وصل سے ہم کنار نہ ہو پائی اور جدائی کے کرب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان چار مصرعوں میں آپ نے وہ تمام باتیں کہہ دیں جو ایک افسانے میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ سیتاپور کے کچھ اور واقعات بیان کیجیے جو شاعری کے متعلق ہوں جن سے قصباتی زندگی کی ادبی فضا اور خصوصیات کا بھی کچھ اندازہ ہو۔

قاضی عبدالستار: جیسا میں نے آپ سے عرض کیا کہ سیتاپور میں ہمارے تین دوست تھے۔ ابوالحسن نغمی جو امریکہ میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں، کوثر بسوانی جو کوثر فاروقی ہو کر انتقال کر گئے اور فضل حق اختر جو ٹھیک سے جلے بھی نہیں تھے کہ بجھ گئے۔ ہر مشاعرے میں ہم لوگ دھما چوکڑی مچاتے تھے، سیتاپور میں ایک شاعر تھے عبدالکریم حیرت۔ وہ ہم لوگوں سے بہت جلتے تھے اور ہر مشاعرے کی نظامت دبوچ لیتے تھے۔ یہ سب وہ اس لیے کرتے تھے کہ ہم لوگوں پر ان کا رعب داب قائم ہو جائے، لیکن ہم لوگ ایک کافر، ان کے قابو میں کیا آتے۔ ایک مشاعرے میں ہمارے استاد راجہ بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ عبدالکریم حیرت نے کھڑے ہو کر کہا جناب صدر میں

کوثر کو پڑھنے نہیں دوں گا۔ شیدا صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہ کوثر نے کیا قصور کیا ہے۔ جواب دیا یہ منہ چڑاتا ہے اور چپکے چپکے گالیاں دیتا ہے۔ اس کا فیصلہ مشاعرے کے بعد ہوگا۔ شیدا صاحب نے مسکرا کر کہا۔ بچے ہیں، معاف کر دیا کیجیے۔ اس پر وہ شیدا صاحب سے بگڑ گئے۔ آپ نے ہی ان لڑکوں کو خراب کیا ہے۔ شیدا صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ فضل اختر نے غزل پڑھی۔ پھر ابوالحسن نغمی نے ہزل پڑھی۔ پھر ہم مسند پر پہنچے اور جناب صدر سے عرض کیا کہ میرا گلا خراب ہے (میں تحت اللفظ پڑھتا تھا) اس لیے میری غزل کوثر پڑھیں گے۔ کوثر اشعار پڑھتے رہے، تعریف ہوتی رہی اور ہم سلام کرتے رہے۔ آخر میں کوثر نے مقطع پڑھا:

وطن بسواں، اثر استاد، کوثؔر نام ہے میرا
چلے جاتے ہیں کیوں مجھ کو غزل خواں دیکھنے والے

ہنگامہ ہو گیا۔ لوگ قہقہے لگانے لگے۔ ہم منہ پھلائے بیٹھے رہے اور ہم نے جناب صدر سے گزارش کی کہ کوثر نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا۔ ہماری غزل پڑھنے کے بجائے اپنی غزل سنا دی۔ ہم بالکل بے قصور ہیں۔ ہم کو ہماری غزل پڑھنے کا موقع عطا کیا جائے۔ قبل اس کے کہ جناب صدر اجازت دیں مجمع آوازیں دینے لگا پڑھیے، پڑھیے، پڑھیے۔ خیر ہم نے غزل پڑھی، جو ہماری کم، استاد کی زیادہ تھی۔ وہ مشاعرہ بہت دنوں تک لوگوں کو یاد رہا۔ بالآخر ہم لوگوں نے عبدالکریم حیرت کو اتنا تنگ کیا کہ وہ پریشان ہو گئے۔ مثلاً انھوں نے غزل پڑھی ترنم سے، شکایت نہیں ہے، محبت نہیں ہے، کے ردیف قافیے میں۔ ہم چاروں نے آناً فاناً اس کی پیروڈی تیار کر لی۔ عداوت نہیں ہے، دعوت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ اور ستم یہ کرتے تھے کہ مشاعرے میں پڑھتے بھی تھے۔ ابوالحسن نغمی پڑھتے تھے۔ بالآخر انھوں نے نظامت چھوڑ دی۔ اس زمانے کے لوگ جو سیتاپور میں حیات ہیں، وہ ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ ○

رودادِ عشق

راشد: قاضی صاحب! عشق کا فلسفہ بے حد پیچیدہ ہوتا ہے، اس کے باوجود کم و بیش ہر انسان اس فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر انسان وادیٔ عشق میں قدم رکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور جب وہ عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ فلسفۂ عشق کے مختلف رموز و نکات سے کچھ کچھ آگاہی ہونا شروع ہوتی ہے۔ فلسفۂ عشق کو مکمل طور پر تو کوئی نہیں سمجھ پاتا لیکن اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ عشق کے مرحلے آسان نہیں۔ منزلِ عشق تو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن راہِ عشق کے نشیب و فراز ہی فلسفۂ عشق کو وقار عطا کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عشق کی مختلف النوع کیفیتوں کو جس فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب آپ کے فن پاروں میں عشق کی مختلف جہتیں دیکھنے کو ملتی ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کی زندگی کی کتاب، بابِ عشق سے خالی ہو۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ عشق کے سلسلے میں ایک آدھ نہیں، بلکہ کئی واقعات آپ کی زندگی سے وابستہ رہے ہوں گے۔ برائے کرم اپنی زندگی کے ان لمحوں کو تازہ کرنے کی کوشش کریں جو یقیناً افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہوں گی۔

قاضی عبدالستار: بھئی راشد صاحب آپ نے ایک ایسا سلسلہ چھیڑ دیا جو مجھے کئی دنوں تک پریشان کرتا رہے گا۔ زندگی میں بہت سی باتیں وقت گزرنے کے ساتھ دھندلی ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن عشقیہ لمحات ذہن میں پوری تازگی کے ساتھ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ عشق کے سلسلے میں ایک نہیں چار واقعات ہیں اور چاروں ہی ایک دوسرے سے مختلف، لیکن کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ میں فرداً فرداً زندگی کے ان حسین لمحوں کو بیان کروں گا۔ میرا پہلا عشق انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں ہوا۔ پرانے سیتاپور کے ایک الگ تھلگ محلّے ترین پور میں تین عمارتیں مشہور تھیں۔ محل، وارث منزل اور راجہ سروپ نرائن کی کوٹھی۔ محل ایک بڑی عمارت تھی جسے انگریزوں نے توڑ کر وہ سڑک نکالی جو فتن سرائے چوراہے کو جی ٹی روڈ سے ملاتی ہے۔ ترین پور سے جب ہم چلتے تو کھڑنجے کے ڈھال سے نیچے اُترتے، فتن سرائے کی سڑک کو کراس کرتے۔ پھر چڑھتے اور محل کے ایک کونے پر ایک انصاری کے مکان کے سامنے سے پھر نیچے اُترتے تو انگریزی شاعری میں جو نقشہ بروک کا ہوتا ہے، وہی تصویر سامنے ہوتی۔ یعنی نشیب میں حدِ نگاہ تک ہریالی اور داہنی طرف سے سرائن ندی کی ایک شاخ پتلی سی لکیر کی طرح گزرتی ہے اور اس پر لکڑی کا پل بنا ہے جس پر ہوتے ہوئے ایک چوڑی چکلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے امرودوں کے باغ سے گزرتے پکے پل پر چڑھ جاتے۔ پکے پل سے ہمارا اسکول سو گز پر تھا۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ سائیکل میرے پاس تھی، لیکن میں چلاتا نہیں تھا۔ وہ ہماری آمدنی کا ایک ذریعہ تھا کہ آج یہ خراب ہو گیا، آج وہ خراب ہو گیا۔ اماں سے پیسے مل جاتے تھے اور زندگی مزے میں گزرتی تھی۔ میں عام طور پر اسکول اکیلا جاتا۔

ایک دن میں ڈھال سے اُتر رہا تھا کہ ایک خوش بدن سی لڑکی پل سے گزر رہی ہے۔ میں تیز قدم چل کر اس کے برابر آ گیا۔ صورت دیکھی تو عجیب سی بھولی بھالی شرمائی ہوئی سی شکل تھی۔ بہت اچھی لگی۔ ہم اس کے ساتھ چلے تو وہ

آہستہ ہوگئی۔ ہم بھی آہستہ ہوگئے۔ خیر امرود کے باغ تک پہنچے تو میں نے امرود خریدے۔ ایک پیسے کے چار، اور میں نے اسے انتہائی بے تکلفی اور پوری ہمت کے ساتھ ایک امرود پیش کیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا میں نہیں کھاتی۔ ہم اصرار کرتے رہے، وہ انکار کرتی رہی۔ بہر حال اس امرود نے تقریب کلام تو پیدا کر دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کا اسکول کتنے بجے ختم ہوتا ہے۔ اس نے بہت شرما کر جواب دیا، میرا مشن اسکول چار بجے تک ہے۔ ہمارا کالج بھی چار بجے تک تھا۔ میں چار بجے سے کچھ پہلے پکے پل پر آ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو مجھے اس کی نظروں میں شناسائی کا احساس ہوا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ وہ وارث منزل کے پائیں باغ کے نیچے جو گلی ہے، اس کے سامنے ایک دومنزلہ مکان میں رہتی ہے۔ اس مکان میں ایک ڈپٹی کلکٹر کرائے پر رہتے تھے۔ میں نے اس کو پہنچا کر طے کر لیا کہ اس سے دوستی کرنی ہے، اس لیے کہ اسی گھر کا لڑکا میرے دوستوں میں تھا۔ اس کا نام تھا تقی اللہ کرمانی۔ شام کو ہم لوگ وارث منزل کے سامنے میدان میں ہاکی کھیلتے تھے۔ تقی بھی آتا تھا۔ ایک دو دن کے بعد ہم نے تقی سے پوچھا کہ یہ لڑکی جو آپ کے یہاں سے مشن اسکول میں پڑھنے کے لیے جاتی ہے، کون ہے۔ اس نے بتایا یہ ہمارے ابا جان کی مرحوم بہن کی اکلوتی بیٹی ہے اور ان کے ابا جان بھی مر گئے ہیں اور یہ ہمارے ابا جان کے پاس رہتی ہے۔ تقی کی ایک بہن لکھنؤ کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھتی تھی۔ اس کے کپڑے لتے، تقی کا لباس اور قمر کے کپڑوں میں بہت فرق تھا۔ اس فرق نے دل میں اور ہمدردی پیدا کر دی۔ میں تقی کے ساتھ کیرم کھیل رہا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں آئی، یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ چائے پئیں گے۔ تب تقی نے جواب دیا چھبن بھائی سے پوچھو۔ اس نے مجھ سے پوچھا آپ چائے پئیں گے۔ میں نے جواب دیا آپ کے ہاتھ کی چائے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ

شرما کر چلی گئی۔ تقی پر اس جملے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب خیال آیا کہ تقی کی والدہ اکثر وارث منزل آتیں اور وارث منزل کی خواتین بھی ڈپٹی صاحب کے یہاں جاتیں۔ ایک دن میں نے تقی سے ایک سوال کیا کہ تمہارے گھر سے مشن اسکول بہت دور ہے۔ قمر چھوٹی ہے۔ یہ اکیلی پیدل اسکول جاتی ہے۔ تقی نے بہت لاپرواہی سے جواب دیا۔ ہمارا چپراسی ان کو پہنچانے جاتا تھا لیکن اس کی سائیکل چوری ہوگئی۔ اس لیے اب یہ پیدل جاتی ہے۔ میں نے کہا تم میری سائیکل لے لو۔ اس نے جواب دیا یہ بات ابا جان کو پسند نہیں ہوگی۔ چند روز کے بعد میں نے قمر سے کہا کہ آپ میرا انتظار کیا کیجیے تا کہ میں آپ کے ساتھ چل سکوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اکیلی جائیں۔ میں نے اپنا راستہ بدل دیا اور جب میں کوٹھی کے سامنے سے گزرتا تو وہ تیار ملتی۔ کبھی کبھی مجھے انتظار کرنا پڑتا۔ ڈپٹی کلکٹر کی بیگم کو یہ بات معلوم ہوگئی، لیکن انھوں نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ قمر جتنی شرمیلی تھی، اس سے زیادہ شرمیلے ہم خود تھے۔ ہم دونوں کے درمیان کی ساری گفتگو امرود اور کیرم کے اردگرد گھومتی اور بس۔ ایک دن ہم اور تقی کیرم کھیل رہے تھے کہ وہ آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا آپ سوئیٹر بنوائیں گے۔ میں نے کہا، ہاں میں بنواؤں گا۔ کتنے میں بُنتا ہے۔ اس نے کہا شاید چھ یا سات روپے میں اون آتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں کل بتاؤں گا۔ ہم رہتے سیتاپور میں تھے، لیکن ہمارے کپڑے مچھریٹہ میں دھلتے تھے۔ ہر سنیچر کو ملازم کپڑے، انڈے، حلوے، گھی وغیرہ لے کر آتا تھا اور میلے کپڑے لے جاتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ خبر بھیجی اپنی اماں کو کہ دس روپے بھیج دیجیے۔ میں سوئیٹر بنواؤں گا۔ دوسرے سنیچر کو پیسے آگئے اور میں نے نیلے رنگ کا اون خرید کر قمر کو دیا۔

آٹھ دس دن گزرے تھے کہ اس نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کا ناپ لوں گی، تو پہلی بار اس نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔ یہ محسوس ہوا جیسے دونوں

شانوں میں آگ لگ گئی، جو سینے کو پھونکتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی اور جب اس نے ہاتھ ہٹا لیے یعنی ناپ لے لی تو بہت افسوس ہوا۔ اب ہمارے ساتھ وہ کیرم بھی کھیلنے لگی۔ اب ہماری بے قراری اتنی بڑھ گئی کہ ہم پائیں باغ میں لگے کمرخ کے درخت کی شاخ پر بیٹھ کر ریلنگ میں کھڑی قمر کو دیکھنے کے لیے دیر تک بیٹھے رہتے۔ پھر وہ سوئیٹر بن گیا، اور ہم نے اسے بہت شوق سے پہنا، اور اسے برسوں پہنا۔ خیر اب ہمارے درمیان خطوط کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ اس کا مضمون بڑا دلچسپ ہوتا۔ آپ نے کھانا کھایا؟ آپ کے کھانے میں کیا تھا، کل جو امرود آپ نے کھایا تھا وہ کیسا تھا، کیا ترکیب کی جائے کہ ہم دونوں ایک ساتھ فلم دیکھیں۔ دیکھیے آپ یہ یاد رکھیے کہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ اگر ماموں جان کو کچھ معلوم ہوگیا تو گھر سے نکال دی جاؤں گی، اس لیے آپ ایسی خواہشات کا اظہار مت کیا کیجیے۔ میں نے نوٹنکی کے اداکاروں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ اگر آپ کے ماموں جان آپ کو نکال دیں گے تو ہم آپ کو اپنے گھر لے جائیں گے۔ دیکھیے ہم اکیلے ہیں۔ ہماری ایک چھوٹی سی بہن ہے اور ماں ہے اور ہمارے پاس جائداد ہے، ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم اور آپ ٹھاٹ سے رہ سکتے ہیں۔ وہ چپ سنتی رہتی، خاموش رہتی، کبھی کبھی آب دیدہ ہوجاتی۔ فلموں میں دیکھے ہوئے ہمارے ڈائیلاگ سن کر وہ چپ رہتی۔ آج خیال آتا ہے کہ لڑکی، لڑکے کے مقابلے میں کم عمری کے باوجود کتنی بالغ ہوتی ہے۔

پھر پورا ایک سال گزر گیا۔ ایک بار میں نے اپنی اماں سے ذکر کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہمت نہیں پڑی۔ میں نے اپنی چچی جان بیگم قاضی محمود علی سے دوسرے جاڑوں میں کہا۔ یعنی اب میں انٹرمیڈیٹ فائنل میں آگیا تھا۔ میں نے چچی جان سے گزارش کی کہ اماں سے بات کیجیے۔ وہ بھی اماں سے بہت ڈرتی تھیں۔ فرمایا موقع محل دیکھ کر جب بھابھی جان کا موڈ اچھا ہوگا، تب کہوں گی اور تمہاری شادی ابھی کیسے ہوسکتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس نہیں ہو،

بی اے کرو، ایل ایل بی کرو، وکالت پاس کرو، تب ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم سنتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ سب کر کے دکھا دیں گے۔ مارچ کا مہینہ تھا، ہمارے امتحانات ہو رہے تھے۔ تقی ہائی اسکول کا امتحان دے رہا تھا۔

ہم دونوں امرود کے باغ میں داخل ہو رہے تھے۔ دونوں نے امرود خریدے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر کھانے لگے۔ تقی نے کہا ایک خبر سنائیں تم کو چھبن بھائی۔ میں نے کہا ہاں سناؤ۔ کسی سے کہیے گا تو نہیں۔ ہم نے کہا ہرگز نہیں کہیں گے۔ اس نے کہا ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ ابا جان کے ایک عزیز ہیں جو کراچی میں ہیں اور کسی بہت بڑی پوسٹ پر ہیں۔ انھوں نے بلایا ہے، ہم لوگ بہت خاموشی سے نکل جائیں گے۔ ابا جان کی ابھی بارہ چودہ برس کی ملازمت باقی ہے۔ وہاں ان کو بڑی پوسٹ مل جائے گی۔ وہ باتیں کر رہا تھا اور ہماری ساعت سُن ہو گئی تھی۔ ہم چل نہیں رہے تھے، لڑھک رہے تھے۔ ہمارے کان بجنے لگے تھے اور ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تقی کو کس طرح خاموش کریں۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے چھبن بھائی۔ آپ چلیے میں ہاکی کھیلنے کے لیے آ رہا ہوں۔ چھبن بھائی آپ رو رہے ہیں؟ چھبن بھائی کیا ہو گیا، میں نے کہا نہیں میں نہیں رو رہا ہوں۔ تمہیں بس ویسے ہی لگ رہا ہوگا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ ہاکی کھیلنے ضرور آنا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ گم صم خاموش بیٹھا رہا۔ نوکر میرا ناشتہ رکھ گیا جو ویسے ہی رکھا رہا۔ میں نے اپنا لباس بھی تبدیل نہیں کیا کہ تقی آ گیا۔ ارے چھبن بھائی آپ تو یوں ہی بیٹھے ہیں۔ نہ نیکر پہنے ہیں، نہ ٹی کیپ لگایا ہے، ہاکی کیسے کھیلیں گے۔ تقی آج ہم تمہارے ساتھ ایسے ہی کھیلیں گے۔ اتنے میں ہماری ممانی جان یعنی بیگم قاضی جمیل الدین آ گئیں۔ تم اندر کیوں نہیں آئے؟ نہ تو تم نے ناشتہ کیا، نہ چائے پی، نہ ہی تم نے کپڑے تبدیل کیے۔ کیا بات ہے، مجھے بتاؤ۔ یہ رونے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا نہیں ممانی جان میں

رو نہیں رہا ہوں۔ تو کیا آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ بے وقوف کہیں کا۔ تقی بولے۔ آج پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ میں اُٹھا اور ہا کی لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ممانی جان اسی طرح کھڑی تھیں۔ تقی کا دل بھی ہا کی کھیلنے میں نہیں لگا۔ اس لیے کہ میں فارم میں نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا، ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اوپر اپنی ماں کے پاس گیا کہ پتہ نہیں چھبن بھائی کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے ناشتہ نہیں کیا، چائے نہیں پی، میں کیرم کھیلنے بیٹھ گیا لیکن ہا کی کی طرح ہاتھ نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں قمر کشتی لے کر آئیں۔ اس میں دو کباب اور چائے کی پیالی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ کشتی رکھ کر جانے نہیں لگی بلکہ کھڑی ہو گئی کہ کھا لیجیے۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ تقی نے کہا چھبن بھائی کباب کھانے پڑیں گے۔ اس نے بھی کہا اللہ کھا لیجیے نا۔ میں نے کباب کھا لیے۔ پیالی اُٹھائی تو اس میں ایک آنسو گر پڑا۔ تقی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ قمر بھاگ گئی۔ یہ چائے خراب ہو گئی۔ میں دوسری بناتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں میرا ہی آنسو ہے نا اور میں نے چائے کا گھونٹ لے لیا۔ تھوڑی دیر میں تقی کی اماں جان آ گئیں۔ چھبن میاں آپ کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے اسکول میں، یا کسی ماسٹر نے کچھ کہا ہے۔ تقی کہہ رہا تھا کہ آپ جب سے اسکول سے آئے ہیں، مسلسل رو رہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے، بڑے ضبط سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں پھٹ پڑوں گا۔ میں ان کو کوئی جواب دیے بغیر اُٹھا اور تیر کی طرح واپس آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر چبوترے پر آ گئی تھیں اور مجھے دیکھ رہی ہیں۔ رات میں بخار آ گیا۔ ماموں جان نے سائیکل پر کسی کو بھیج کر میری ماں کو اطلاع کر دی۔ اس لیے کہ بخار ایک سو تین ہو گیا تھا۔ ماموں صاحب مجھے خود لے کر ڈاکٹر شیام سندر مشرا کے یہاں پہنچ گئے جو اُن کا دوست تھا۔ سب کا خیال تھا کہ میں اپنے باپ کی

یادوں میں اچانک مبتلا ہوگیا ہوں۔ ڈاکٹر مشرا نے بھی کہا کہ اس کو Shock پہنچا ہے۔ شام کو اماں پالکی پر چڑھ کر آ گئیں۔ میں نے سوچا کہ اب اس راز کو فاش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ کرمانی صاحب کی روانگی میں صرف دو دن باقی ہیں۔ دوسرے دن میں ٹھیک وقت پر کالج کے لیے تیار ہوا اور لکڑی کے پل کے پاس انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی۔ سارا دن گزر گیا۔ میں سوچتا رہا کہ آج ممانی جان نے کیوں روک لیا؟ تب میں تقی کو ڈھونڈھنے گورنمنٹ اسکول گیا۔ معلوم ہوا کہ تقی بھی نہیں آیا۔ میں پریشان ہوگیا اور گھر آ گیا۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو ان کا چپراسی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا تقی کو آواز دو تو وہ مسکرایا کہ وہ لوگ تو رات میں ہی چلے گئے۔ میں اپنی ماں سے اور سب سے جھگڑ کر بخار کی حالت میں نکلا تھا۔ اس خبر سے جیسے صحت ہوگئی۔ میرا بخار اُتر گیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ چپ چاپ اپنے گھر چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ تقی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ صحیح تاریخ اس نے مجھے نہیں بتائی تھی، یا اس کے ماں باپ نے اس کو نہیں بتائی۔ بہر حال ہم نے وہ سوئٹر بہت احتیاط سے رکھ لیا۔ اس حسین و جمیل سوئٹر کے ہر پھندے میں نافہمیدہ آرزوؤں کا کارواں، نادیدہ خوابوں کے قافلے لرزاں ہیں۔ ان گلابی لانبی اور مخروطی انگلیوں کے مہکتے ہوئے لمس میں سارا سوئٹر شرابور ہو رہا ہے۔ جب میں اسے پہنتا تو محسوس ہوتا کہ میں اس کے کمرے میں کیرم کھیل رہا ہوں۔ ابھی وہ کسی کمرے سے طلوع ہوگی۔ خاموش، حیران اور التفات میں ڈوبی ہوئی، بے نیاز آنکھوں کے تکلم اور تبسم سے سارا کمرہ جھلکنے لگے گا۔ ابھی میں اس کی دید سے آسودہ بھی نہیں ہوسکوں گا کہ وہ کسی دروازے میں غروب ہو جائے گی اور میں اس کے کزن تقی کے ساتھ خالی خالی آنکھوں سے، مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ہاکی کھیلنے فیلڈ میں پہنچ جاؤں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۳ء تک وہ سوئٹر ایک قیمتی دولت کی طرح میرے پاس محفوظ رہا۔ ۱۹۸۳ء میں جب کوثر پر

دورے پڑنے لگے اور انھوں نے میرے سب دھراؤ کپڑے ضائع کر دیے تو معلوم ہوا کہ قمر کی انگلیوں کے لمس کی دولت کہیں کھوگئی۔ ہماری دھرو ہر غریب ہوگئی۔ ہمارا حافظہ مفلس ہوگیا۔

راشد: آپ کی رودادِ عشق سنتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ حقیقی زندگی کے نشیب وفراز، افسانوں کے اُتار چڑھاؤ سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اور جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ ایک معصوم محبت جس میں ہوس کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، وہ بھی جذباتی سطح پر ہمیں حددرجہ انگیز کرسکتی ہے۔ نہ صرف تحریری طور پر بلکہ زبانی بھی آپ واقعات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ سننے والا سحر میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ پہلے عشق کی جس منزل پر پہنچا کر آپ دم لینے کو رُکے ہیں، کیا یہی اس رودادِ عشق کا انجام ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ادھورے عشق کا بیان آپ کی ترجیحات میں اوّلیت رکھتا ہو۔ آپ کے ناولوں اور افسانوں میں تو لازمی طور پر بہترین عشق کا کلائمکس موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی کی ایسی دلچسپ کہانی میں کوئی اہم موڑ نہ آیا ہو؟

قاضی عبدالستار: درست فرمایا آپ نے۔ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ کہانی کے اصل موڑ تو ابھی آئے ہی نہیں۔ درمیان میں تھوڑا ستالینا ضروری ہوتا ہے۔ لگاتار بولنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ عمر کا اثر ہے۔ بہرحال اس قصے کو جاری رکھتا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں جب ہم پاکستان گئے اور تقریباً پندرہ دن لاہور میں رہے۔ اخبار میں خبریں چھپتی رہیں۔ کسی مجلسِ ادب کے تحت ایک شام ''شامِ افسانہ'' کا انعقاد کیا گیا۔ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل اس کے کنوینر تھے۔ میں کچھ پاکستانی دوستوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھا تھا۔ جلسہ شروع ہونے میں دیر تھی کہ طفیل صاحب تشریف لائے۔ مجھ سے کہا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے سمجھا کوئی افسانہ نگار ہوں گی، یا افسانے سے دلچسپی ہوگی۔ میں ان کے ساتھ گیا، سفید کوٹ، سفید شلوار، سفید دوپٹے کے ہالے میں قمر کا بھرا

بھرا ئسرخ وسفید چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میرے منہ سے صرف اتنا نکلا ــــ قمر۔ محمد طفیل سمجھ گئے۔ فوراً ہٹ گئے۔ ہم لوگ دیر تک کھڑے رہ گئے۔ میں گونگا ہو گیا تھا۔ وہ بھی بولنا بھول گئی تھی۔ اتنے میں ایک شخص عمدہ سوٹ پہنے کمرے میں آیا۔ قمر نے کہا چھبن بھائی ہمارے شوہر ڈاکٹر انور۔ میں نے اپنا لکڑی جیسا مردہ ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ قہقہہ لگایا۔ چھبن بھائی، جب آپ کو پدم شری ملا ہے تو ہماری بیگم نے ہماری دعوت کی تھی پہلی بار۔ قمر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اس جلسے کے بعد میں آپ کو لے چلوں گا۔ مجھے یاد نہیں جلسے میں کیا ہوا۔ میں تو قمر کو دیکھ رہا تھا۔ قمر مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسی پاکیزہ نظروں سے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ اپنی فرشتگی پر حیرت تھی۔ پھر ہم اس کے گھر گئے۔ انارکلی یاد ہے۔ اس کے بعد کا راستہ یاد نہیں ہے۔ چھوٹی سی کوٹھی، دو بورڈ لگے ہوئے۔ ڈاکٹر انور قمر، ڈاکٹر قمر انور۔ دونوں لاولد۔ ڈاکٹر نے مجھے وہسکی صَرف کی، میں نے ذرا سے تامّل کے بعد اس کا گلاس قبول کر لیا۔ قمر قسم قسم کے پکوان کھلاتی رہی۔ ہم کو کہیں کھانے پر جانا تھا۔ ہم نے وہ ملتوی کر دیا، اور ہم ڈاکٹر انور کے واسطے سے قمر سے باتیں کرتے رہے۔ ایک بار گھڑی دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ بارہ بج گئے ہیں۔ قمر پہلی بار میرے بہت قریب آئیں۔ چھبن بھائی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ جی چاہے تو یہیں ٹھہر جائیے۔ صبح چلے جائیے گا۔ نہیں نہیں۔ ہم جائیں گے۔ ڈاکٹر انور ہمیں گیسٹ ہاؤس تک پہنچا دیں گے۔ وہ دونوں ہمیں پہنچانے آئے۔ یہ وعدہ لے کر گئے کہ جب تک ہم لاہور میں ہیں، رات کا کھانا انھیں کے ساتھ کھاتے رہیں گے۔ ایسے ہی کئی دن گزر گئے۔ گھنٹوں ہم دونوں کو تنہا رہنے کا موقع ملا، لیکن ہاتھ کے علاوہ ہم نے ایک دوسرے کے جسم کے کسی حصے کو نہیں چھوا۔ مجھے اپنے اوپر حیرت ہے کہ میں نے قمر کی محبت کا اتنا احترام کیسے کر لیا۔ قمر پر حیرت نہیں ہے۔ پاکستان میں

ان کے کسی مریض کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُٹھ گئے۔ واش بیسن پر ہم نے قمر سے کہا کہ تمہارا تحفہ ہمارے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ اس نے ابروؤں کی کمانوں کو جوڑتے ہوئے پوچھا کون سا تحفہ؟ سوئٹر۔ سوئٹر!! اللہ۔ سچ مچ۔ اپنے سر کی قسم۔ قسم بھی اپنے سر کی کھائیے گا۔ ہاں اسی پر تو اختیار ہے۔ بی بی جی کافی تیار ہے۔ تب ہم دونوں کو معلوم ہوا کہ ہم ہاتھ دھو چکے ہیں۔ قمر نے تو ال پیش کرتے ہوئے پوچھا ہاتھ دھو چکے؟ ہم تو مدتوں پہلے ہاتھ دھو چکے۔ حافظہ دھندلانے لگا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ عمر بھر کے لیے جگمگانے کا سامان ہو گیا۔ ہم سگریٹ رول کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر انور نے قمر سے کہا پروفیسر کو جانے مت دینا۔ ہم آ ہی رہے ہیں۔ اگر ہم کو اپنی خوش نصیبی پر یقین ہوتا اور یہ گمان بھی ہوتا کہ تم ہماری آنکھوں کو نصیب ہو جاؤ گی تو ہم اس کو پہن کر آتے۔ چاہے قمیص کے نیچے ہی پہننا پڑتا۔ پھر الفاظ ختم ہو گئے اور آنکھیں باتیں کرتی رہیں۔ پھر فون آیا کہ پروفیسر کو جانے مت دینا۔ ہم آ ہی رہے ہیں۔

لاہور اسٹیشن پر ڈاکٹر انور نے کہا چھبن بھائی آپ نے ہمارے گیٹ پر نیم پلیٹ دیکھی۔ کچھ خیال نہیں کیا ہے۔ کیوں؟ ہمارے ابا جان کا نام قمر الدین عابدی ہے۔ ہم ڈاکٹر انور قمر ہو گئے۔ جب ڈاکٹر قمر سے ہماری شادی ہوئی تو وہ ڈاکٹر قمر انور ہو گئیں۔ آپ نے یہ خوب صورت اتفاق دیکھا کہ ہم ڈاکٹر انور قمر ہیں اور ہماری بیگم ڈاکٹر قمر انور۔ زندگی میں تو بہت سی باتیں عجیب ہوا کرتی ہیں ڈاکٹر صاحب۔ جب بھیڑ کم ہوئی تو ڈاکٹر انور نے مجھے چاندی کا ایک سگریٹ کیس پیش کیا اور مسکرا کر کہا سگریٹ کیس میرا ہے۔ اس کے سگریٹ قمر نے رول کیے ہیں۔ سگریٹ تو ختم ہو جائیں گے، لیکن سگریٹ کیس آپ کو یاد دلاتا

رہے گا۔ جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ سگریٹ ختم اس وقت ہوں گے جب ہم پہنچیں گے اور ہم ڈبے میں داخل ہو گئے۔ لاہور اسٹیشن پر کتنے لوگ رخصت کرنے آئے تھے، لیکن ایسا لگتا تھا کہ صرف دو آنکھیں مجھے رخصت کرنے آئی ہیں۔ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ہی شعر ہو گیا:

یاد آتی ہیں کس قدر آنکھیں
وقتِ رخصت وہ تر بہ تر آنکھیں

وہ آنکھیں آج بھی یاد آتی ہیں تو بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور میری آنکھیں ایک گزرے ہوئے کارواں کی جگالی کرتی رہتی ہیں۔

راشد: بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ جس معصوم عشق کا بیان آپ نے شروع کیا ہے اس کے اختتام میں ایسے ڈرامائی موڑ شامل ہوں گے۔ کوئی بھی کہانی تخلیقی فن کار کے تخیل سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس میں دلچسپ اور حیرت انگیز موڑ شامل کیے جاسکتے ہیں تاکہ کہانی کی اثر انگیزی برقرار رہے، لیکن زندگی کی کہانی میں ایسے موڑ بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان معنوں میں دیکھا جائے تو زندگی کی کہانی، قوتِ متخیلہ کے ذریعے بنی گئی کہانی سے زیادہ توجہ طلب ہوتی ہے اور آپ کے دلچسپ بیان نے رودادِ عشق کے تاثر کو دوگنا کر دیا۔ جب پہلے عشق سے ساعتیں روشن ہو گئی ہیں تو اگلے عشق یعنی دوسرے عشق کی روداد سننے کی بے چینی مزید بڑھ گئی ہے۔ اپنے دوسرے عشق کو اسی طرح تفصیل سے بیان کریں۔

قاضی عبدالستار: لکھنؤ میں ہیوٹ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۲ میں میرا قیام تھا۔ ہوسٹل میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے، جنگ صاحب۔ یہ نیپال کے بادشاہ کے کچھ عزیز ہوا کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی لکھنؤ کینٹ میں بریگیڈیر تھے۔ جنگ صاحب بارہ سال سے فیل ہو رہے تھے۔ اس لیے کہ اگر پاس ہو جاتے تو لکھنؤ چھوڑنا پڑتا۔ مجاز کی دعوتوں کے سلسلے میں ہماری ان کی دوستی ہو گئی۔ ان کو رقص و موسیقی

سے بھی دلچسپی تھی۔ ہمارے ہوسٹل کے وارڈن مشہور زمانہ اے سی چٹرجی جو یو پی میں ہاکی کے لیجنڈ تھے، ہمارے وارڈن تھے۔ ایک رات جنگ صاحب کے کمرے میں مجرا ہو رہا تھا۔ ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی لڑکے نے مخبری کر دی۔ اے سی چٹرجی آ گئے اور جو کچھ ہوا، وہ تو ہوا۔ ہمارا سامان کمرے سے نکال کر نیچے رکھ دیا گیا اور تانگا بلوالیا گیا۔ صبح نو بجے ہمیں ہاسٹل چھوڑنا تھا۔ سخت پریشان۔ کیا کریں، کہاں جائیں کہ خیال آیا کہ ہمارے ایک دور کے عزیز کشمیری محلے میں رہتے ہیں اور نواب صاحب کہے جاتے ہیں۔ ہم لدے پھندے انھیں کے یہاں پہنچ گئے۔ نواب صاحب جن کو ہم بڑے ماموں کہتے تھے، برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تانگے والے نے سامان اُتار کر رکھ دیا۔ ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ ہمیں ہاسٹل سے نکال دیا گیا ہے اور یہ کہ ہم بہت بے قصور ہیں۔ بس ضد میں نکال دیا وارڈن صاحب نے، تو اب ہمارے رہنے کا انتظام کر دیجیے۔ انتظام کے کیا معنی؟ پورا محل پڑا ہوا ہے، رہیے۔ نہیں نواب ماموں کوئی جگہ بتا دیجیے ہمارے لیے بالکل الگ۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے ملازم کو حکم دیا بھیا کا سامان کنارے والی بارہ دری میں لگا دو۔ یہ ایک چھوٹی سی اکائی تھی۔ بارہ دری کے پیچھے ایک ہال، ایک طرف ضرورت خانہ، دوسری طرف سامان رکھنے کی کوٹھری۔ ہم رہنے لگے۔ تیسرا دن تھا کہ ہماری والدہ بھی آ گئیں۔ وہ کسی تقریب کے سلسلے میں لکھنؤ آئی تھیں۔ نواب صاحب سے ملنے کے لیے ان کے محل آئیں اور ہم کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں، لیکن نواب ماموں نے کہانی سنا کر ہموار کر لیا۔ اماں تھیں ایک کڑھی ہوئی خاتون۔ نواب سے کہا چھبن، یہاں رہتے ہیں، رہیں، لیکن کھانا ہوٹل میں کھائیں گے۔ نواب خود ٹیڑھے آدمی تھے، لیکن اماں کی اس شرط پر رضامند ہو گئے۔ ہم چوک کے سب سے اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے لگے۔ ایک دن ہم بارہ دری میں بیٹھے تھے کہ دس قدم کے فاصلے پر دوسرے مکان کی بارہ دری کے در میں ایک

پری چھم سی نظر آئیں۔ انھوں نے ہم کو دیکھا۔ ہم نے ان کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ چلی گئیں۔ شام کا وقت تھا۔ دوسرے دن ہم اسی وقت اپنی بارہ دری کی کرسی پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگئیں۔ دالان کے سامنے چبوترے پر ٹہلیں، کیاریوں سے دوایک پھول توڑے اور سر سے پاؤں تک گلدستہ بنی چلی گئیں۔ تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ ہوٹل کا کھانا اچھا تھا، لیکن ہوٹل کا کھانا تھا۔ چندروز میں ہم اُوب گئے۔ ایک شام ایک ملازمہ آئی۔ ایک پلیٹ میں چار کباب لائی اور کہا کہ آپ کو بٹیا صاحب نے بھیجا ہے۔ ہم نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو وہ دالان میں کھڑی تھی۔ ملازمہ چلی گئی۔ ہم اور قریب آئے۔ دس گز کے فاصلے پر آکر ہم نے ان سے پوچھا یہ کباب آپ نے بھیجے ہیں۔ انھوں نے کہا جی ہاں۔ آپ ہوٹل کا کھانا کھاتے ہیں، اس لیے ہم نے گھر کے کباب بھیج دیے، اور شرما کر چلی گئیں۔ اب ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ آنے لگا۔

ایک روز میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ نواب ماموں نے فرمایا کہ میں چندروز کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ آپ جب جایا کیجیے تو اپنا کمرہ بند کر دیا کیجیے۔ اس دن شام کو وہ پھر نظر آئیں تو ہم نے اپنی شخصیت کی ساری جسارت اور جرأت سمیٹ کر انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اور ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ بغیر کسی تکلف کے تشریف لے آئیں۔ ہم نے ان کو قریب سے دیکھا تو وہ اور بھی اچھی لگیں۔ بہت دیر تک رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ان کی عورتوں نے اشارے سے کہا شمیم بٹیا آجایئے، امی یاد کر رہی ہیں۔ بہت بے نیازی سے جواب دیا آرہی ہوں۔ پھر پوچھا آپ نے چائے پی لی۔ میں نے کہا نہیں۔ میں تو آپ کو دیکھنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ کے پاس بیٹھ کر چائے پینے کا خیال تک نہیں آیا۔ وہ شرما گئیں۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ کھڑی ہوگئیں، چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد

میں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک خاتون برآمدے میں آئیں۔ میری طرف دیکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے خاصی بلند آواز میں جواب دیا جیتے رہیے۔ بیٹھے بیٹھیے۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ ان کو یہ خیال آیا کہ نواب ماموں تو باہر گئے ہوئے ہیں۔ ملازموں نے چائے بنا کر نہیں دی۔ سو ایک کشتی میں ناشتے، دوسری کشتی میں چائے کی کیتلی بھجوائی۔ دو ملازمائیں لے کر آئیں۔ ساتھ میں شمیم بٹیا بھی تھی۔ قیمہ بھرے تکونے تھے اور حلوہ تھا۔ ہم نے بلاتکلف دونوں پلیٹیں صاف کر دیں۔ شمیم نے چائے بنائی۔ پوچھا شکر کتنی لیں گے۔ میں نے جواب دیا۔ چائے ہم اس لیے پیتے ہیں کہ وہ میٹھی ہوتی ہے۔ اس نے چار پانچ چمچے ڈال دیے اور ہم بلاتکلف پی گئے۔ دوسری پیالی جب بنائی تو کہنے لگی کہ ہم آپ سے دودھ پوچھنا تو بھول ہی گئے۔ میں نے کہا دودھ پینے کی ایک عمر ہوتی ہے جو گزر گئی۔ پہلی بار وہ کھل کر ہنسی اور پیالی میں دودھ دان تقریباً انڈیل دیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ''تعلیم گاہِ نسواں'' میں نویں درجے میں پڑھتی ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں۔ اس رات نیند بہت دیر میں آئی۔ دوسرے دن شام کے وقت ایک ملازمہ آئی اور کہا کہ بیگم صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ چائے وہیں پی لیں۔ ہم دالان سے ہوتے ہوئے، گیلری سے گزرتے ہوئے ڈائنگ ہال میں داخل ہوئے۔ بہت خوب صورت فرنیچر تھا۔ عمدہ فانوس جھول رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کی بیگم صاحبہ ایک شان دار خاتون کی طرح داخل ہوئیں۔ میرے سلام کا جواب دیا اور کہا شمیم کے ابا کہہ رہے تھے کہ آپ نے بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں میں بی اے آنرس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرا رزلٹ اس سال کے امتحان کے بعد ڈکلیئر ہوگا۔ امید ہے کہ میں ٹاپ کروں گا۔ پھر وہ میرے گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہیں، باتیں کرتی رہیں، زمین داری کے بارے میں پوچھتی رہیں اور میں خوش خوش ان کو سب کچھ بتاتا رہا۔ آخر میں انھوں نے پوچھا کہ آپ نے

ہاسٹل کیوں چھوڑ دیا تو میں نے کہا وارڈن صاحب سے میری لڑائی ہوگئی اور سگریٹ پینے کی وجہ سے انھوں نے مجھے ہاسٹل سے نکال دیا۔ انھوں نے بڑی حیرت سے کہا کہ میرا ایک بھانجا حبیب اللہ ہاسٹل میں رہتا ہے اور سگریٹ پیتا ہے۔ کئی بار بہت ڈانٹا گیا، مارا گیا، لیکن نالائق پیتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ کا ہاسٹل بہت اچھا تھا۔ جب تک نواب بھائی نہیں آجاتے، آپ چائے یہیں پی لیا کیجیے، اور بہت زیادہ تکلف نہیں کرتے۔ جب آنے کو جی نہ چاہے تو ملازم سے کہیے چائے لے آئے۔ بالکل اپنا گھر جانیے۔ خیر ہم نے ڈٹ کر ناشتہ کیا، چائے پی، سلام کیا، چلے آئے۔ ایک روز ہم چائے پینے گئے تو شمیم نے پیشوائی کی۔ معلوم ہوا کہ ان کی والدہ پڑوس میں تشریف لے گئی ہیں۔ اس دن ہم ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پوری بے حیائی کے ساتھ ان کے بستر کی تعریف کرتے رہے، تکیوں کو سونگھتے رہے اور ان کی خوشبو کی داد دیتے رہے۔ وہ بیر بہوٹی کی طرح شرماتی، ہنستی اور مسکراتی رہی۔ وہ شام بہت خوب صورت گزری۔ جب رات ہوگئی تب ہم اپنی بارہ دری میں واپس آئے۔

اس رات نیند نہیں آئی۔ کوئی ڈھائی بجا ہوگا جب ہم حاجت کے لیے اُٹھے تو محسوس ہوا کہ برآمدے میں کوئی چل رہا ہے۔ ہم نے لائٹ آن کی اور باہر نکل کر دیکھا تو شمیم کھڑی تھی۔ ہم بجلی کی طرح اس کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا کیا بات ہے۔ وہ خاموش رہی، اماں کہاں ہیں۔ سو رہی ہیں۔ اور ابا جان آپ کے۔ وہ بھی سو رہے ہیں۔ اور آپ؟ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ تو آپ ہمارے ساتھ چل کر ہمارے کمرے میں بیٹھیے۔ ہیٹر پر چائے بنائی گئی۔ ہم دونوں پیتے رہے، لیکن معمولی رسمی گفتگو کے علاوہ کسی موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ساری کاروائی آنکھوں کے ذریعے ہی ہوتی رہی۔ پہلی بار میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ میں دیر تک ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا۔ کچھ چاپ محسوس ہوئی۔ ہم دونوں اُٹھ کر فوراً باہر آگئے۔ ان کے

دالان میں ایک ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ شب بخیر کہہ کر دوسری طرف دوڑ گئی۔ صبح ہم چائے پی رہے تھے تو پہلا خط آیا۔ کوئی القاب، نہ آداب۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ انا میرے کمرے میں سوتی ہے۔ اس کی آنکھ کھلی اور مجھ کو موجود نہ پا کر وہ دالان میں آگئی۔ کسی کو کچھ نہیں پتہ چلا ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، اور اگر اس خط کا جواب آپ دینا چاہیں تو یہ انا دالان میں آتی جاتی رہے گی، اس کو دے دیجیے گا۔ میں اسکول جا رہی ہوں۔ اب باقاعدہ خطوط بازی ہونے لگی۔ نواب آگئے لیکن ہم چائے پینے جاتے رہے۔ ایک دن ہم شام کو چائے پی کر اپنی بارہ دری میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ نواب ماموں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہاں گئے تھے آپ؟ میں نے مختصر الفاظ میں سب بتا دیا۔ ایک بات غور سے سن لیجیے، نواب ماموں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمیم اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا بڑا بھائی انگلینڈ میں ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ آپ اکلوتے بیٹے ہیں۔ ایک جائداد کے مالک ہیں، لیکن آپ سنّی ہیں اور شمیم شیعہ ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ساری بات بتا دوں تا کہ آپ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ شمیم کے والد نواب نہیں ہیں، لیکن ایک بڑی جائداد کے مالک ہیں، اور خاص حیثیت کے آدمی ہیں، اور یہ روز چائے پینے جانے کا سلسلہ مناسب نہیں ہے۔ کبھی کبھی جایا کیجیے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ جب کھانا کھانے چلے، ہم راستے بھر سوچتے رہے۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا۔

اس رات کوئی بارہ بجا ہوگا کہ ہم کو چاپ محسوس ہوئی۔ شمیم آگئی تھیں۔ ہم نے پہلی بار اس کو دبوچ لیا، اور اتنے پیار کیے کہ وہ بے دم ہوگئی اور نواب ماموں کی تمام باتیں سنا دیں۔ اس نے کہا امی جان نے بھی ہم کو سمجھایا تھا کہ آپ میں ہر خوبی ہے لیکن آپ سنّی ہیں، اسی لیے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے، ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے اور یہ سب باتیں بہت سختی

سے کہی گئی ہیں۔ ابھی ہم لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ نواب ماموں آ گئے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ نواب ماموں نے آہستہ سے کہا بیٹھے بیٹھ جایئے۔ مجھے آپ دونوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں آپ دونوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی دوستی کو دوستی کی حد تک رکھیے۔ اس سے زیادہ کا خواب مت دیکھیے۔ آپ کی والدہ اور شمیم کی والدہ دونوں بہت سخت ہیں۔ کسی سمجھوتے کی مجھے کوئی امید نہیں ہے، اور یہ وقت ملنے ملانے کا نہیں ہوتا، صرف شام کو ملا کیجیے۔ میں کل سے پہرا کھڑا کر دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر اس کے دالان سے کھکھارنے کی آواز آئی۔ وہ کھڑی ہو گئیں اور کہا اب جاؤں گی۔ انا بلا رہی ہیں۔ تین چار دن گزرے تھے کہ شمیم کے والد اور والدہ ایک شام کسی شادی کی تقریب میں کہیں چلے گئے۔ شمیم طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے رُک گئی۔ یہ شاید مارچ کا مہینہ تھا۔ اس لیے کہ ہمارے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ میں بہت اطمینان کے ساتھ اپنا پرچہ کرتا، تھوڑی دیر لائبریری میں بیٹھتا، وہیں لنچ لیتا اور شام کو گھر آ جاتا اور شمیم سے ملاقات کرتا یا ملاقات کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اب شمیم پر بھی نگرانی ہونے لگی تھی۔ اس شام میں آٹھ بجے رات تک بیٹھا رہا۔ اس کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میں کھانا کھانے کے لیے باہر نکلا تو پھاٹک پر نواب کھڑے تھے۔ مجھے غور سے دیکھا اور کہا آپ ایک سائیکل خرید لیجیے۔ کھانا کھانے جانے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں لکھنؤ میں سائیکل چلا نہیں پاؤں گا۔ وہ چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں جب میں کھانا کھا کر واپس آیا تو اس کی انا ایک خط لے کر آئی، شمیم نے لکھا تھا۔ آج پھر ابا جان اور اماں جان اچانک کسی تقریب میں چلے گئے ہیں۔ میرے اوپر دو عورتیں تعینات کی گئی ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ میں ہرگز آپ کے پاس نہ آنے پاؤں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ آ جاتے۔

مجھے نواب ماموں کی تمام باتیں یاد تھیں، لیکن میں نے وہ سب بھلا دیں اور فوراً پہنچ گیا۔ چار بجے صبح کے قریب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شمیم نے کہا ابا جان آرہے ہیں۔ میں اطمینان سے اُٹھ کر اپنی بارہ دری میں آ گیا۔ دوسرے دن چھٹی تھی۔ وہ دوپہر میں آ گئی۔ میں نے پوچھا اماں جان کہاں ہیں۔ اس نے جواب دیا ابا جان کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں گئی ہیں۔ ایک بات کہنے آئی ہوں، آپ میرا ہاتھ تھامتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے باپ سخت شیعہ ہیں اور آپ کی ماں سخت سنّی ہیں، تو کیا آپ میں لڑنے کی طاقت ہے۔ میں نے کہا شمیم تم بتاؤ تم میں لڑنے کی طاقت ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ اگر مجھ میں لڑنے کی طاقت نہ ہوتی تو میں یہ سوال کیوں کرتی۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، مگر آپ کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوں۔ اس بات کا احساس اماں جان کو ہو چکا ہے، لیکن ابا جان لاعلم ہیں۔ ابھی ہم لوگ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ کھکھارنے کی آواز آئی، اور وہ چھلاوے کی طرح اُٹھ کر چلی گئی۔ میں ساری رات، سارے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا، جاگتا رہا اور سوچتا رہا اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہا کہ میری ماں میری محبت میں شمیم کو قبول کر لے گی۔ ایک رات شمیم ہمارے پاس آ گئی۔ وہ رات اس کے کنوار پن کی آخری رات تھی۔ ہم دونوں اپنی تقدیر کا فیصلہ کر چکے تھے۔ دوسرے دن اس کی اماں نے مجھے کھانے پر بلایا۔ کھانا صرف میرے لیے لگایا گیا۔ شمیم اسکول میں تھی۔ اس کی اماں جان نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا میرے بھی ایک بیٹا ہے جو لندن میں ڈاکٹری کر رہا ہے، اور یہ بیٹی ہے جو نویں میں پڑھتی ہے۔ آپ بہت پیارے بچے ہیں۔ آپ کے چہرے پر جو شرافت ہے وہ مجھے متاثر کرتی ہے، لیکن بیٹے شمیم کے باپ وہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے، جو آپ دونوں چاہتے ہیں۔ اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنے آپ کو شمیم سے دور کر لیجیے۔ اس جملے کے بعد انھوں نے کیا کچھ کہا مجھے یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں سن پایا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ شام

گزر گئی۔ رات گزر گئی۔ شمیم کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میرا ایک امتحان ختم ہو چکا تھا، دوسرا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ میں صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ اس کی لنا خط لے کر آئی کہ میں اسکول جا رہی ہوں۔ آپ اسکول کے گیٹ پر ٹھیک دس بجے آجائیے۔ میں انتظار کروں گی۔ ٹھیک دس بجے وہ پھاٹک کے باہر آئی۔ تھوڑی دور چل کر ہمیں تانگا مل گیا۔ ہم حضرت گنج آ گئے اور ایک اسٹوڈیو میں پہنچ کر کئی تصویریں کھنچوائیں۔ بنارسی باغ چلے گئے۔ وہاں تنہائی میں پڑی ہوئی بنچوں پر بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے اور فیصلہ کرلیا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے یا ساتھ ساتھ مریں گے۔ وہیں حضرت گنج میں کھانا بھی کھایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے، اور بالکل جیسے بغاوت کا اعلان کرنے والے تھے۔ کوئی خوف نہیں تھا۔ جب اندھیرا ہونے لگا تب ہم لوگ حضرت گنج سے نکلے۔ نخاس کے کونے پر وہ اُتر گئیں۔ وہ دوسرے تانگے پر بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ جب ہم گھر پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ والدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نواب ماموں نے میری ماں کو جس دن امتحان ختم ہوا تھا، اس کے ایک دن بعد بلا لیا تھا اور شاید انھیں سمجھا بھی دیا تھا۔ وہ رات بہت بھاری گزری۔ ہم ایک دوسرے سے ہرگز نہیں مل سکے، قطعاً نہیں مل سکے۔ صبح اماں مجھ کو لے کر مجسٹریٹ آ گئیں جس کا علم بھی اس کو نہیں ہو سکا۔ بہت سختی کے ساتھ ہم سے مجسٹریٹ میں کہہ دیا گیا کہ شیعہ لڑکی سے ہرگز ہرگز شادی نہیں ہو سکتی اور ہم پر سخت نگرانی شروع ہو گئی۔ ہمیں سیتاپور تک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ڈاک خانے پر ایک آدمی تعینات ہو گیا کہ جو خط ہمارا آئے، ہمارے نام سے آئے، وہ وصول کرلیا جائے اور والدہ کو دے دیا جائے۔

جو آدمی ہمارے بازار کی وصولیابی کرتا تھا، اس وصولیابی سے ہم تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ جمع کرتے رہے۔ ایک مہینے کے اندر ہمارے پاس سو روپے جمع ہو گئے۔ پہلے کارتوس لینے ہم خود سیتاپور جاتے تھے۔ اب کارتوس کا روپیہ

ہمارے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا۔ ملازم سے منگوائے جاتے۔ بہر حال سو روپیہ میں نے بچا کر رکھا اور کہا کہ میں لکھیم پور شکار کھیلنے جاؤں گا۔ میرا پلان تھا کہ میں لکھیم پور جانے کے بہانے لکھنؤ نکل جاؤں گا، لیکن میرے ساتھ دو آدمی کیے گئے، اور حکم ہوا کہ تم ان کے ساتھ لکھیم پور میں اپنے ایک عزیز قاضی فدا حسین صاحب کے یہاں جاؤ۔ خیر مجبوراً ہم ان آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اماں کا مفصل خط مجھ سے چھپا کر قاضی صاحب کو پہنچا دیا گیا۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہنے لگے۔ ایک دن میں نوکروں اور قاضی صاحب کو چرکا دے کر اسٹیشن آ گیا۔ لکھنؤ کی گاڑی آنے میں ابھی وقت تھا۔ میں ایک کونے پر بنچ میں بیٹھا ہوا ٹکٹ کھڑکی کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ قاضی فدا حسین صاحب جن کو میں چچا میاں کہتا تھا، چار پانچ آدمیوں کے ساتھ آ گئے اور مجھے بہت سمجھا بجھا کر گھر لے آئے۔ رات میں بہت پیار سے سمجھاتے رہے اور صبح ایک جیپ پر بٹھا کر ہمیں مچھریٹہ لے آئے۔ اب سختی اور ہونے لگی۔ اب شکار پر کئی آدمی ساتھ جانے لگے۔ شکار پر جتنے آدمی ساتھ جایا کرتے تھے ان میں تین چار اور بڑھا دیے گئے۔ کسی طرح جولائی کا مہینہ آیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ کیے گئے کہ ہم کو لکھنؤ نواب ماموں کے پاس پہنچا دیں اور ان کو ایک لمبا چوڑا خط بھی لکھ کر دیا گیا۔ ہم لوگ چار بجے شام کو نواب ماموں کے سامنے پہنچے۔ وہ دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ بہت غصے سے فرمایا، یہ تو سنا تھا کہ مچھریٹہ کے لوگوں کے کاٹے کا منتر نہیں ہوتا، لیکن آج معلوم ہوا کہ ایسی بھولی بھالی شکل اور ایسے کالے کرتوت۔ پورے محلّے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ میں نے کہا نواب ماموں ہوا کیا؟ فلانے ایک دودھ کی شیشی میں نپل لگا کر لے آؤ۔ بھیا ابھی شیر خوار ہیں۔ میں نے کہا نواب ماموں آپ مجھے کچھ تو بتائیے۔ تو سنیے میری زبان سے کہ شمیم نے زہر کھا لیا اور ان کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ وہ بلرام پور ہوسپٹل میں داخل ہیں۔ تسلّی ہو گئی آپ کی۔

میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں واپس جانے لگا تو نواب ماموں نے
مجھے روکا۔ فرمایا اب آپ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے کہا میں ہاسٹل جارہا ہوں۔
انھوں نے بہت سمجھایا لیکن میں نہیں رُکا۔ میں سیدھا ہاسٹل میں جنگ صاحب کے
پاس پہنچا۔ قیام کیا، آدمیوں کو روانہ کیا۔ وہ سب سن ہی چکے تھے۔ دوسرے دن
میں جنگ صاحب کی موٹر سائیکل پر ان کے نوکر کے ساتھ اس کے محل کے سامنے
سے دو بار گزرا۔ بلاسبب، لیکن دل کو کسی طرح قرار نہ آیا۔ بہت سوچتے سوچتے
یہ دل چاہا کہ میں بلرام پور ہاسپٹل میں شمیم کی ماں سے مل لوں، لیکن آخر آخر
اس فیصلے کو بھی نظرانداز کرنا پڑا، اور میں دوسری گاڑی سے مچھریٹہ آ گیا۔
پورے ایک ماہ تک میں مچھریٹہ میں پڑا رہا۔ بیس بائیس اگست کو لوگوں کے بہت
سمجھانے بجھانے سے لکھنؤ جانے پر رضامند ہوا۔ مہینوں کلاس روم میں بیٹھتا،
لائبریری میں جاتا، ہر جگہ گھومتا، لیکن کسی طرح قرار نہیں ہوا۔

راشد: قاضی صاحب دوسرے عشق کی روداد نے تو دہلا کر رکھ دیا۔ عشق کا ایسا افسوس
ناک انجام کہ ذہن و دل اگر حالات کے نشیب و فراز کے متعلق غور کریں تو
بالکل سکتے میں آ جائیں، لیکن ہم سنجیدگی سے غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان
مخصوص حالات میں یہ عین ممکن تھا۔ مسلکی معاملے عام حالات میں بھی کہاں
سلجھ پاتے ہیں۔ کوشش کے باوجود حالات بہتر ہونے کی سبیل نہیں نکل پاتی اور
یہ تو خیر عشق کا معاملہ تھا۔ اگر حالات مختلف ہوتے اور مسلکی تفاوت کا مسئلہ
سامنے نہ آتا تو کسی بھی صورت یہ انجام نہ ہوتا، لیکن درمیانی راہ کی کوئی گنجائش
ہی نہیں تھی اور عشق تھا کہ کسی بھی دوسری صورت حال کے لیے آمادہ نہ تھا، لہٰذا
ناسازگار حالات نے آنکھوں کو وہ منظر دکھایا جو کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا۔
اب تک آپ کے دونوں عشق کا بیان ہم نے سنا۔ ان میں وصال کے بجائے ہجر کی
تلخیاں ہی سامنے آئیں۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ قاضی عبدالستار کی داستانِ عشق،
روایتی اور عمومی عشق کی لذتوں سے یقیناً مختلف ہوگی، لیکن اس نوع کی مختلف

ہوگی، اس کا قطعی اندازہ نہ تھا۔ میں جانتا ہوں ایسی یادوں کو تازہ کرنا آپ کے لیے آسان نہیں اور آپ کئی دنوں تک تلخیوں کے کرب سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی تیسرے عشق کی روداد سنانے کے لیے آپ کو زحمت دینا چاہوں گا کیوں کہ اس حقیقت سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت آپ کو مقصد کے حصول سے کبھی باز نہیں رکھ سکی ہے۔

قاضی عبدالستار: بھئی ہجر اور وصال کا جہاں تک تعلق ہے، دنیا کی ہر داستانِ عشق وصال کے بجائے ہجر سے ہی وابستہ رہی ہے۔ میری قسمت کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ میرے یہاں عشق کے معاملات اسی نوعیت کے رہے۔ زندگی نے مجھے قدم قدم پر آزمائشوں میں مبتلا رکھا۔ خوشی کے لمحے نصیب ہوئے لیکن بدقسمتی سے تادیر قائم نہ رہ سکے۔ میری زندگی کی یہی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۶۳-۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا۔ کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے۔ ان کا اردلی ایک خط لے کر آیا کہ آج کی رات آٹھ بجے وائس چانسلر لاج تشریف لائیے اور ڈنر میں شرکت فرمائیے۔ میں نے جذبی صاحب اور ایک دو لوگوں سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صرف مجھ کو بلایا گیا ہے۔ سخت اضطراب کے عالم میں حاضر ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ زیدی صاحب نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ نواب صاحب اکبرآباد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اکبرآباد کے لفظ سے جیسے بجلی سی چمک گئی۔ میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ ہماری کوئی شاخ وہاں بھی ہے۔ اتنے میں ایک صاحب، ایک شان دار ادھیڑ عمر کا آدمی جو کڑھا ہوا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے خم ہو کر سلام کیا۔ زیدی صاحب نے فرمایا۔ قاضی عبدالستار۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔ اتنے میں ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ سفید چوڑی دار سوٹ، سفید دوپٹہ، سفید سینڈل اور سارا زیور سفید ہیرے کا۔ کرو شیس بھاری بدن،

کھلتا ہوا گندمی رنگ، مغرور چہرہ، بے قرار آنکھیں۔ یہ آپ کی بہن ہے۔
نواب نے فرمایا۔ اس کا نام... خیر یہ تو خود ہی بتادیں گی۔ بیٹھیے۔ ہم سب
بیٹھ گئے۔ میرے منھ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا،
آج جب میں آیا تو زیدی صاحب نے فرمایا کہ آپ جس کو حکم دیں، ڈنر پر
بلالوں۔ کل میں نے آپ کی ''شب گزیدہ'' ختم کی۔ خیال آیا کہ آپ ہی کو بلاؤں۔
بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ پھر والدہ اور والد سے متعلق سوالات کرتے رہے۔
میں جواب دیتا رہا۔ اتنے میں خادم نے اطلاع دی، میز تیار ہے۔ ہم ڈائننگ روم
میں داخل ہو رہے تھے کہ ایک خادمہ نے صاحب زادی کو مخاطب کیا بٹیا سرکار
یہ لے لیجیے۔ کوئی چیز تھی اس میں۔ معلوم ہوا کہ بٹیا سرکار میز پر میرے بالکل
سامنے تھیں۔ میں کھانا کم کھاتا رہا، آنکھوں سے اس کے حسن کو زیادہ پیتا رہا۔
کھانا کھا کر ہم لوگ کافی روم میں کافی پینے آئے۔ ابھی بیٹھے تھے کہ ایک خادم
حاضر ہوا۔ سرکار کا فون ہے۔ نواب کے ساتھ زیدی صاحب بھی اُٹھ گئے۔
اتنی دیر میں میں نے یہ سوچ لیا کہ اودھ کے کوئی راجہ ہیں۔ تعلو قے دار اور
انھوں نے اپنے آپ کو نواب کہلایا ہے، ورنہ ہندوستان میں اودھ وہ واحد
علاقہ ہے جہاں کا مسلمان رئیس بھی راجہ کہلاتا ہے، اور یہ صاحب زادی
۲۶۔۲۷ سال کی، ان کی دس پانچ اولادوں میں سے ایک اولاد ہیں۔ آپ کا
کیا نام ہے، میں نے ان کو مخاطب کیا۔ وہ میرے صوفے پر ہی بیٹھ گئیں۔
بجائے اپنا نام بتانے کے، فرمانے لگیں آپ کی تمام کتابیں ابا جان کو میں نے
ہی پڑھائیں۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ کل ہم لوگ صبح
جارہے ہیں۔ آپ تو دلی آتے ہوں گے۔ ساری گفتگو وہی کرتی رہی۔ میری آواز
اس کے رعبِ حسن نے اچک لی تھی۔ میں ہوں اور ہاں میں جواب دیتا رہا۔ سچ یہ
ہے کہ میری سماعت بھی متاثر ہو چکی تھی۔ میرے پاس اس وقت صرف آنکھیں
تھیں جو اس کے حسن سے سیراب ہو رہی تھیں اور سارے حواس جیسے ماؤف

ہو چکے تھے۔ مجھے نہیں معلوم وہ اور کیا کہتی رہی۔ اتنے میں نواب صاحب اندر آ گئے۔ میں کھڑا ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بٹیا سرکار کے پاس تھوڑی دیر بیٹھوں، اور دیکھوں اور سنوں، لیکن میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے خم ہو کر ہاتھ ملایا۔ نواب صاحب نے کہا اب کی دہلی آیئے تو میرے پاس ضرور آیئے۔ یہ کہہ کر کارڈ مجھے دے دیا۔ بٹیا سرکار مجھے ورانڈے تک رخصت کرنے کے لیے تشریف لائیں۔ وی سی لاج سے جب میں نکلا تو محسوس ہوا کہ میں وہیں رہ گیا ہوں، صرف جسم کی ایک زندہ لاش ہے جسے ڈھو رہا ہوں۔ ساری رات بٹیا سرکار کے حسن و جمال میں کھویا رہا۔

چند روز گزرے تھے اور بٹیا سرکار کی شخصیت کا جادو دھندلانے لگا تھا کہ ایک دستک ہوئی۔ چار بجے شام کا وقت تھا۔ ملازم نے آ کر بتایا کوئی صاحب آئے ہیں۔ باہر گیا تو بند گلے کا سفید کوٹ، خاکی پتلون، کرمچ کا جوتا، سفید صافہ پہنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ انھوں نے ایک ڈبہ پیش کیا اور ایک لفافہ بھی دیا۔ میں دہلی سے آیا ہوں۔ بٹیا سرکار نے یہ آپ کو بھیجا ہے۔ خم ہوا اور چلا گیا۔ میں نے ڈبہ کھولا تو اس میں کئی قسم کے حلوے تھے۔ خط پڑھا تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ ایک انتہائی احتیاط سے لکھا ہوا عشق نامہ تھا، جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ وہ مجھے ابھی تک فراموش نہیں کر پائی اور میں پہلی فرصت میں اس سے ملاقات کروں۔ جو زخم بھرنے لگا تھا، اس سے لہو بہنے لگا، لیکن نواب کا کارڈ۔ ہز ہائی نس نواب آف اکبرآباد۔ میں سوچتا رہا کہ ملنے جاؤں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے بھی ڈر لگتا تھا کہ میں اتنا بے محابہ ہوں کہ ممکن ہے کہ میں بے خودی میں اسے دبوچ لوں اور نواب کے کسی سپاہی کا شکار ہو جاؤں۔ میں نے اپنے ایک دو دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیے، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ٹیں ہو جائیں گے، پتہ بھی نہیں چلے گا کون تھا۔ راشد صاحب آپ میری بے قراری کو

اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے، جب تک میں پوری بات نہ بتاؤں۔ کافی دن ہوئے شاید ۵۳۔۵۴ کا زمانہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا ہوا تھا۔ حسبِ عادت صبح ناشتہ کر کے میں ہاتھی پر سوار ہوتا اور شکار کو نکل جاتا۔ رات میں گھر میں مہمان آئے تھے۔ تین عورتیں، دو مرد اور دو بچے۔ ایک خاتون کافی دل کش تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے احساس ہوا کہ وہ کافی خوب صورت ہیں۔ میں تھوڑی دور چلا تھا کہ کسی نے کہا کہ جمعرات ہے۔ میں دھک سے رہ گیا کہ اگر والدہ کو معلوم ہو گیا کہ میں جمعرات کو بھی شکار پر جانے لگا ہوں تو ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ بندوقوں کی ضبطی بھی یقینی ہے۔

والد شکار پر تھے اور گھر کا سارا نظم وضبط اماں کے ہاتھوں میں تھا۔ میں بہت خاموشی کے ساتھ باہری زینے سے بالا خانے پر پہنچا۔ بہت آہستہ آہستہ کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں اب آیا ہوں۔ دالان میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کمرے کے اس طرف دالان میں پانی گر رہا ہے۔ پرانے دروازے، چوڑی چوڑی جھریاں۔ نو بجے کا وقت تھا۔ پوری دھوپ دالان میں بھری ہوئی۔ جھانک کر دیکھا تو وہی خاتون جو مجھے اچھی لگی تھیں، غسل فرما رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی خاتون کو برہنہ دیکھا تھا۔ نہا کر انھوں نے چھوٹے چھوٹے کپڑے دھوئے اور آنگن کے تار پر بہت اطمینان سے ڈالتی رہیں۔ یعنی حسنِ بے لباس کا کوئی زاویہ، کوئی پوز ایسا نہیں تھا، جو ہم نے نہ دیکھا ہو۔ پھر انھوں نے سرخ شلوار، سفید جمپر پہنا، سرخ دوپٹہ سر سے اوڑھا اور اندرونی زینے سے نیچے اُتر گئیں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں درد ہونے لگا، حلق خشک ہونے لگا، پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ میں کسی طرح باہر کے زینے سے اندر آیا۔ دو کٹورے پانی پی کر میں اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ وہ خاتون تین دن مہمان رہیں اور میں چوری چوری انھیں دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ یہ پھر نہانے جائیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ

یہ چلی جائیں گی۔ جس دن لکھنؤ سے جیپ انھیں لینے آئی تھی، میں نے ناشتہ کیا اور شکار کے لیے روانہ ہوگیا تا کہ ان کی رخصت کا قیامت خیز سماں نہ دیکھ سکیں۔ جب اماں نے شادی پر بہت زور دیا تو جی چاہا کہ ویسی ہی خاتون میری بیوی بن کر آئے۔ خاندانوں میں جہاں تک میری رسائی تھی، میں نے سب کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی، لیکن کہیں کامیابی نہیں ملی۔ بٹیا سرکار کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں سے دیکھے جانے والے خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔

ہر تیسرے چوتھے مہینے ایک شخص آتا اور تحائف پیش کر دیتا۔ عمدہ قسم کے حلوے، گیلانی خشکا اور زردہ۔ تین چیزیں وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے بڑی تعداد میں بھیجتیں۔ جب میری کوئی کتاب چھپتی تو ان کا ملازم ایک خط کے ساتھ کتاب لاتا کہ اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں ہر کتاب پر بٹیا سرکار کے لیے لکھ کر بھیج دیتا جس کا جواب نامہ بھی ایک آدمی لے کر آتا۔ بہت خوشی کا اظہار کیا جاتا۔ کچھ بہت قیمتی تحفے بھی آئے جو میں نے واپس کر دیے، کیوں کہ وہ میری بساط سے بہت زیادہ تھے۔ پھر ایک صاحب زادے نے ایم اے میں داخلہ لیا، جو اُن کے پروردہ تھے اور پاس ہوتے ہی وہ ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ان کے وسیلے سے بھی تحائف اور خطوط کا سلسلہ چلتا رہا۔ دو ایک بار میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں بٹیا سرکار سے ملوں گا لیکن عین وقت پر منھ چرانا پڑا۔ ہمت نہیں ہوئی۔ ایک بار میں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں کسی کام سے شام کے وقت پہنچا۔ صبح میٹنگ تھی۔ میں نے سوچا کہ رشید کے گھر ٹھہر جاؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ بہت تواضع کی اور اجازت لے کر چلنے لگا تو میں نے کہا کہ اگر آپ نے کھانے میں تکلف کیا تو میری آمد پہلی ہی نہیں آخری بھی ہوگی۔ ایک دن پہلے میں کلکتہ سے آیا تھا۔ ابھی تھکن اُتری نہیں تھی کہ دہلی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ بدن جیسے چور چور ہوگیا۔ میں نے پردے برابر کیے۔ اپنے بیگ سے وہسکی کی بوتل نکالی۔ ہر چند کہ ابھی عصر کی اذان ہوئی تھی، لیکن میں شروع ہوگیا۔ بقول غالب کے،

بدن میں زندگی دوڑ گئی، حواس تر و تازہ ہو گئے۔ ہم اپنے خوابوں کی دنیا میں آرام سے بیٹھے تھے کہ رشید کی آواز آئی، سر ادھر دیکھیے کون آیا ہے۔ نگاہ اُٹھائی تو قیامتِ مجسم کھڑی تھی۔ کمر تک خم ہو کر اس نے سلام کیا، میں عالمِ تحیر میں اُٹھ پڑا اور بے خودی میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا آپ نے مجھے پہچانا؟ میں نے بغیر کسی ارادے کے صرف بدحواسی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ کاش بٹیا سرکار کا دیدار اور تعارف ایک ساتھ نصیب ہوا ہوتا۔ ہم نے یہ جانا تھا کہ آپ اودھ کے کسی نواب کی دس پانچ اولادوں میں سے ایک اولاد ہوں گی تو ملنے کی آرزو کی تھی، لیکن رشید سے معلوم ہوا کہ آپ دو دو حکمراں ریاستوں کی مالک ہیں۔ آپ آسمان، ہم زمین اور زمین بھی ایسی جو اُٹھائی جا چکی۔ ہمارے اور آپ کے درمیان گیارہ گیارہ توپوں کی سلامی کی ریاستیں دیواروں کی طرح کھڑی ہیں۔ ہم کو اپنے اوپر حیرت تھی کہ ہم کیسے بول رہے ہیں۔ ایک بار اس کی طرف گھوم کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ بٹیا سرکار یہ آنسو دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔ سر، یہ آنسو نہیں ہیں، آنکھیں برسوں سے جس کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں، اس کی دید پر خوشی سے یہ موتی لٹا رہی ہیں۔ بٹیا سرکار آپ کو میرے سر کی قسم۔ یہ قسم مت دیجیے۔ خدا کے واسطے یہ قسم مت دیجیے۔ واپس لیجیے اس لیے کہ مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں۔ وہ گریۂ عشق میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ہم نے بھی سوچا کہ یہ بادل برس جانے دو۔ پردے کے پیچھے سے آواز آئی، بٹیا سرکار میں چائے لے آؤں؟ لے آؤ، وہ ذرا سا ہٹ گئی۔ ہم نے تیسرے گلاس کے آخری گھونٹ پیٹ میں اُتارے اور ان کی دید میں مبتلا ہو گئے۔ چائے بنائی، پیش کی، اس طرح پیش کی جیسے کہ یہ میرے تمام خوابوں کی تعبیر ہو۔ جب وہ برتن لے کر اندر جانے لگیں تب معلوم ہوا کہ ہم چائے پی چکے۔ رشید نے بہت کوشش کی کہ وہ کشتی تھام لے، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ کمرے میں آتے ہی رشید باہر چلا گیا۔

دروازہ بند کرلیا۔ وہ کھڑی تھیں۔ میں نے ان کا چہرہ سمیٹ لیا۔ اس نے دیکھا اور کہا ہم کو تو آپ نے اپنے تخاطب کے قابل بھی نہ جانا۔ کسی خط کا جواب بھی نہیں ملا۔ بہت سے تحفے وصول نہیں کیے گئے اور اب آپ اتنے دُلار کر رہے ہیں۔ میں اسے کیا سمجھوں؟ میں نے کہا بٹیا سرکار آپ کے سر کی قسم۔ زمین، آسمان تک پہنچنے کی ہمت نہیں کرسکی۔ یہ تو آپ کی محبت ہے کہ زمین پر اُتر آئیں، ورنہ میں کس قابل۔ مت کہیے ایسی باتیں۔ ایک بات کہوں۔ فرمایئے۔ ہم آپ سے ملنے نہیں آئے ہیں۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ محل میں چلیے۔ بٹیا سرکار، رات کے وقت مجھے اپنے ساتھ محل لے جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ ہم بدنامی اور رُسوائی کے لیے تیار ہیں، لیکن آپ سے دور رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بدنامی اور رُسوائی کا سبب بھی تو میں رہوں گا جو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ میری بساط نہیں ہے۔ وہ سوچتی رہی، اس کے آنسو بہتے رہے، اس کا چہرہ میں نے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ وہ سسکتی رہی، پھر سر اُٹھایا اور کہا اچھا ایک بات اور ہوسکتی ہے۔ یہ گھر بھی ہمارا ہی ہے۔ ہم بابا سرکار سے اجازت لے کر یہیں آپ کے پاس قیام کرسکتے ہیں۔ اس میں تو آپ کی رُسوائی نہیں ہے۔ بٹیا سرکار زندگی میں پہلی بار اگر میں آپ سے کچھ کہوں گا تو آپ مان لیں گی۔ سر ہم تو اپنی سب دیواریں توڑ کر اور کشتیاں جلا کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ حکم دیجیے۔ مفارقت کے اس لمبے عرصے میں میری خاطر سے چند گھنٹوں کا پیوند لگا لیجیے۔ صبح ریڈیو اسٹیشن سے میں سیدھا آپ کے محل آؤں گا۔ بہت دیر تک بحث و تمحیص کے بعد وہ رضامند ہوئی۔ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور رشید سے کہا جب تک فرخ زاد، سر کے لیے کھانا لے کر نہیں آتی، آپ دسترخوان نہیں چنیں گے اور بیگ کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیں گے۔ بٹیا سرکار میری کیا مجال؟ ساڑھے تین گز کے دوپٹے سے انھوں نے اپنا پورا بدن چھپا لیا۔ میرے قریب آئیں۔ یہ وعدہ جو آپ نے کیا ہے، دوسرے

وعدوں کی طرح بے وفا تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا بندوق کی نال پر بھی نہیں۔ رشید کے ساتھ وہ چلی گئیں۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بج رہا تھا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ اگر بابا سرکار کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو سکتا ہے، کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ رشید آ گیا۔ رشید کیا بابا سرکار محل میں تھے؟ میں نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ بٹیا سرکار نے مجھے ڈیوڑھی سے واپس کر دیا کہ آپ تنہا ہیں۔ ابھی ہم بیٹھے کل کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک خوب صورت سی عورت بڑا سا ناشتہ دان اور ایک بیگ لے کر حاضر ہوئی۔ دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں اور بولی سر، یہ بٹیا سرکار نے خاصہ بھیجا ہے اور اس میں عرق گلاب ہے۔ مجھ کو اجازت ہو تو میں چلی جاؤں۔ میں نے اسے رخصت کیا۔ میں نے عرقِ گلاب کی بوتل کھولی جس میں پرچہ رکھا ہوا تھا۔ French Tin عرقِ گلاب کی بوتل میں اس لیے بھیجی جا رہی ہوں کہ اگر رشید کی بجّن والدہ کی نظر پڑ بھی جائے تو وہ کچھ سمجھنے سے عاجز رہیں۔ میں ابھی سے انتظار میں مبتلا ہو چکی ہوں۔

ہم اور رشید ریڈیو اسٹیشن سے نیچے اُترے تو ایک لمبی سی گاڑی ہماری منتظر تھی۔ رشید نے ہم کو بٹھا دیا۔ ایک بڑی سی عمارت کی پھاٹک پر ڈرائیور نے تین ہارن دیے۔ جب گاڑی پورٹیکو میں پہنچی تو ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور کئی عورتوں کے جھرمٹ میں بٹیا سرکار طلوع ہوئیں اور فوراً آ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ تشریف لائیے سرکارِ والا تبار۔ ہمارا غریب خانہ آپ کی میزبانی کا منتظر ہے۔ ہم باہر آئے۔ تو یہ ہے آپ کا غریب خانہ۔ معلوم نہیں دولت خانہ کسے کہتے ہیں۔ نگاہ اُٹھائی۔ سرخ زربفت کی جوتیاں، سرخ ریشم کا چوڑی دار، پنڈلیوں پر کسا ہوا، سفید جمپر منڈھا ہوا اور بہت بڑا سا دوپٹہ۔ سرخ دوپٹہ جو چہرے پر ہالے کی طرح چھایا ہوا تھا۔ سر کے تاج سے پیروں کے پازیب تک سارا زیور سرخ تھا۔ ڈیوڑھی کی پوشش بھی سرخ تھی۔ چند قدم چل کر بٹیا سرکار نے ہمیں اپنا بلیرڈ روم دکھایا۔ پھر ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ میں

خاموش بیٹھا انھیں دیکھ رہا تھا۔ پوچھا اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہم نے آسمان کو ان جوتیوں میں ستارے ٹانکتے دیکھا ہے۔ ہم نے شراب کو ان آنکھوں سے نشے کی بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ سر۔ شکار تو قدموں میں پڑا ہے۔ یہ اس پر تیر اور تیر کیوں چلا رہے ہیں۔ آواز آئی بٹیا سرکار سوپ تیار ہے۔ وہ کھڑی ہوئیں، ابھی انتظار کرو۔ ہم بھی کھڑے ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم انھیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر ان کے چہرے کی کتاب دونوں ہاتھوں میں لے لی، اور ہونٹوں سے اوّل سے آخر تک تلاوت کرلی۔ تم کو یقین آیا کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔ ۲۷ سال کی ایک لڑکی جس کی سہیلیاں اسے موٹی بھی کہتی ہیں، اگر خوب صورت ہوسکتی ہے تو ہم ہیں۔ تھوڑی دیر تک یونہی گفتگو ہوتی رہی۔ سوپ پینے کے بعد ہم لوگ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو دیکھا نواب صاحب دوسرے دروازے سے داخل ہورہے ہیں۔ ہم نے بہت خم ہوکر آداب کیا۔ انھوں نے ہمیں سینے سے لگالیا۔ بٹیا سرکار نے آج تیسری بار آپ کے لیے گاڑی بھیجی۔ بابا سرکار ہر مرتبہ میرے ساتھ کچھ ایسے لوگ ہوتے جن کو میں بٹیا سرکار سے ملا نے نہیں لاسکتا تھا۔ ہم نے سنا تھا کہ آپ کمیونسٹ ہیں۔ آپ نے ہم کو بابا سرکار کہا تو ہم کو خوشی ہوئی۔ اس لیے کہ کمیونسٹ حضرات تخاطب میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری بیٹی کا اتنا خیال کیا ہم کو مزید خوشی ہوئی۔ بسم اللہ کیجیے، ہم ڈائننگ روم میں قد آدم تصویریں دیکھ رہے تھے کہ ملازمہ نے ڈش بڑھائی اور آہستہ سے کہا لے لیجیے۔ ہمارے سامنے گنگا جمنی پلیٹ (سونے چاندی کی پلیٹ) اُلٹی رکھی تھی۔ ہم نے چمچا اسی پر انڈیل دیا۔ بٹیا سرکار جو اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی تھی، جھک کر اُٹھیں، لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی خادمہ نے انتہائی احتیاط سے پلیٹ اُٹھالی اور دوسری لگادی۔ بابا سرکار کی آواز بلند ہوئی۔ بٹیا سرکار آپ وہیں بیٹھ جائیں، اور اب وہ جواہر پوش ہاتھ ہماری پلیٹ کی خدمت کرنے لگے۔

پروفیسر صاحب پہلے یہ بتائیے کہ گھر میں والدین آپ کو کیا کہتے ہیں۔
میں نے کہا بابا سرکار مجھ کو بھیا کہتے ہیں۔تو ٹھیک ہے۔صاحبان کی تو یہاں بھیڑ لگی ہوئی ہے آپ کھو جائیں گے،اس لیے آج سے نہیں، ابھی سے آپ کو بھیا سرکار کہا جائے گا۔ایک بات اور۔ ہمارے محل کا قاعدہ ہے کہ مہمان اپنی مرضی سے آتا ہے لیکن جاتا ہماری مرضی سے ہے۔کم از کم، کم از کم تین دن کے بعد۔ بابا سرکار یہ کیسے ہوسکتا ہے۔جس وقت آپ نے گاڑی پر قدم رکھا ہے، ہم نے اسی وقت آپ کے وائس چانسلر کو فون کیا تھا کہ آپ کو کم از کم تین دنوں کی ڈیوٹی لیو (Duty leave) منظور کر لی جائے۔انھوں نے ازراہِ عنایت دس دنوں کی Duty leave منظور کر لی۔اس لیے یہ موضوع ختم ہوگیا۔کھانا ختم ہوا۔کئی عورتوں کی موجودگی میں بٹیا سرکار میرے ہاتھ دھلانے بڑھیں۔ میں نے منع کیا۔ بابا سرکار مسکرائے۔کرنے دیجیے پروفیسر صاحب۔کسی کی تو خدمت کریں۔ ہاں ایک بات آپ سے اور کہنا ہے۔ ہمارا پروگرام کل رات بن چکا تھا باہر جانے کے لیے۔ ہر چند کہ آپ کی موجودگی میں باہر جانا آدابِ میزبانی کے خلاف ہے، لیکن مجبوری ہے اور پھر مہمان آپ میرے تھوڑے ہی ہیں، بٹیا سرکار کے ہیں۔ ہم کافی روم میں آپ کے ساتھ چلتے لیکن ہمارے پاس وقت نہیں ہے، ہم کو اجازت دیجیے۔ بٹیا سرکار نے فرمایا۔ بھیا سرکار میں بابا سرکار کو ڈیوڑھی تک پہنچانے جارہی ہوں۔ میں نے کہا ہم بھی چلیں گے۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ ڈیوڑھی پر گاڑی لگی تھی۔انھوں نے ملازم کو آواز دی۔ حکم دیا کہ ہماری عدم موجودگی میں محل بھیا سرکار کے حکم کا پابند ہوگا۔وہ چلے گئے۔ ہم چائے کے وقت تک زبان سے بولتے رہے اور دماغ سے سوچتے رہے کہ اس بے محابہ سپردگی کا سبب کیا ہے۔ایسا تو کہانیوں میں بھی نہیں ہوتا۔ہم اگر کوئی ناول لکھ رہے ہوتے تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں لکھ سکتے تھے۔ جب شراب آئی

تو جو عورتیں کھڑی تھیں، میں نے انھیں ہٹنے کا اشارہ کیا اور بٹیا سرکار کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ کو میرے سر کی قسم ہے، سچ سچ بتایئے کہ آپ کی بے پناہ سپردگی کا سبب کیا ہے۔ ایسا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ گردن جھکائے چپ بیٹھی رہی۔ پھر ہمارے شدید اصرار پر بولی، ہماری نانی جان کے ایک پیر تھے جنھوں نے نانی جان کو ایک وظیفہ بتایا تھا کہ اگر کوئی شخص نئے کپڑے پہن کر تہجد کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھے تو اس کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ دوران حال بابا سرکار شکار میں زخمی ہوئے۔ ہم نے وظیفہ پڑھا۔ جواب ملا کیوں پریشان ہوتی ہے۔ نواب چند روز میں گھر آ جائیں گے۔ ہماری والدہ کا Appendix کا آپریشن تھا، ہم نے وظیفہ پڑھا۔ جواب ملا کہ مشیتِ الٰہی میں کسی کا دخل نہیں۔ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دو ماہ قبل جب ہم بہت بے قرار ہوئے تو ہم نے وظیفہ پڑھا کہ آپ ہمارے گھر آئیں گے کہ نہیں۔ جواب ملا کیوں پریشان ہوتی ہے۔ وہ تیرا دولہا ہے۔ آئے گا کیسے نہیں، اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ کیا یہ بات بابا سرکار کو معلوم ہے؟ اس محل کی کون سی ایسی بات ہے جو بابا سرکار سے راز رہ سکتی ہے۔ بابا سرکار کہیں نہیں گئے ہیں، دہلی میں ہیں۔ انھوں نے ہم کو مکمل آزادی اور تنہائی دینے کے لیے محل چھوڑا ہے۔ ان کی خادماؤں کو حکم ہے کہ آپ کو یہ راز معلوم نہ ہو اور آپ کی پوری خاطر تواضع کی جائے۔

تین دن کے بعد بابا سرکار آ گئے اور ہم کو حکم دیا کہ آپ پوری چھٹیاں یہیں گزاریے، اور بٹیا سرکار کو حکم ہوا کہ آپ ہماری عدم موجودگی میں جس طرح بھیا سرکار کو رکھتی تھیں، اسی طرح رکھیں۔ دس دن کے بعد ہم گھر آئے تو معلوم ہوا کہ ہم شاگرد پیشہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پھر چھٹیاں شروع ہو گئیں اور ہم پھر دہلی چلے گئے۔ چند روز بعد خاموشی کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ ہم نے بٹیا سرکار

کی تجنن عرفیت کے کئی نام دیے تھے۔ تاجو، تاجن، تاجی اور حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی ہم نے اسے تاجم سلطان کہا۔ ہمارا ناول تاجم سلطان اس بے نظیر محبت پر مبنی ناول ہے۔ چند روز گزرے تھے کہ ان کی ایک عزیزہ نے جنھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پیغام دیا تھا، لیکن بٹیا سرکار نے انکار کر دیا تھا، انھوں نے اپنے یہاں دعوت دی۔ وسنت کنج میں ان کی کوٹھی تھی۔ ہم اور بٹیا سرکار گئے۔ اس عورت کو دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ یہ عورت ناگن ہے، ڈائن ہے، لیکن میں کسی سے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ جلدی جلدی ہم نے کھانا ختم کیا اور بٹیا سرکار کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس عورت نے چلتے چلتے بٹیا سرکار کو ایک پان کھلایا۔ دوسرا میرے منھ میں رکھ دیا بہت محبت کے ساتھ۔ بٹیا سرکار سے گزارش کی کہ اس کی پیک مت تھوکیے گا۔ دیکھیے کتنا مزہ آتا ہے۔ گھر آ کر میں نے کہا کہ یہ عورت ناقص ہے اور یہ پورا واقعہ میں نے بابا سرکار کو بتا دیا۔ وہ چپ بیٹھے رہے۔ دوسرے دن ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ بٹیا سرکار کے بہت سے ٹیسٹ ہوئے، لیکن کسی مرض کا پتہ نہیں چلا۔ چند روز گزرے تھے کہ بٹیا سرکار کو چکر آنے لگے، اور دل جیسے بیٹھا جانے لگا۔ ایک ہنگامہ ہو گیا۔ ڈاکٹروں کی بھیڑ لگ گئی، لیکن کوئی مرض تشخیص نہیں ہو سکا۔ بابا سرکار کے ایک دوست مہاراج دھراج جن کو بٹیا سرکار، پاپا جی مہاراج کہتی تھیں، انھوں نے انگلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا۔ بابا سرکار تیار ہو گئے۔ میرے پاسپورٹ کی پوری کوششیں ہونے لگیں۔ اسی رات بٹیا سرکار نے غسل کیا۔ نیا جوڑا پہنا۔ تہجد کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھا۔ مجھے حکم ہوا کہ آپ میری طرف مت دیکھیے۔ میں نے کہا یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں بھاگ کر کمرے میں پہنچا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ بہت مشکلوں سے وہ یہ کہہ سکی کہ مجھے موت کی بشارت ہوئی ہے۔ کہا گیا کہ مشیتِ الٰہی میں کسی کا دخل

نہیں ہوسکتا۔ تین دن کے اندر اس کا انتقال ہوگیا۔ میں اس کے سوئم کے بعد بجائے علی گڑھ جانے کے پھریٹہ چلا گیا۔ بابا سرکار کے کئی خط آئے، لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ چلے گئے۔

راشد میاں یہ تو ڈھانچہ ہے میری محبت کی کہانی کا۔ پورا ناول ''تاجم سلطان'' پڑھیے۔ لاحقے اور سابقے جو ناول کی بنت میں استعمال ہوئے ہیں، انھیں نظرانداز کردیجیے۔ باقی تمام کہانی ایک ایک حرف سچ ہے۔ بٹیا سرکار کے انتقال کے بعد دو برس کیسے گزرے، یہ ناقابلِ بیان ہے۔ بس اس طرح گزرے جیسے کوئی کچے ریشم کی چادر ببول کے کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہو۔

راشد: آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اس واقعے اور اس وضاحت کے بعد ''تاجم سلطان'' کی باقاعدہ قرأت ناگزیر ہوگئی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کی آواز بھرائی ہے۔ آپ کی آنکھیں نم ناک دکھائی دے رہی ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی قصہ افسوس ناک انجام سے دوچار ہوگیا، اور بعد کے حالات کو بیان کرنا خود آپ کے لیے مشکل ہو رہا ہے تو میں زور نہیں دوں گا کہ آپ صبر آزما لمحات کو طول دیں۔ آپ نے اشارہ کیا ہے کہ عشق کے تمام قصوں کا اختتام خوش گوار نہیں ہے، اس کے باوجود میں آپ کو زندگی کی چوتھی اور آخری عشق کی روداد سنانے کی زحمت دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ باب مکمل ہوسکے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ابتدا میں جو چمک آپ کی آنکھوں میں دکھائی دے گی وہ روداد کے اختتام میں کافور ہوجائے گی، لیکن اس بات کی تسلی بھی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی جن لوگوں کے قدم نہیں ڈگمگاتے، ان لوگوں میں آپ ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: چوتھے عشق کا معاملہ میرے لکچرر ہونے کے بعد کا ہے۔ لکچرر ہونے کے بعد شادی کا دباؤ بڑھتا گیا۔ شمیم کی موت نے مجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور شادی میں میری کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، لیکن والدہ کے اصرار پر والدہ کے کزن کی بیٹی سے شادی ہوگئی۔ بیگم صاحب کا یہ مسئلہ تھا کہ وہ راجہ نواب چودھری محمد محمود کی

اولاد اکبر تھیں۔ پانچ سو بیگھہ زمین ان کے نام تھی۔ ان کا غرور نا قابلِ بیان تھا اور منکسر مزاج ہم بھی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو Egos ٹکرائے۔ ایک شام انھوں نے فرمایا کہ میں ''کرسی'' جاؤں گی۔ میں نے کہا ابھی نہ جاؤ۔ ہم انتظام کر دیں گے تب جانا۔ یہ کہہ کر ہم کلب چلے گئے۔ ان کا ایک ملازم بھی ساتھ رہتا تھا۔ ہم کلب سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وہ چلی گئیں۔ سخت ناگوار ہوا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ دونوں بچے جو چھوٹے تھے، میرے ہی پاس تھے۔ میں نے اپنی والدہ کو بلا لیا تا کہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ ان کو لینے کے لیے ماموں گئے، میرے چچا گئے، میری والدہ گئیں، لیکن ان کی ضد تھی کہ میں لینے جاؤں۔ میں نے انکار کر دیا۔ نہ میں انھیں لینے گیا، نہ ہی وہ واپس آئیں اور ان سے تعلقات کا سلسلہ یوں ہی ختم ہو گیا۔

۱۹۷۱ء میں میری بہن کے ساتھ ایک لڑکی آئی۔ وہ چائے پی رہی تھی جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بہت اچھی لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایم اے اردو میں داخلہ لینے آئی ہے، اور کسی طرح میری بہن سے متعارف ہو گئی ہے۔ ایم اے میں داخلہ ہو گیا۔ وہ کلاس میں جگمگاتی رہی۔ انتہائی اسمارٹ اور ذہین، خوش مزاج۔ میں نے آزمانے کے لیے بی اے کی کاپیاں دیکھنے کے لیے بلایا۔ وہ اتوار کو صبح آ گئی اور شام تک اس نے کاپیاں دیکھیں۔ بہت تکلف سے کھانا کھایا۔ اسی طرح چائے بھی پی۔ جتنا وقت گزرتا گیا، وہ قریب آتی گئی۔ ایم اے فائنل کا امتحان دے کر جب وہ جانے لگی تو میں نے پوچھا کہ تم دہلی کب جاؤ گی۔ اس نے کہا پرسوں میری سہیلیاں جا رہی ہیں، میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم بلایا اور کہا کہ اگر تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو تو کل دس بجے آ جانا اور اگر رضامند نہیں ہو تو ہرگز مت آنا۔ وہ چلی گئی، بغیر کوئی جواب دیے۔ دوسرے دن ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور دس بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک دس بجے وہ آ گئی۔ پہلی بار

میں نے اس کو ہاتھ لگایا جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کچھ دیر کے بعد صرف اتنا کہا کہ شادی کے لیے صرف میری رضامندی کافی نہیں ہے۔ میرے ماں باپ کا مسئلہ بھی تو ہے۔ ہر چند کہ آپ میں بہت سی خوبیاں ہیں، عمر کا بھی کوئی مسئلہ میرے نزدیک نہیں ہے، لیکن دو بچوں کے ساتھ دوسری شادی۔ ماں باپ آسانی کے ساتھ منظور نہیں کریں گے، جب کہ میرے دو پیغامات موجود ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔ وہ میرے انتخاب سے خوش ہوئیں اور فرمایا کہ میں دہلی جاؤں گی اور ان کے ماں باپ سے بات کروں گی۔ چھٹیاں گزر چکی تھیں۔ میں نے دوسرے پتے پر جو اس نے بتلایا تھا، خط لکھا کہ تم ریسرچ میں داخلہ لینے کے بہانے علی گڑھ آجاؤ۔ جب تک ہمارے ماں باپ رضامند نہیں ہو جاتے، کم سے کم ہم مل تو سکیں۔ وہ آگئی۔ سرور صاحب کی نگرانی میں وہ ریسرچ اسٹوڈنٹ ہوگئی اور میرے ہی گھر میں رہنے لگی۔ برائے نام اس کا داخلہ ویمنس کالج ہوسٹل میں تھا، رہتی وہ میرے ساتھ تھی۔ خیر دو تین مہینے کی تگ و دَو کے بعد ستمبر ۱۹۷۳ء میں ہماری شادی ہوگئی، اور پوری عمر میں زندگی پہلی بار خوب صورت معلوم ہوئی۔ گھر میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اتنی پیدا ہوئی کہ کلب ناغہ ہونے لگا۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں بچپن سے اپنے والد کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ ان کی جدائی کا غم جیسے میری زندگی کا حصہ بن گیا اور شاید ہی کوئی رات ایسی گزرتی ہو جب میں ابو جان کو نہیں یاد کرتا ہوں۔ کوثر سے شادی کے بعد یہ غم جیسے کم ہوگیا۔ وہ آگ مدھم ہوگئی۔ شادی سے قبل بھی کچھ دلچسپ واقعات ہوئے۔ پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تو خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار نے پروفیسر آل احمد سرور سے فرمایا کہ طالب علم سے شادی کرنا بہت غلط ہے اور یہ مقدمہ بداخلاقی یعنی moral tarpitute کے حدود میں آتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرور صاحب نے کیا کیا

اور کیا کہا۔ یہ واقعہ جب کوثر کو معلوم ہوا تو اس نے اپنا داخلہ کینسل کرا دیا تھا۔
میرا جی چاہتا تھا کہ کوثر میرے ساتھ بلیرڈ کھیلے۔ بلیرڈ روم عام طور پر مغرب کے وقت کھلتا تھا۔ ایک روز چار بجے میں کوثر کو لے کلب پہنچ گیا۔ بلیرڈ روم کھلوایا اور اس کو بلیرڈ سکھانے لگا۔ تین چار دن ہوئے تھے کہ وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ بلیرڈ روم میں تشریف لے آئے۔ میرا تعارف ہو چکا تھا۔ وہ ٹینس کھیلنے آتے تھے، لیکن کسی وجہ سے، بلکہ میرا خیال ہے کہ کسی شکایت کی بنا پر بلیرڈ روم میں آ گئے۔ میں نے کیو رکھ دیا۔ کوثر بھی سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے عرض کیا کہ سر میرا نام قاضی عبدالستار ہے۔ اردو ڈپارٹمنٹ میں؟ جی سر۔ آپ کی تعریف؟ میں نے عرض کیا یہ میری ہونے والی بیگم ہے۔ مسکرائے، ''نائس'' بہت زور سے کہا۔ سامنے کھڑے ہوئے بیرَرس میں سے ایک کو بلوایا۔ اس کو دس روپے کا نوٹ دیا کہ اس کا خوردہ لے آؤ، اور میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ بلیرڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں جو بہت خراب کھیلنے والا تھا، اس کے ساتھ وہ کھیلنے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں بیرَر خوردہ لے کر آ گیا۔ انھوں نے ایک پاکٹ سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔ اس پر ایک روپیہ رکھا اور چار قدم چل کر ذرا سا خم ہو کر کوثر سے کہا would be بیگم صاحبہ اسے قبول فرمائیے۔ میں یہ منظر دیکھ کر ہل گیا۔ میں سخت پریشان تھا لیکن ان کے ساتھ آدھا گھنٹہ کھیلتا رہا۔ ٹھیک آدھے گھنٹہ کے بعد وہ مجھ سے جیت کر چلے گئے۔ جب طالب علموں سے ان کا جھگڑا ہوا اور ان کی انگلی زخمی ہوئی اور وہ ہسپتال میں زیر علاج ہوئے اور کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تب کوثر سے میری شادی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں پھلوں کا ایک بکٹ لے کر ان سے ملنے گئے۔ ملازم نے صاف انکار کر دیا کہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میں نے زور سے کہا کہ آپ میرا پرچہ دے دیجیے۔ نواب صاحب کا جی چاہے گا تو بلائیں گے ورنہ منع کر دیں گے۔

ملازم فوراً واپس آیا۔ آیئے۔ انھوں نے مسکرا کر ہم دونوں کے سلام قبول کیے۔ کوثر نے پھلوں کی بکٹ ان کے سرہانے رکھ دی۔ مسکرائے۔ ایک سو ایک روپیہ یاد ہے آپ کو۔ اس نے جواب دیا سر میری کیا بساط، وہ روپیہ تو میرے پاس یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ ہم دونوں کو چائے پلوائی گئی اور ہم واپس آئے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے فرمایا، جب آپ کا جی چاہے، چلی آیا کیجیے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بہت گھبراتا تھا۔ میاں خاں (چپراسی) نے بتلایا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے اور وہ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ہم دونوں شام کو پہنچ گئے۔ کوثر سلیکس پہنے ہوئے تھی۔ استاد فراک چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سامنے دوسری آرام کرسیوں پر تھے۔ بیگم صاحب کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ اپنے ملازم سکندر کو انھوں نے حکم دیا کہ میرے لیے پیڑے لائے۔ ہم لوگوں نے بہت تکلف سے ایک ایک پیڑا کھایا۔ جب چائے پی رہے تھے تو رشید صاحب نے فرمایا آپ کے شوہر کی تحریریں تہذیب کے بیان سے جگمگاتی رہتی ہیں، لیکن آپ پر تہذیب کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ مغربی لباس ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ آپ مسلمانوں کا لباس پہن کر آتیں۔ ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔ ایک ایک پیڑا اصرار کر کے پھر کھلایا۔ ہم دونوں چپ چاپ رخصت ہوئے۔ چند روز کے بعد میں نے میاں خاں سے کہا کہ تم سکندر سے پوچھو کہ ہم لوگ آئیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ سکندر نے جواب دیا، آپ کا جب جی چاہے چلے آیئے۔ اس بار کوثر شلوار سوٹ پہن کر دوپٹے میں سر کو چھپا کر سلام کے لیے خم ہوئیں تو رشید صاحب خوش ہوئے۔ کسی کو آواز دی آج دو دو پیڑے کھائیں گے یہ دونوں۔ لے کر آؤ، اور ہم لوگوں کو دو دو پیڑے کھلائے گئے۔ چائے پلائی گئی، خوش ہوئے۔ بہت مسکرا کر سلام قبول کیا اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ آج بھی نواب صاحب یاد

آتے ہیں، رشید صاحب یاد آتے ہیں۔

کوثر کی آمد سے ہمارا گھر جگمگانے لگا۔ پورے آٹھ برس ہم نے بہت آرام کی زندگی گزاری۔ ۱۹۸۰ء میں ہم نے فکشن پر ایک سمینار کیا۔ اس سمینار کی دعوت و تنظیم میں کوثر اپنے آپ سے گزر گئیں۔ پہلا اٹیک پاگل پن کا یہیں ہوا۔ جتنے ڈاکٹر ہماری دسترس میں تھے، ان سب کو ہم نے دکھلایا۔ سبھوں نے کچھ بتایا نہیں، علاج کرتے رہے۔ لاحاصل علاج کرتے رہے۔ ایک روز جذبی صاحب نے فرمایا کہ تم کے. پی. شاہ کو بھی دکھلاؤ۔ میں شہر گیا۔ کے. پی. شاہ سے گزارش کی۔ جب ان کا مطب ختم ہوا تب وہ تانگے پر بیٹھ کر اور مجھے آگے بٹھا کر روانہ ہوئے۔ کوثر کو دیکھتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ دوسرے کمرے میں چلے جایئے۔ پورے چالیس منٹ وہ ان سے باتیں کرتے رہے اور جب انھوں نے مجھے آواز دی اور میں چائے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ ایسا مرض ہے آپ کی بیگم کو کہ ہر ڈاکٹر نے سمجھ لیا ہوگا، لیکن آپ کو بتلایا نہیں۔ میں بھی نہیں بتلاتا لیکن چوں کہ آپ کو جذبی صاحب نے میرے پاس بھیجا ہے، اس لیے میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔ آپ کی بیگم mentally retorted ہیں اور یہ مرض hereditary ہے اور جہاں تک میرا علم ہے، لاعلاج ہے۔ مجھ پر ایک عالم گزر گیا۔ انھوں نے کہا آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں کچھ دوائیں دوں گا۔ اس سے مرض کو کچھ دبایا جا سکتا ہے۔ میں نے دواؤں کے ساتھ وہسکی کی بوتل بھی خریدی اور ساری رات بیٹھا رہا۔ چند روز کے بعد کے. پی. شاہ سے ملا تو انھوں نے کہا کہ آپ دلّی جایئے اور فیروز شاہ روڈ پر ایک ڈاکٹر رہتا ہے، جو ہومیوپیتھک کی دنیا میں ایک مشہور نام ہے اس سے ملئے۔ انھوں نے ڈاکٹر کا نام بھی بتایا تھا لیکن فی الوقت نام میں بھول گیا۔ میں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

کے وائس چانسلر کو خط لکھ کر منڈی ہاؤس گیسٹ ہاؤس میں دو کمرے لیے۔ ۳۲ روز علاج کیا۔ ۳۲ روز کے علاج کے بعد ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کیا، اور میں کوثر کو لے کر علی گڑھ آ گیا۔ پی ایف سے مجھے قرض لینا پڑا تھا، اور تمام چھٹیاں سوخت ہو گئیں، لیکن سب لا حاصل۔ اب وہ violont ہونے لگی تھیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ مجھ سے بدتمیزی اور بچوں سے مار پیٹ کرنے لگیں۔ میرے دوست کنور پال سنگھ نے مجھ سے کہا کہ آپ ڈپٹی کمشنر پونیا سے ملاقات کیجیے۔ ان کے کوئی خاص عزیز آگرہ کے مینٹل ہوسپٹل میں ہیں۔ شاید کوئی صورت پیدا ہو۔ پونیا صاحب نے فوراً خط لکھ دیا اور میں نے کوثر کو وہاں داخل کرا دیا اور دس دن تک آگرہ میں قیام کر کے روز اسپتال جاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً گھر لے آئے۔ اس تمام دوڑ دھوپ میں بچوں کی تربیت بری طرح متاثر ہوئی، اور پڑھنے کی طرف پوری لاپرواہی برتی، برباد ہو گئے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں، کوثر کے بطن سے جو بڑا بیٹا تھا دریز ستار، اس نے شادی کر لی اور وہ لڑکی کو لے کر یا لڑکی اس کو لے کر خاموشی سے لکھنؤ بھاگ گئے۔ درّیز نے میرے سیلف سے دس ہزار روپے نکال لیے اور لکھنؤ گل مرگ ہوٹل میں دونوں اس وقت تک رہے جب تک روپیہ خرچ نہیں ہو گیا۔ اس ٹریجڈی کا راز یہ ہے کہ سیتاپور سے علی گڑھ تک ہر جگہ یہ بات مشہور تھی اور کسی حد تک ہے کہ میرے پاس بہت بڑی جائداد ہے اور اس کی شہرت بھی شادی میں معاون ثابت ہوئی۔ خیر زندگی کھاروے کی چادر کی طرح لشٹم پشٹم گزرتی رہی۔ کیسے گزرتی رہی، یہ اگر لکھنے بیٹھوں تو دفتر تیار ہو جائے اور حاصل کچھ بھی نہ ہو۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ پوری زندگی کھاروے کا لباس ہے جس میں چھوٹے بڑے زربفت کے پیوند لگے ہیں۔ بٹیا سرکار کے انتقال کے بعد سال دو برس کیسے گزرے، یہ ناقابلِ بیان ہے۔ بس اس

طرح گزرے کہ کیا کہوں۔

راشد: آپ نے حالات کی ناسازگاری کا جو بیان کیا تھا، اس کی اذیت، پوری شدت کے ساتھ ذہن کو بدحواس کرگئی۔ واقعی انسان وقت اور حالات کے ہاتھوں محض ایک کھلونا ہوتا ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرلے، لیکن وقت کی گردش سے نہیں بچ سکتا۔ قسمت کی لکیریں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور ہم بے بس ہوکر خود اپنا ہی تماشا دیکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ ویسا نہیں ہوتا، جیسا ہم چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمیں اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے، لیکن بعض اوقات کے لیے حالات کے سانچے میں خود کو ڈھالنے کے باوجود زندگی کی آزمائشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ قاضی صاحب چوتھے عشق کے بیان میں آپ نے جس ذہنی انتشار کا ذکر کیا ہے اس کے تصور سے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ زندگی جب چند برسوں کے لیے آپ پر مہربان ہوئی تو اس کے دھنک رنگوں سے حیات کا گوشہ گوشہ معطر ہو اُٹھا، لیکن اسی زندگی نے جب کروٹ بدلی تو ذہنی انتشار اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ انتشار کا سلسلہ یہیں تھم گیا یا ذہنی اذیتیں آپ کے حوصلوں کا مزید امتحان لیتی رہیں۔

قاضی عبدالستار: اذیتوں کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ابھی ہم سنبھلے بھی نہ تھے کہ خبر آئی کہ میرا بیٹا دڑیز ستار، یاسین اور عدنان جو علی گڑھ کے بدنام بدمعاش تھے، ان کے ساتھ گرفتار ہوگیا۔ ہمارے مچھریٹہ کے گھر کے سربراہوں نے بھی کتنے ہی قتل کرائے ہوں گے، کبھی کسی کا سپاہی گرفتار نہیں ہوا۔ تین چار دن میری عجیب حالت رہی۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا کہ میں نے Sucide کے لیے ریوالور نکال لیا۔ پانچوں کارتوس لگائے اور منہ میں رکھ کر فائر کیا، لیکن فائر نہیں ہوا۔ باہر نکال کر دیکھا تو کارتوس صحیح سلامت تھے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں نے ایک کارتوس لگا کر صحن میں فائر کیا،

فائر دَھن سے ہو گیا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ابھی پروردگار عالم کو میری موت منظور نہیں ہے۔ تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔ صرف بدمعاشوں کے ساتھ دہلی میں کھانا کھا رہا تھا، گرفتار ہو گیا اور اندور کی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میں فوراً اندور گیا، وہاں کے ڈائرکٹر جنرل سے ملاقات کی اور جناب ویرمنی صاحب سے بھی ملاقات کی جو شاید ایڈیشنل جنرل تھے۔ انھوں نے بہت دلچسپی لی اور اس کو سلطانی گواہ بنوانے میں مدد کی۔ اگر دُرریز سلطانی گواہ بن گیا ہوتا تو چند مہینوں میں باہر آ جاتا لیکن اس کو یہ ڈر پیدا ہوا جو کسی حد تک صحیح بھی تھا کہ اس کے بیان سے یاسین اور عدنان وغیرہ کو پھانسی ہو جائے گی اور ہو سکتا تھا جس کا قوی امکان تھا کہ مجھ پر حملہ ہو جاتا، اس لیے دُرریز نے اپنا بیان بدل دیا اور جیل میں سڑتا رہا۔

ابھی سال دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ دُرریز کی بیوی کی چھوٹی بہن نے دُرریز کے چھوٹے بھائی کے ساتھ شادی کر لی۔ میں یہ سب تماشے دیکھتا رہا اور کچھ بھی کرنے سے عاجز رہا۔ صرف صبر اور برداشت کرتا رہا۔ ہم پر تو یہ گزر رہی تھی اور میاں شہریار کہتے پھر رہے تھے کہ قاضی صاحب زمین دار کے پوت ہیں۔ مار مار کے بیوی کو پاگل بنا دیا۔ میں نے سنا، چپ رہا۔ شہریار میرے پاس آتے بھی تھے، تحفے بھی لاتے تھے، لیکن میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ جب خود شہریار کی بیوی نے شہریار سے طلاق مانگی تو شہریار میرے پاس آئے اور فرمایا کہ خدا کے واسطے آپ اسے سمجھایئے۔ وہ آپ کا بہت ادب کرتی ہے، شاید مان جائے۔ میں نے جو کچھ ممکن تھا وہ سب کہا اور کیا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تب شہریار کہتے تھے کہ قاضی صاحب کا صبر مجھ پر پڑا ہے۔ شاویز نے شادی تو کر لی، لیکن اختلافات پیدا ہوتے رہے، سنگین ہوتے رہے اور ایک دن جب میں دہلی میں تھا، اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور چند ماہ بعد میرے پڑوس میں رہنے والے فاضلی صاحب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے سنیئر تھے، ان کی

بیٹی سے شادی کر لی۔ کوثر شاویز کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس واقعے کے بعد شاویز کے سسرال والے کوثر کو لے کر میرے پاس آ گئے۔ اس لیے کہ مجھ پر ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور میں میرس روڈ کے فرسٹ فلور کا مکان چھوڑ کر گراؤنڈ فلور کے ایک مکان میں رہ رہا تھا۔ میں نے کئی برسوں کے بعد کوثر کو دیکھا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا لیکن اس کو پہچاننے سے عاجز رہا۔ دماغی توازن کی خرابی نے اس کے نقش و نگار سب برباد کر دیے۔ اسے پہچاننا تک دشوار ہو گیا۔ اتنی اسمارٹ اور دل کش عورت ایسی ہو گئی کہ اگر اس کا کارڈی گن اور شال اور سینڈل پر نظر نہ پڑتی تو کسی گھر کی ماما معلوم ہوتی۔ میں کسی طرح دوسرے دن ان کو بہلا پھسلا کر شاویز کے پاس لے گیا کہ وہ دہلی میں اپنی نئی بیگم کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اب اس قصے کو یہیں رہنے دیجیے۔

ooo

لکھنؤ کے ایّام

راشد: قاضی صاحب! مچھریٹہ اور سیتاپور کے دلچسپ اور نا قابلِ فراموش واقعات آپ نے مخصوص انداز میں سنائے۔ آپ نے اپنی سوانح عمری قلم بند نہیں کی، لیکن مجھے لگتا ہے کہ بیشتر باتیں آپ نے اس طرح بیان کردی ہیں کہ خودنوشت کی کمی بہت حد تک پوری ہوگئی ہے۔ کسی بھی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بچپن کے واقعات بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھنا چاہے تو فقط آپ کی تحریریں پوری طرح معاون نہیں ہوسکتیں۔ جب تک آپ کے ابتدائی ایام کو نہیں سمجھا گیا تو شخصیت کے نشیب و فراز پوری طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتے۔ مچھریٹہ اور سیتاپور کے علاوہ علی گڑھ کے شب و روز آپ کی داستانِ حیات کے اہم ابواب ہیں۔ بحیثیت ادیب آپ کی جو شناخت متعین ہوئی، یا علی گڑھ کی سیاست نے آپ کو جس طرح نقصان پہنچایا، وہ تمام باتیں اپنی جگہ درست ہیں، لیکن لکھنؤ کے ایام کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لکھنؤ میں آپ نے زندگی کا زیادہ عرصہ نہیں گزارا، لیکن جتنے برسوں تک

آپ نے وہاں قیام کیا، وہ آپ کی زندگی میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ادبی نشو ونما کا سلسلہ تو سیتا پور میں ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن لکھنؤ کی زندگی نے اس ادبی شعور کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انٹرمیڈیٹ تو آپ نے سیتا پور سے کیا، لیکن بی اے اور ایم .اے کی اسناد آپ نے لکھنؤ سے ہی حاصل کیں۔ علی گڑھ آنے سے پہلے آپ بحیثیت ادیب متعارف ہو چکے تھے اور اس ادبی شناخت میں لکھنؤ کا ایک اہم رول رہا تھا۔ لکھنؤ کے ایام ہر لحاظ سے آپ کی مجموعی شخصیت اور ادبی شخصیت کے استحکام میں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ لکھنؤ میں گزارے ہوئے لمحات کو تازہ کریں تو آپ کے ماضی کو سمجھنے میں مدد ملے۔

قاضی عبدالستار: واقعی آپ نے صحیح نشان دہی کی۔ میں نے لکھنؤ میں طویل مدت نہیں گزاری لیکن میری مجموعی شخصیت اور ادبی شخصیت کی تکمیل میں لکھنؤ کے ایام کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں جب علی گڑھ آیا تو ادبی دنیا میں ایک ادیب کی حیثیت سے میری پہچان قائم ہو چکی تھی۔ تمام باتیں سلسلے وار طریقے سے بیان کرنے کے لیے بات ذرا پہلے سے شروع کرنی ہوگی۔ جب میں نے ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا تو ہم کو علی گڑھ بھیجا گیا بی اے میں داخلہ لینے کے لیے۔ ہم ایک ملازم کے ساتھ آئے۔ ہماری جیب میں ہمارے خالو جان مجتبیٰ حسین ایوبی کا خط تھا پروفیسر فاروق صدر شعبۂ کیمیا کے نام۔ انھوں نے میرے سرٹیفکیٹ دیکھے، آم کھلائے، عمدہ ناشتہ کرایا اور اپنے ایک ریسرچ اسکالر کے ساتھ اسٹریچی ہال بھیج دیا، لیکن معلوم نہیں کیوں، اس وقت علی گڑھ اچھا نہیں لگا اور میں ریسرچ اسکالر کو بہلا کر پروفیسر کی کوٹھی پر آ گیا اور ان کی عدم موجودگی ہی میں اپنے ملازم کے ساتھ اسٹیشن پہنچ کر جو گاڑی ملی، اس میں بیٹھ گیا۔ میرے ماموں صاحب علیگیرین تھے۔ وہ سخت ناخوش ہوئے، لیکن مجھ پر لکھنؤ یونیورسٹی کا جلال و جمال ایک نشے کی طرح طاری تھا۔ میں نے فارم بھر دیا۔ اس زمانے

میں تین لٹریچر لیے جاسکتے تھے بی اے میں۔ میں نے اردو، فارسی اور انگریزی لکھ دیا۔ میرا فارم واپس آ گیا۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ تمہارے پاس انٹرمیڈیٹ میں اردو نہیں ہے، اس لیے میں تم کو بی اے میں اردو کے ساتھ داخل نہیں کرسکتا۔ میں اپنے عزیز اقبال احمد قدوائی کے ساتھ آرٹس فیکلٹی کے سامنے بنے ہوئے Hawett Hostel میں مقیم تھا۔ دوسرے دن میں سیدھا نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ نواب صاحب سیتاپور ہی کی ڈپٹی کمشنری سے ریٹائر ہوئے تھے اور مجھ ریٹھ شکار کھیلنے جاتے رہتے تھے۔ والدہ نے چلتے وقت فرمایا تھا کہ وہاں داخلے وغیرہ میں کوئی پریشانی ہو تو نواب صاحب سے مل لینا اور کہنا کہ میں قاضی فرخند علی کا پوتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

خیر ہم کشمیری محلّے میں پہنچے۔ بڑے سے لکھوری اینٹوں کے مکان کی ڈیوڑھی پر تانگے سے اُترے۔ دہلیز پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں سیتاپور سے آیا ہوں، نواب صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ چند منٹ میں ایک ملازم آیا اور مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ پھر نواب صاحب تشریف لائے۔ ان کی بائیں آنکھ پر سبز کپڑے کا چھوٹا سا چھجہ لگا تھا۔ چند باتیں سن کر انھوں نے مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا کہ کھانا ابھی کھائیں گے یا واپسی میں۔ میں نے کہا کہ میں کھانا کھا کے آیا ہوں۔ ان کے پاس سیاہ بے بی آسٹن گاڑی تھی۔ ایک بجے دن میں، چلچلاتی دھوپ میں، آنکھ کے آپریشن کے باوجود نواب صاحب مجھے لے کر اردو ڈپارٹمنٹ آ گئے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی سب کھڑے ہو گئے۔ نواب صاحب نے صرف یہ فرمایا کہ یہ میرے بہت عزیز دوست کا پوتا ہے۔ میرا ''خویش'' ہے اور

داخلہ ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ ان کا داخلہ بی اے آنرس میں ہوسکتا ہے۔ اگر یہ آنرس کے امتحان کو جو پرسوں ہو رہا ہے، پاس کرلیں۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً کہا میں بالکل تیار ہوں امتحان دینے کے لیے۔ امتحان ہوا۔ سوال تھا اپنے پسندیدہ ادیب پر مضمون لکھیے، میں نے جو لکھا تھا وہ آج تک یاد ہے ـــ ''ہندوؤں نے اردو ادب کو دو چند'' دیے ہیں۔ ایک پریم چند اور دوسرے کرشن چندر۔ امتحان احتشام صاحب نے لیا تھا۔ مجھ کو ۸۵ نمبر دیے تھے، اور اسی ایک جملے کی بدولت مجھے شعبۂ اردو میں امتیاز حاصل ہوا۔ ظاہر ہے داخلہ ہوگیا اور اپنے پسندیدہ ہوسٹل ''ہیوٹ ہاسٹل'' میں کمرہ مل گیا اور میری آرزو پوری ہوئی۔

راشد: داخلے کے مرحلے سے گزر کر آپ کو خاصا اطمینان محسوس ہوا ہوگا۔ لکھنؤ شروع سے ہی تہذیب اور ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ شہر کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی کچھ نہ کچھ سرگرمیاں رہتی ہوں گی تاکہ طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے سازگار ماحول تیار ہو سکے۔ آپ کا ادبی شعور سیتاپور میں ہی پروان چڑھنے لگا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد تو اس صلاحیت اور ذوق وشوق کو مزید نکھرنے کا موقع ملا ہوگا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بتائیں تاکہ اندازہ ہو کہ ادبی ماحول کے لحاظ سے آپ کا زمانہ، موجودہ عہد کے مقابلے میں کس طرح مختلف تھا۔

قاضی عبدالستار: بھئی ہمارے زمانے میں تو یونیورسٹی میں ادبی سطح پر خاصی رونق اور سرگرمی رہا کرتی تھی۔ یونیورسٹی میں بزمِ ادب کی چھوٹی چھوٹی نشستیں ہوتی تھیں، جن میں ہم پابندی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ شعروشاعری کا زیادہ ماحول تھا، شعری نشستوں کا اہتمام وقفے وقفے سے کیا جاتا اور ہم بحیثیت شاعر ان نشستوں میں شرکت کیا کرتے۔ باقر مہدی سے پہلے ہم کو پڑھوایا جاتا تھا۔ نشستوں اور مشاعروں میں داد بھی ملتی تھی، لیکن شاعری سے ہماری تسلی نہیں

ہوتی تھی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ یہ جو ترقی پسند فکشن نگار ہیں، یہ زمین داروں کو بدنام کرتے ہیں، اور کسانوں کی مدح سرائی کرتے ہیں، حالاں کہ زمین دار، نام کا زمین دار رہ گیا ہے، قابلِ رحم ہو گیا ہے، روٹیوں کا محتاج ہو گیا ہے، لیکن ناولوں اور افسانوں میں وہی پریم چند کے زمانے کا زمین دار نظر آتا ہے۔ میں نے اس رویے کے خلاف لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اسی خیال میں، میں نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' لکھا مسودے کو دوبار پڑھا اور پروفیسر مسعود حسین رضوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پیشی ہوئی، میں نے مسودہ پیش کیا اور عرض کیا کہ میں نے یہ ناول لکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک نظر آپ ڈال لیں۔ انھوں نے بددلی کے ساتھ فائل لی اور کہا پرسوں دوشنبے کو اسی وقت آجایئے گا۔ آپ حیران مت ہوں میں پورے ہوش و حواس میں ایک ایک لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ ایک ایک لفظ کانٹے پر تلا ہوا ہے سچائی کے ساتھ۔ میں فوراً اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔ دوشنبے کے دن شام کو پہنچا۔ پرچہ بھجوایا۔ پروفیسر کی کرخت آواز آئی، تشریف لایئے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی انھوں نے مسودہ پھینک دیا۔ بی اے میں ٹاپ کرنا ایک چیز ہے، ناول لکھنا دوسری چیز۔ کسی دوسرے کی تحریر اپنے نام سے دینا اور وہ بھی استاد کی سند کے ساتھ انتہائی بری بات ہے۔ تشریف لے جایئے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے مسودہ اُٹھایا اور لرزتے پیروں سے واپس چلا آیا۔ دوستوں کو آب دیدہ ہو کر یہ واقعہ سنایا۔ وہ قہقہے لگانے لگے۔ ''ابے اس سے بڑی تعریف کیا ہو گی۔'' خیر چند روز کے بعد میں پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے پاس پہنچا اور پوری روداد سنائی۔ وہ مسکراتے رہے۔ کچھ کہے بغیر مسودہ لے لیا اور فرمایا پرسوں آیئے گا۔ ہم پرسوں شام کو پہنچے۔ سلام کے جواب میں وہ مسکرائے۔ میں نے آپ کا ناول ادارہ 'فروغ اردو' والوں کو اشاعت کے لیے دے دیا ہے۔ میرے منھ سے آواز نہیں نکلی، اتنا خوش ہوا۔ پوچھا تو صرف اتنا کہ سر یہ کتنے دن

میں چھپ جائے گا۔ پان کی گلوری منہ میں رکھی۔ فرمایا میرے خیال میں دو مہینے کے اندر کتاب آجائے گی۔ میں رخصت ہوا۔ قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا میں ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے دو مہینے پورے ہوئے۔ میں ادارۂ فروغ اردو کے مالک شمس لکھنوی کے پاس گیا۔ ان کے پاس میں پروفیسر ہاشمی صاحب کے ساتھ جا چکا تھا۔ انھوں نے بٹھایا، چائے پلائی اور ایک کاغذ سامنے رکھ دیا کہ اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں نے کانپتے قلم سے دستخط کیے۔ انھوں نے دس جلدیں اور ایک لفافہ مجھے دیا اور کہا میں نے ایک ہزار جلدیں چھاپی ہیں۔ یہ ڈھائی سو روپے آپ کی Royality ہیں اور یہ کتابیں لے جائیے۔

ہم تانگے پر بیٹھے اور بجائے ہاسٹل جانے کے کافی ہاؤس چلے گئے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لوگوں کو اپنا ناول دکھایا۔ سب کو کافی پلائی اور انڈوں کے ساتھ کافی پلائی۔ وہ جشن کی سی کیفیت تھی۔ دوسرے دن ڈپارٹمنٹ پہنچے تو چپراسی نے کہا صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی کرسی پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ''میرا ناول کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ نورالحسن ہاشمی کا کہنا ہے کہ یہ آپ ہی کا ناول ہے۔'' مجھے خوشی ہوئی، آپ جا سکتے ہیں۔ ایک ترقی پسند مولوی رضا انصاری فرنگی محلی جو قومی آواز میں نائب مدیر تھے اور ہر اتوار کو اخبار کا ادبی ایڈیشن ایڈٹ کرتے تھے۔ انھوں نے بہت جل کر تبصرہ لکھا، لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کئی لوگوں نے کہا کہ میں ان کے اعتراض کا جواب ضرور دوں، لیکن میں یہ کہہ کر ہمیشہ ٹالتا رہا کہ احمقوں کو جواب دینا وقت کا زیاں ہے۔ چند برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ میرے اس ناول کو پانچ زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ میں نے پہلی بار زمین دار کو ایک فرد کی طرح دیکھا اور اسے پیش کیا۔ ہندی کے بڑے ادیب بابا ناگار جن نے اس کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں الٰہ آباد کے ''الکا ہوٹل'' میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ مجھے

''ابھیتدن پتر'' دیا اور یہ کہا کہ دیہات پر جس کو لکھنا ہو، وہ قاضی عبدالستار کو Text Book کی طرح پڑھے۔

راشد: یہ تو واقعی بہت بڑا اعزاز تھا آپ کے لیے، اور اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو آپ اس اعزاز کے مستحق بھی تھے، کیوں کہ آپ کا پہلا ناول ہی اتنا مقبول ہوا کہ اسے پانچ زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب ابتدائی کاوش کو اتنی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو جائے تو اس کا اعتراف اسی انداز میں کیا جانا چاہیے۔ تخلیقی فن کار کی اگر بروقت ستائش کی جائے تو اس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور وہ زیادہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کاموں کو آگے بڑھانے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مناسب ستائش سے محرومی ہاتھ آتی ہے تو نہ صرف تکلیف ہوتی ہے بلکہ حوصلے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بابا ناگارجن کے جملے نے آپ کی صلاحیتوں کو مہمیز کرنے میں رہنما کردار ادا کیا اور آپ نے زمین دار طبقے کی کہانیاں زیادہ پُراثر انداز میں بیان کرنی شروع کیں۔ آپ کے ادبی مرتبے سے متعلق جب گفتگو ہوگی تو ڈھیر ساری چیزیں سامنے آئیں گی۔ فی الحال آپ یہ بتانے کی زحمت کریں کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران کیا کوئی ایسا واقعہ کوئی رونما ہوا جس کے نقوش اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔

قاضی عبدالستار: ہاں چند باتیں تو یاد آرہی ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد یونیورسٹی کے طالب علموں اور انتظامیہ میں سنگین اختلافات پیدا ہوئے اور نعرے دیے گئے— ''یوپی کے تین چور: منشی، گپتا، جگل کشور'' کے ایم منشی گورنر تھے۔ چندر بھان گپتا چیف منسٹر تھے۔ اچاریہ جگل کشور وائس چانسلر تھے۔ یونیورسٹی کے دولڑکے ہنگامے میں کام آگئے۔ بڑے زور کا طوفان اُٹھا اور طے ہوا کہ طالب علم مقدمہ لڑیں گے۔ بترا سکریٹری تھے۔ لکھنؤ کے آئی جی پولیس بھلاّ صاحب تھے۔ مشہور تھا کہ اوپر اللہ، نیچے بھلاّ۔ بھلاّ کی لڑکی انگریزی میں بی اے کر رہی تھی، فائنل ایر تھا۔

سکریٹری نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ میں تین چار لڑکوں کے ساتھ جاؤں اور اس لڑکی سے چندہ مانگ کر لاؤں۔ یونیورسٹی بند تھی، کوٹھی پر پہنچا تو وہاں بندوق کا پہرہ تھا۔ مجھے لڑکی کا نام یاد نہیں ہے۔ میں نے اس کا نام لے کر کہا کہ وہ ہماری کلاس فیلو ہے۔ ہم اس سے چندہ مانگنے آئے ہیں۔ ہم چار طالب علم تھے۔ ایک انسپکٹر آیا اور اس نے ہم لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ادھیڑ عمر کا تندرست شاندار آدمی کمرے میں آیا۔ ہم لوگوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا میں بھلاّ ہوں۔ ہم لوگوں نے کہا ہم آپ سے نہیں ملتے۔ ہم اپنی کلاس فیلو سے ملنے آئے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اتنے میں وہ صاحب زادی تشریف لائیں۔ ہم لوگوں کو عمدہ وائے کے ساتھ چائے پلوائی، اور سو روپے جو اس وقت تک سب سے بڑا چندہ تھا، ہم کو دیا۔ ہم نے رسید کاٹ کر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ ڈرائنگ روم کے باہر نکلے تو بھلاّ صاحب کھڑے تھے۔ آپ لوگ مجھ سے ناخوش ہیں۔ یہ گاڑی آپ کی کلاس فیلو کی ہے۔ آپ لوگ اس پر بیٹھ جائیے اور یونیورسٹی چلے جائیے۔ ہم نے کہا جی نہیں، یہ آپ کی گاڑی ہے۔ ہماری کلاس فیلو دوسری گاڑی پر آیا کرتی ہے۔ ہم اس پر ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔ ہم چاروں عمدہ لباس پہنے ہوئے بہت ٹھاٹ سے تانگے سے اُترے تھے، اس کا بھی اثر تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ ہماری کلاس فیلو تانگے تک آئی۔ وہاں ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا اور رخصت ہوئے۔

یہ خبر انھیں الفاظ میں اردو کے کسی معمولی اخبار میں چھپی تھی جس کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ یہ ذکر اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے سکریٹری بترا صاحب نے چندہ تو وصول کر لیا لیکن یہ کہا کہ آپ لوگوں نے چائے کیوں پی؟ وہ چائے کلاس فیلو کی نہیں تھی، آئی جی کی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں سے رسید بک چھین لی گئی، یعنی ہم معتوب ہوگئے۔ صلح صفائی ہوئی بعد میں، لیکن Adminstration سے یونیورسٹی کے جھگڑے چلتے رہے۔

راشد: قاضی صاحب! ابتدا میں آپ نے سازگار ادبی ماحول کا ذکر کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نشستیں تو پابندی سے ہوتی ہوں گی، لیکن لکھنؤ میں تو شاندار مشاعروں کی روایت رہی ہے۔ آپ یونیورسٹی میں جب تک رہے تو وہاں کے کچھ اہم مشاعروں میں بھی شرکت کا موقع ملا ہوگا۔

قاضی عبدالستار: زیادہ تو نہیں، لیکن کچھ مشاعروں میں میں ضرور شامل رہا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ شاعری کو اپنے ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں بناؤں گا، لیکن شاعری سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار ضرور تھی اور یہی دلچسپی مجھے چند مشاعروں میں شرکت کے لیے مجبور بھی کرتی تھی۔ فروری ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ یونیورسٹی میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ ہم نے ایک انقلابی نظم ''گومتی کی آواز'' پڑھی۔ اچھی خاصی داد بھی ملی، لیکن بدقسمتی سے وہ نظم مجھے یاد نہیں رہ گئی ہے، یا اس کی کوئی نقل میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ اپنے استاد شیدا صاحب کے حوالے سے جو نظم میں نے سنائی تھی وہ اتفاق سے میری فائل میں موجود رہ گئی اور میں نے آپ کو پوری نظم سنا دی۔ بہت پرانی بات ہوگئی۔ الحمدللہ آج بھی حافظہ بہت بہتر ہے، لیکن اتفاق سے وہ نظم میرے حافظے میں موجود نہیں۔ میں باقاعدہ شاعر ہوتا اور اس نظم کو مختلف مشاعروں میں سناتا تو ممکن تھا کہ وہ آج بھی یاد ہوتی، البتہ وہ نظم کہیں نہ کہیں آج بھی مل جائے گی۔ ''شاہراہ'' کے مدیر وامق جون پوری نے ''شاہراہ'' کے سالنامہ ۱۹۵۴ء میں وہ نظم ایک صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔

ایم اے فائنل کا وائیوا ہونے والا تھا۔ معلوم ہوا پروفیسر رشید احمد صدیقی وائیوا لینے تشریف لا رہے ہیں۔ ہم لوگ گیلری میں کھڑے تھے۔ دیکھا کہ ایک صاحب خاصے دبلے پتلے دبتے ہوئے قد کے سفید شیروانی، سفید علی گڑھ کٹ پائجامہ، سیاہ مخمل کی ٹوپی، بادامی موزا اور جوتا پہنے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ جیسے ہی چپراسی نے چلمن اٹھائی (میں چق نہیں کہتا)، پروفیسر مسعود حسین رضوی،

صدر شعبۂ فارسی و اردو، فوراً باہر آ گئے اور رشید صاحب کی پیشوائی کرتے ہوئے اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر میں چپراسی نے سید محمد احمد کی آواز لگائی۔ بارہ آدمی تھے ایم اے میں۔ چار طالبات اور آٹھ طالب علم۔ سید محمد جب واپس آئے تو ہم لوگوں نے پوچھا کہ کیا گزری۔ معلوم ہوا کہ بہت آسان سوال کیے گئے۔ میں بی اے آنرس میں ٹاپ کر چکا تھا۔ ششماہی امتحان میں بھی میرے ۸۸ فی صد نمبر تھے، لیکن رشید صاحب کے نام سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوا۔ سلام کیا۔ دیکھا پروفیسر مسعود حسین رضوی کے بائیں طرف پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین بیٹھے ہوئے ہیں اور دائیں طرف پروفیسر رشید احمد صدیقی تشریف فرما ہیں۔ رشید صاحب نے اشارے سے کہا بیٹھ جائیے۔ طالب علموں کے نام کا رجسٹر سامنے تھا۔ چند لمحوں کے بعد پروفیسر نے پوچھا آپ نے غالب کو پڑھا ہے۔ میں نے کہا، جی جناب۔ پروفیسر احتشام حسین نے مجھے پڑھایا ہے۔ آپ غالب کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ میں گھبرا گیا، لیکن زمین داروں والی لٹک نے سہارا دیا۔ میں نے عرض کیا جناب والا اگر حکم دیں تو میں عرض کروں کہ میں غالب کے بارے میں کیا نہیں جانتا ہوں۔ ایک تبسم خفی کے ساتھ رشید صاحب نے فرمایا چلیے وہی بیان کیجیے اور میں نے غالب کی ڈومنی کے اوپر پوری تقریر کردی، اور ثابت کیا کہ غالب جس تہذیب کا پروردہ تھا اور جس تہذیب کے کڑھے ہوئے حضرات کے سامنے شعر سناتا تھا وہ کسی شریف خاتون کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈومنی کا سہارا لے کر اپنے عشق کی روداد تو سنائی، لیکن محبوب پر پردہ ڈالے رکھا۔ رشید صاحب نے اشارے سے کہا ٹھیک ہے۔ دوسرے سوال کے لیے انھوں نے تھوڑا تامل کیا، پھر مسعود صاحب سے کہا آپ پوچھیے۔ مسعود صاحب نے فرمایا، نہیں آپ پوچھیے۔ رشید صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ اردو کا سب سے بڑا نقاد کون ہے؟ میں نے کہا کلیم الدین احمد۔ رشید صاحب

نے چونک کر سرور صاحب اور احتشام حسین کو دیکھا۔ پوچھا گیا کلیم الدین کیوں بڑے ہیں۔ میں نے عرض کیا کلیم الدین نے مستقل موضوعات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ دوسرے حضرات نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔ میں نے اپنے خیال میں بڑا نادر جواب دیا تھا، لیکن دوسرے دن ڈپارٹمنٹ میں آیا تو معلوم ہوا کہ احتشام صاحب نے انگیز کرلیا لیکن سرور صاحب کی پیشانی پر شکن تھی۔ سلام کا جواب تو دیا لیکن وہ بات نہیں تھی۔ خیر رزلٹ نکلا۔ ہم نے ٹاپ کیا۔

راشد: قاضی صاحب! جہاں محبتیں ملتی ہیں وہاں رقابتوں کے سلسلے بھی سامنے آتے ہیں۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران کیا کوئی ایسی بات ہوئی جس نے آپ کو پریشان کیا، یا ان یادگار دنوں سے متعلق کسی شخص سے منسوب کوئی ایسی بات جواب تک آپ کی ذہنی الجھنوں میں اضافہ کرتی ہو اور آپ کسی نہ کسی صورت میں ان تمام باتوں کی وضاحت پیش کرنا چاہتے ہوں۔ کہیں کوئی معاصرانہ چشمک بھی تو رہی ہوگی جو اس وقت بھی آپ کے لیے رنج کا باعث رہی ہو، اور آج بھی جس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ کی پیشانی پر بل پڑ جائے۔

قاضی عبدالستار: بھئی رقابت کا ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے، نہ ہی معاصرانہ چشمک کی کوئی بات ہے۔ البتہ لکھنؤ کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ اقبال مجید کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ اکثر اپنے بارے میں لکھتے لکھتے فرمانے لگتے ہیں کہ قاضی عبدالستار میرے گروہ میں شامل تھے۔ قاضی عبدالستار کو فخر الدین علی احمد نے پدم شری دے دیا وغیرہ وغیرہ۔ سوچتا ہوں اب ان باتوں کا جواب دے ہی دوں۔ تو سنیے قمر رئیس نے ۱۹۵۲ء میں اقبال مجید سے میرا تعارف کرایا۔ ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں اقبال مجید نے ایک کہانی سنائی۔ عنوان تھا ''ممدو چچا'' باقر مہدی نظامت کر رہے تھے۔ کہانی ختم ہونے کے بعد فرمایا آپ لوگوں نے کہانی سن لی اچھی ہے۔ اب نظم طباطبائی صاحب

اپنا کلام پیش فرمائیں گے۔ ان کے کلام پر دیر تک بحث ہوئی اور جلسہ ختم ہوگیا۔ اس کا مطلب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے، یعنی ان کی کہانی پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اقبال مجید، میرے دوست پروفیسر مسعود عالم کے کلاس فیلو تھے، لیکن بیچ میں ہی انھوں نے تعلیم چھوڑ دی۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے بی اے سال اوّل میں داخلہ لیا۔ مسعود عالم ۱۹۵۴ء میں ایم اے فائنل میں تھے۔ خاکسار نے جولائی ۱۹۵۴ء میں ریسرچ ایڈمیشن لیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ۱۹۵۳ء میں میرا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' شائع ہو چکا تھا اور پروفیسر احتشام حسین اس کی تعریف کر چکے تھے، اور جو بعد میں ''پہلا اور آخری خط'' کے نام سے ہندی کے مشہور ناول نگار بابا ناگارجن نے شائع فرمایا اور اب تک اس کے پانچ زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے اور ایم اے میں ٹاپ کر چکا تھا، فیکلٹی کا گولڈ میڈل میرے پاس تھا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں ترقی پسندوں کے جریدے ''شاہراہ'' میں جس کے ایڈیٹر وامق جون پوری تھے، پورے ایک صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ میری انقلابی نظم ''گومتی کی آواز'' شائع ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد آپ خود سوچیے کہ میں ان کے گروہ میں شامل ہونے کی گزارش کیسے کر سکتا ہوں۔ دوسری بات گروہ ادیبوں کے نہیں ہوتے، جن کے ہوتے ہیں ان کے دوسرے نام ہیں۔ تیسری بات قمر رئیس نے ''نذرِ قاضی عبدالستار'' میں جو انٹرویو دیا ہے، اس میں فرمایا ہے کہ میرے حلقۂ احباب میں اقبال مجید، حسن عابد اور سبط اختر تھے اور قاضی عبدالستار کے حلقۂ احباب میں پروفیسر ابوبکر، پروفیسر اختر مسعود اور دوسرے لوگ تھے۔ ایک بات اور، گروہ وہی بناتا ہے جو گروہ کے ممبران کو کبھی چائے پلا سکے، سگریٹ پیش کر سکے، کھانا کھلا سکے۔ اقبال مجید کی چائے احمد جمال پاشا کے سر تھی اور سگریٹ کی ڈبیا قمر رئیس پیش کرتے تھے، لیکن آپ لکھتے ہیں کہ آپ کا گروہ تھا۔ اب جہاں تک فخر الدین علی احمد کا سوال ہے، ان سے پروفیسر آل احمد

سرور نے بھی اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا کہ آپ نے قاضی عبدالستار کو بہت کم عمری میں پدم شری دلوادیا۔ فخرالدین علی احمد صاحب نے سختی سے تردید کی تھی کہ میں پدم شری ایوارڈ سے کبھی متعلق نہیں رہا، مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ مجھے پدم شری کا اعزاز وی وی گری صاحب نے عطا فرمایا تھا اور یہ بھی کہ اگر فخرالدین علی احمد کی اسٹڈی میں میری کتابوں کا سیٹ رہتا تھا تو وہ اس لیے نہیں تھا کہ میں ان کا عزیز تھا۔ اس لیے کہ وہ میری تحریروں کو پسند فرماتے تھے۔ اقبال مجید نے ایک اور جملہ لکھا ہے کہ میری چوسی ہوئی ہڈیاں دوسرے لوگ بہت شان سے چباتے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ پیغام آفاقی نیم بیورو کریٹ ہیں، ناول کیا لکھیں گے۔ میں اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا لیکن نیم بیورو کریٹ کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اقبال مجید اس کے ناول ''مکان'' اور ''پلیتا'' پڑھ لیں تو ان کے مطالعے کی عاقبت درست ہو جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی نے کبھی بھی مجھ کو اقبال مجید کے ساتھ کسی چائے خانے میں یا کافی ہاؤس میں کبھی بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ اقبال مجید علی گڑھ میں دو سال تک بی ایڈ کے طالب علم رہے۔ کبھی میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ وہ کس حال میں تھے، کس ہاسٹل میں میں تھے، لیکن جناب ہیں کہ فرماتے نہیں تھکتے کہ میں ان کے گروہ میں شامل تھا۔

ایک بات اور۔ مجاز پر جو مضمون ہے اقبال مجید کا وہ صرف فکشن ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ۱۹۶۴ء میں میں نے علی گڑھ میں پہلی بار شامِ افسانہ کا انعقاد کیا۔ اتفاق سے قمر رئیس آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اقبال مجید کی سفارش کی کہ ان کو بھی بلا لیجیے۔ میں نے بلا لیا۔ یعنی ۱۹۶۴ء میں ہمارے ان کے تعلقات کا آغاز ہوا۔ انھوں نے ریڈیو اسٹیشن اور کافی ہاؤس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں رتن سنگھ ریڈیو پر ملازم ہوئے اور ان کے ساتھ اقبال مجید نے ریڈیو اسٹیشن میں قدم رکھا ہوگا۔ کافی ہاؤس کا

جہاں تک سوال ہے اگر قمر رئیس کافی ہاؤس جاتے ہوتے تو اقبال بھی جاتے، لیکن قمر رئیس نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ایل ایل بی کے کلاسز شام کو ہوتے تھے جو کافی ہاؤس کے عروج کا وقت ہوتا تھا۔ دن میں قمر رئیس اکثر و بیشتر ایک فربہ صاحب زادی کو سائیکل کے ڈنڈے پر فٹ کر کے ٹھنڈی سڑک کے چکر لگایا کرتے تھے۔ اس دل نواز تفریح کے سامنے بے چارے کافی ہاؤس کی کیا قیمت۔ میں نے پورے پانچ سال میں قمر رئیس کو کبھی کافی ہاؤس میں نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دن میں کسی وقت اپنی محبوبۂ دل نواز کے ساتھ آئے ہوں، لیکن اس میں بھی تامل ہے۔ رتن سنگھ کا بیان ہے کہ میں کافی ہاؤس کے سامنے سے گزرتا تھا، لیکن کبھی ہمت نہیں پڑتی تھی داخل ہونے کی۔ صرف ایک بار احتشام حسین نے مجھے جھانکتے دیکھ لیا تو مجھے بلایا اور فرمایا کہ تم آیا کرو۔ تب میں کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے جایا کرتا تھا۔ میرے سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ میں نے قاضی عبدالستار سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی اس لیے کہ مجھے ڈر لگتا تھا اور اقبال مجید ۱۹۵۴ء میں مجھے اپنے گروہ میں شامل کر رہے ہیں۔

شام افسانہ کے تھوڑے دنوں بعد میں سیتاپور گیا تو کسی نے بتایا کہ گورنمنٹ اسکول میں ایک ٹیچر آئے ہیں جن کا نام اقبال مجید ہے۔ میں فوراً گورنمنٹ اسکول پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر سے ملاقات کی۔ اقبال مجید کی بہت تعریف و توصیف کی۔ کلاس روم کے سامنے پہنچا۔ وہ ساتویں یا آٹھویں کو پڑھا رہے تھے۔ میری خاطر سے باہر آ گئے۔ میں نے ان کو اپنے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین احمد کی کوٹھی پر مدعو کیا۔ اقبال آئے اور ایک غزل سنائی جس کا قافیہ زعفرانی تھا، وہ آج بھی یاد ہے۔ پھر ان سے تعلقات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ بھوپال میں میرے بیٹے کی شادی ہوئی تو میں بھوپال جانے لگا۔ معلوم ہوا اقبال مجید ریڈیو اسٹیشن پر ہیں۔ میں نے ملاقات کی۔ وہیں انھوں نے بتایا کہ فضل تابش جو بھوپال کے مشہور

شاعر اور بہت کڑھے ہوئے، سجے ہوئے، نفیس انسان تھے۔ وہ اقبال مجید کو کچھ تنگ کر رہے ہیں۔ میں نے پروفیسر آفاق کے ساتھ جو خدا کے فضل سے حیات ہیں، فضل تابش سے ملاقات کی اور دونوں میں میل کرا دیا۔ جب میں اس کے بعد بھوپال گیا تو معلوم ہوا پھر لڑائی ہوگئی۔ ایک بات اور، اقبال مجید بہت دھوم دھام سے احمد جمال پاشا سے اپنی دوستی کا ذکر کرتے ہیں۔ دوستی ہو سکتی ہے، لیکن جب احمد جمال پاشا کی شادی ہوئی تو وہ میرے پاس ہاسٹل آئے اور مجھ سے بارات میں چلنے کا وعدہ لیا۔ میں نے شرط لگائی کہ میں بارات میں تو نہیں جاؤں گا، لیکن جہاں تمہارا نکاح ہوگا، وہاں پہنچ جاؤں گا بشرطیکہ منظر سلیم بھی مدعو ہوں تاکہ میں ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ میں وہاں پہنچا تو اقبال مجید تو کیا، رتن سنگھ بھی مدعو نہیں تھے۔ قمر رئیس نے جو اپنے حلقۂ احباب کا ذکر کیا ہے، اس میں اقبال مجید، حسن عابد اور سبط اختر کا بھی نام لیا ہے۔ یہ سب لکھنؤ میں تھے، لیکن ان میں سے کوئی مدعو نہیں تھا۔

نیاز فتح پوری کا انتقال ہوا تو احمد جمال پاشا نے ایک مضمون داغ دیا کہ جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھے چائے پلائی، بسکٹ کھلائے اور دیر تک ادب پر باتیں کرتے رہے۔ جب میں نے وہ مضمون پڑھا تو احمد جمال پاشا سے پوچھا کہ تم کب ملنے گئے تھے تو انھوں نے حسبِ دستور ایک قہقہہ لگایا اور کہا قاضی بھائی کیا وہ تردید کرنے آئیں گے۔ ابھی ''نیا دور'' کے ''مجاز نمبر'' میں اقبال مجید کا ایک مضمون دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اقبال مجید ۱۹۵۴ء میں بی اے سال اوّل میں تھے اور مجاز پر ۱۹۵۴ء میں دورہ پڑا تھا اور ذہنی توازن متاثر ہوا تھا اور وہ رانچی علاج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے وہ ۱۹۵۵ء آئے اور ان کے بہت عزیز دوست مسراجی نے ان کو پھر شراب کے راستے پر ڈال دیا اور اب مجاز بے پناہ ہو چکے تھے۔ کسی کو ٹھیک سے پہچانتے بھی نہیں تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے گھر میں جو امین آباد کی ایک گلی میں واقع تھی،

ایک جلسہ کیا تھا، جس میں پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب تشریف لائے تھے اور صدارت کی تھی۔ ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا کہ دو آدمیوں کے ساتھ مجاز آ گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ خیر مجاز کسی طرح تشریف فرما ہوئے۔ ابھی آغاز ہی میں پروفیسر مسعود حسین رضوی نے کچھ جملہ فرمایا جس پر مجاز نے واہ واہ کی گردان شروع کر دی۔ ساری محفل سناٹے میں بیٹھی رہی، اور واہ واہ کرتے ہی وہ اُٹھے اور دونوں ساتھیوں کے ساتھ نکل گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اطمینان کی سانس لی اور جلسہ شروع ہوا۔ مجاز کی یہ کیفیت مہینوں رہی ہے اور شام کو اکثر وہ کپور ہوٹل کے سامنے تقریر کرتے پائے جاتے تھے۔ اس وقت صرف تین آدمی ان کے اردگرد ہوتے تھے۔ مسرا جی، جلال ملیح آبادی اور منظر سلیم، تو آخر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اقبال مجید کے مجاز سے تعلقات کب پیدا ہوئے اور ایسے تعلقات ہوئے کہ اقبال مجید نے ان کو بہت دوستانہ انداز میں کہا کیا ہوا مجاز۔ ایک بات اور جب مجاز عالم حواس میں تھے تو کسی بھی ایسے ایسے شخص کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ مجاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ خورد تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان سے مساویانہ انداز میں گفتگو کر سکے، چہ جائیکہ بی اے سال اوّل کا طالب علم۔

اسی جریدے میں ایک مضمون ایک صاحب کا اور ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ مجاز علی گڑھ کٹ پاجامہ اور کرتا پہنے جا رہے تھے۔ مجاز نے لکھنؤ میں کبھی بھی علی گڑھ کٹ پاجامہ نہیں پہنا۔ وہ عام طور پر کھادی کا کالردار کرتا، بڑے پائچے کا پاجامہ اور چپل پہنتے تھے۔ ہلکی سی سردی ہوئی تو جواہر کٹ پہن لیتے تھے۔ جاڑوں میں ٹرکش کوٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ اونچی ٹوپی پہنتے تھے اور کوٹ کو اس طرح کھول بھی دیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے شیروانی کے بٹن کھول دیے ہیں۔ ٹرکش کوٹ اور شیروانی میں صرف اتنا فرق تھا کہ کوٹ شیروانی سے ذرا اونچا ہوتا تھا اور اس کی جیبیں پہلو کے بجائے پیچھے چاک کے دونوں طرف

ہوتی تھیں اور جیب صرف ایک ہوتی تھی۔ یہ ان کے جاڑوں کا لباس تھا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر کہ جنھیں بنیادی چیزوں کا تجربہ بھی نہیں ہوتا اور وہ ڈھٹائی کے ساتھ تمام چیزوں کا بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگ غلط باتوں کا بیان اپنی شان میں اضافہ کرنے کے لیے کرتے ہیں اور جب کہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ایسی باتیں کسی کام کی نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں سے بنی بنائی امیج کے مسخ ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔

راشد: قاضی صاحب! آپ نے اتنی تفصیل کے ساتھ تمام باتوں کا بیان کیا کہ ہر بات آئینے کی طرح صاف ہوگئی۔ آپ کی ان باتوں سے معاصرانہ چشمکوں کا بھی کچھ انداز ہوا، لیکن اس سے کہیں زیادہ اس بات سے آگاہی ہوئی کہ آپ صداقت کے بیان میں کس قدر سنجیدہ رہتے ہیں۔ نہ صرف اپنی تحریروں میں صداقت کے تمام تر پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اگر دوسرے فن کاروں نے اس ضمن میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے تو بروقت اس کی گرفت کرنے میں بھی آپ بالکل نہیں ہچکتے۔ اپنے متعلق بعض وضاحتوں کے لیے تو انسان اندر سے بے چین ہوسکتا ہے لیکن جن باتوں کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے، ان باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتا اور بہت حد تک نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آپ کا معاملہ دوسرے لوگوں سے قطعی مختلف ہے۔ آپ دوسروں کے متعلق بھی اُڑائی گئی غیر سنجیدہ باتوں کو اسی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ یہ آپ کے بنیادی مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی مزاج کی مخصوص ترجمانی کرتے ہوئے لکھنؤ کے بقیہ ایام کا بیان جاری رکھیں۔

قاضی عبدالستار: بھئی بات سے بات نکلتی ہے تو کئی دوسری چیزیں خود بخود شامل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بات تو ہو رہی تھی ایم اے کے رزلٹ کی۔ ہم نے ایم اے میں ٹاپ کیا اور رائے بہادر شنکر دیال نگار سے گولڈ میڈل حاصل کیا اور ریسرچ میں داخلہ لیا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ہم کو فکشن کا کوئی موضوع مل جائے ریسرچ

کے لیے، لیکن پروفیسر آل احمد سرور جو اَب ہیڈ ہو چکے تھے۔ شعبۂ اردو، شعبۂ فارسی سے الگ ہو چکا تھا۔ بہت اصرار کے بعد مجھ کو ''اردو شاعری میں قنوطیت'' جیسا موضوع دے دیا، اور میں طوعاً و کرہاً کام کرنے لگا، لیکن زمین داری کا خاتمہ ہو چکا تھا، ڈیڑھ دو سو روپے جو مجھے ملتے تھے، وہ ملتے تو تھے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ والدہ پر بار ہوتا ہے۔ میں نے اسکالرشپ کے لیے کوشش کی۔ اردو کے لیے ایک اسکالرشپ ہوا کرتا تھا، لیکن اردو دشمنی نے اس کو ہضم کر لیا۔ اسکالرشپ کی محرومی کے سلسلے میں پورا سال گزر گیا۔ بالآخر احتشام صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم علی گڑھ چلے جاؤ۔ تم کو وہاں اسکالرشپ مل جائے گا، اور ڈاکٹر نورالحسن (وزیرِ تعلیم) اور ڈاکٹر علیم کے نام خط بھی لکھ دیا اور یہ طے ہو گیا کہ میں جولائی میں چلا جاؤں، لیکن جون میں شبلی کالج میں ایک جگہ نکلی۔ احتشام صاحب نے مشورہ دیا کہ میں سرور صاحب سے بات کروں، اس لیے کہ اقبال سہیل صاحب سرور صاحب کے شاگرد ہیں اور وہ شبلی کالج پر حاوی ہیں۔ سرور صاحب نے مجھے فوراً ایک خط لکھ کر لفافہ سیل کر دیا، اور کہا کہ اسے بہت احتیاط سے اقبال سہیل کو دے دیجیے گا۔

میں اعظم گڑھ کی بس پر سوار ہو گیا۔ اعظم گڑھ میں داخل ہوتے ہی بس کنڈکٹر نے جس سے میں سرائے میؔر کے بارے میں گزارش کر چکا تھا۔ ایک جگہ بس روک لی اور پھر کہا کہ سامنے جو باغ ہے یہ سرائے میر ہے۔ آپ کہاں اسٹیشن پر اُتریں گے اور تانگہ کریں گے، سیدھے چلے جایئے۔ ہم بیگ جھلاتے ہوئے پگڈنڈی پر چل پڑے۔ تیس چالیس گز چلنے کے بعد سامنے دریا آ گیا۔ میں بہت پریشان ہوا، لیکن جوش اور جوانی میں اپنا بیگ میں نے دریا کے اس طرف پھینک دیا۔ پاٹ کم تھا۔ میں نے اپنے جوتے بھی اُتار کر پھینک دیے، اور دریا میں اُتر پڑا۔ بیچ میں پہنچا تھا کہ اچانک پانی گردن تک آ گیا۔ میں کانپنے لگا۔ خدا کی رحمت سے جانوروں کے کھروں کے نشانات نظر آ گئے اور میں نے بہت

آہستہ سے پیچھے ہٹ کر، ترچھے ہو کر انھیں نشانوں کی طرف چلنے کی کوشش کی۔ خیر کسی طرح دریا سے باہر آیا تو خوف کی وجہ سے پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔ ڈیڑھ دو بجے دن کا وقت تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ اتنی دیر بیٹھا رہا کہ میرے کپڑے سوکھ گئے۔ خیر میں نے لباس تبدیل کیا اور باغ میں داخل ہوا۔ سامنے اقبال صاحب کا مکان تھا۔ چار بج چکا تھا۔ ایک شخص برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اقبال صاحب سے کہیے کہ لکھنؤ سے ایک طالب علم آیا ہے، اس نے جواب دیا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ خیر تھوڑی دیر کے بعد اقبال سہیل صاحب برآمد ہوئے۔ کرتا پاجامہ پہنے ہوئے، تیز طرار، انتہائی ذہین چہرہ اور آنکھیں۔ مجھے تقریباً لپٹا لیا انھوں نے۔ اندر کمرے میں لے گئے، فوراً شربت پلوایا۔ پھر خط پڑھا۔ مسکرائے اور فرمایا، مجھے حیرت ہے کہ سرور صاحب نے یہ خط کیسے لکھ دیا؟ ان کو تو معلوم ہے کہ اس جگہ پر میرے داماد کا تقرر ہو چکا ہے۔ مگر اقبال صاحب نے میری بہت خاطر کی۔ مجھے بہترین کھانا کھلایا۔ رات میں پوچھا کہ بس اسٹینڈ سے یہاں تک کا آپ نے کتنا کرایہ دیا تو میں نے پوری کہانی سنائی۔ وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ آپ پوری سلامتی اور خیریت کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔ ہم لوگ کبھی اس دریا کو کراس نہیں کرتے۔ بس کنڈکٹر انتہائی نالائق آدمی تھا۔ خیر صبح ہم نے غسل کیا اور بہت عمدہ ناشتہ کیا اور اقبال صاحب نے اپنے ملازم کے ساتھ مجھے اسٹینڈ بھیج دیا۔ میں سیدھا احتشام صاحب کے پاس گیا۔ میری روداد سن کر وہ چپ خاموش بیٹھے رہے۔ فرمایا سرور صاحب سے مل لیجیے۔ میں شام کو پہنچا تو اپنی پوری کہانی سنائی۔ جواب میں فرمایا ہاں مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ اس جگہ پر اقبال سہیل کے داماد کا تقرر ہو چکا ہے۔ خیر ہم نے ریسرچ میں داخلے کے لیے اپنی درخواست بایوڈاٹا کے ساتھ علی گڑھ بھیج دی۔ علی گڑھ سے فوراً جواب آیا کہ آپ آ جائیے۔

راشد: گویا کہ اب لکھنؤ چھوڑنے کا زمانہ قریب آرہا تھا، جب کسی مقام پر انسان کچھ وقت گزار لیتا ہے تو اس جگہ سے ایک خاص اُنسیت ہو جاتی ہے اور لکھنؤ میں تو آپ نے زندگی کے خوب صورت اور یادگار ایام گزارے تھے۔ اس تناظر میں لکھنؤ چھوڑنے کا غم کس طرح آپ کے ذہن و دل پر حاوی تھا۔

قاضی عبدالستار: لکھنؤ چھوڑنے کا انتہائی غم تھا۔ لکھنؤ میں میں نے کچھ دن نہیں گزارے ہیں، بلکہ اپنی زندگی کے سنہرے دن گزارے۔ یعنی جب میں علی گڑھ آیا ہوں تو قاضی عبدالستار ہو چکا تھا۔ لکھنؤ کے سلسلے میں، مجاز پر جو میں نے مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان ہے ''مجاز کا لکھنؤ'' وہی دراصل میرا لکھنؤ ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے پڑھ لیں۔ اگست ۲۰۱۲ء کے ''تحریرِ نو'' میں شائع ہوا تھا۔ ویسے لکھنؤ کی خوش گوار یادیں اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ ہر شام کافی ہاؤس میں گزرتی تھی۔ پورا حضرت گنج جیسے اپنا علاقہ تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گھنٹوں ٹہلا کرتے، خوش ہوا کرتے اور رات میں گھر آتے۔ کافی ہاؤس میں ڈی پی مکھرجی، آنند نرائن ملا، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین وغیرہ بھی آتے۔ ڈاکٹر علیم تھوڑے دنوں قبل لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ ان محفلوں کو چھوڑنا انتہائی اذیت ناک تھا۔ ہیوٹ ہاسٹل سے تو جیسے مجھے عشق تھا۔ احباب میں پروفیسر سید اختر حسین رضوی، پروفیسر ابوبکر، شاہد سرن اور جنگ صاحب کی فرقت جیسے ناقابلِ برداشت تھی، لیکن بہر حال علی گڑھ آنا پڑا۔ اسی علی گڑھ میں آنا پڑا جسے چار پانچ برس پہلے چھوڑ کر ہم لکھنؤ آگئے تھے۔

○○○

علی گڑھ کے شب و روز

راشد: قاضی صاحب! علی گڑھ ہی وہ جگہ ہے جس نے قاضی عبدالستار کو صحیح معنوں میں قاضی عبدالستار بنایا۔ حالاں کہ لکھنؤ کے بیان میں آپ نے اس بات کا خصوصی ذکر کیا ہے کہ علی گڑھ آنے سے پہلے ہی آپ قاضی عبدالستار بن چکے تھے۔ ادبی حلقوں میں متعارف ہونا الگ بات ہے، لیکن بنیادی طور پر آپ کی ادبی مقبولیت کا گراف چمنِ سرسید سے وابستہ ہونے کے بعد ہی آگے بڑھا اور اس طرح مسلسل بڑھتا گیا کہ اس میں کبھی کمی نہیں آئی۔ حالاں کہ علی گڑھ میں آپ کے مخالفین کی تعداد بھی پوری طرح سرگرم رہی اس کے باوجود آپ کو جو مقام حاصل کرنا تھا، اس میں آپ پوری طرح کامیاب رہے۔ مخالفت اور حسد کو اگر منفی زاویوں سے دیکھا جائے تو زندگی غارت ہو جائے گی اور ہر لمحہ ذہنی اذیتوں میں بسر ہوگا، البتہ ان منفی چیزوں کا بھی اگر مثبت انداز سے سامنا کیا جائے تو آگے بڑھنے کی مزید تحریک ملتی ہے۔ درخت کی شاخوں کو ہم جتنا تراشتے ہیں، اس کی زیبائش میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ منفی چیزوں کو بھی انسان اسی زاویے سے دیکھے تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ مشکل حالات میں بھی وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیتا چلا جائے۔ آپ کی پوری زندگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ آپ نے ہزار مخالفتوں کے باوجود منزل کے حصول

میں کوئی کوتاہی نہیں برتی اور محنت ولگن کے ذریعے خوابوں کو حقیقتوں میں تبدیل کرنے کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہے۔ علی گڑھ والوں نے ممکن ہے آپ کو نقصان پہنچایا ہو، لیکن علی گڑھ نے تو آپ کو بہت کچھ دیا۔ علی گڑھ کے شب و روز کو تفصیل سے بیان کریں تاکہ حالات کی نزاکت، لوگوں کے رویے اور معاصرانہ رقابت کے مختلف زاویے سامنے آئیں۔

اضی عبدالستار: اس میں کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ سے متعلق میرے تاثرات نسبتاً تلخ ہیں، لیکن یہ تاثرات علی گڑھ والوں سے متعلق ہیں۔ بلاشبہ دانش گاہ علی گڑھ نے میری ادبی شناخت متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ میں کوشش کروں گا کہ علی گڑھ سے متعلق تمام باتیں تفصیل کے ساتھ بیان ہوسکیں۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر محمد حسن سے خط و کتابت ہوچکی تھی، لال ڈگی پر ان کا مکان تھا۔ میں سیدھے ان کے گھر گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ شام کو تو پہنچے ہی تھے، رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پوچھا آپ مچھریٹے میں کیا ناشتہ کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا ورقی پراٹھے، بالائی اور انڈے۔ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ شاید یہ پوچھ رہے ہیں تو بتا دینا چاہیے۔ صبح ناشتے میں ورقی تو نہیں لیکن پراٹھے تھے، بالائی بھی تھی، انڈے بھی تھے۔ میں دھک سے رہ گیا۔ بہت کوفت ہوئی، فوراً فیصلہ کرلیا کہ یہاں نہیں رہنا ہے، ورنہ ان کی آدھی تنخواہ میں چاٹ جاؤں گا۔ دس گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ڈپارٹمنٹ آیا۔ یاد آیا۔ والدہ نے فرمایا تھا وہاں کوئی زحمت ہو تو قاضی عبدالغفار صاحب کے پاس چلے جانا۔ وہ مچھریٹہ شکار کھیلنے آچکے ہیں اور تمہارے یہاں کئی بار قیام کرچکے ہیں۔ قاضی صاحب کا کوئی بھتیجا سیتاپور میں ایس پی یا ڈی ایس پی تھا۔ قاضی صاحب اس کے پاس آتے تھے اور وہی شکار کا انتظام کرتا تھا۔ قاضی صاحب کے کمرے میں فرش تھا، براق چاندنی بچھی ہوئی تھی، گاؤتکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ برابر میں چاندی کی حیدرآبادی پٹی (چھوٹا سا پاندان)

رکھی تھی۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو سینے سے لگا لیا اور حیرت سے پوچھا کہ آپ تو قاضی فرخند علی کے جاں نشین ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ پوچھا کیا زمین داری کے خاتمے کا اتنا اثر ہوا آپ پر کہ آپ...... وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے روداد سنائی۔ کسٹوڈین کے مقدمے کی کہانی سنائی۔ چپ سنتے رہے۔ مجھ کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ کہا آپ یہاں تشریف رکھیے، میں آپ کا بایوڈاٹا لے کر ذاکر صاحب سے ملتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر واپس تشریف لائے۔ مسکرا کر فرمایا کہ آپ کو فیلوشپ مل گئی ہے۔ میں نے بہت لجاجت سے شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ کسی ہوسٹل میں میرا انتظام کر دیجیے۔ انھوں نے فوراً پروفیسر نورالحسن (وزیرِ تعلیم) کے نام خط لکھ کر دیا۔ پروفیسر وی ایم ہال کے پرووسٹ تھے۔ میں نے احتشام صاحب کا بھی خط دیا۔ مسکرائے، فرمایا تو آپ کے ٹھہرنے کے لیے میں دو کمروں کا انتظام کر دوں اور مسکرا کر مجھے وی ایم ہال بھیج دیا۔ میں نے وارڈن روم دیکھ لیا اور ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے سامان لے کر اسی دن شام کو ہاسٹل پہنچ گیا۔

راشد: علی گڑھ میں داخلہ ملنے کے بعد آپ یہاں کی سازگار ادبی فضا سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتے چلے گئے اور پھر یہی علی گڑھ آپ کے خوابوں کا دیار بن گیا۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے بھی آپ نے دیارِ سرسید میں چند برس گزارے۔ میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد کی تقرری کے بعد آپ کے تاثرات کافی تلخ رہے، لیکن ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اپنے تاثرات کا اظہار کریں تا کہ اس عہد کی عمومی صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے۔

قاضی عبدالستار: ریسرچ میں داخلے کے بعد بھی میں علی گڑھ کی ہاسٹل لائف سے زیادہ مانوس نہیں ہو پایا۔ میری اپنی ایک دنیا تھی۔ چند لوگ تھے جن سے میں ملتا تھا۔ لکھنؤ میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اس لیے علی گڑھ کی اقامتی زندگی کے متعلق میں زیادہ کچھ بیان نہیں کر سکتا، البتہ کچھ ایسے واقعات ریسرچ میں داخلے کے

بعد رونما ہوئے جن کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ رشید صاحب کا آپریشن ہوا تھا، اور وہ آگرے میں تھے۔ پروفیسر مسعود حسین ایکٹنگ چیئرمین تھے۔ کسی نے بتایا کہ دلّی کالج میں لکچررشپ کی جگہ خالی ہے۔ ہم نے دو جوڑے کپڑے بیگ میں رکھے، دہلی پہنچ گئے۔ جو خطوط لے کر میں چلا تھا ان میں سے ایک خط میرے خالو جان مجتبیٰ حسین ایوبی نے مولانا حفظ الرحمٰن کے نام بھی دیا تھا۔ میں سیدھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے بہت شفقت سے مجھ سے باتیں کیں اور ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ دسترخوان پر پندرہ بیس آدمی تھے۔ دعوتِ شیراز کی سی کیفیت تھی۔ مجھ کو لے کر وہ دلّی کالج کے پرنسپل سے ملے، میرا بایوڈاٹا دیا۔ انھوں نے بہت پیاری پیاری باتیں کیں۔ دو تین دن کے بعد انٹرویو تھا۔ میں مولانا مکرم کا مہمان رہا۔ انٹرویو میں شریک ہوا۔ مولانا خود کمیٹی میں تھے۔ شام کے وقت جب واپس آیا تو میرے انٹرویو کی تعریف کی، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ کا تقرر نہیں ہو سکا۔ ظہیر احمد صدیقی کا تقرر ہو گیا۔ میں نے اسی وقت اپنا بیگ لیا اور اسٹیشن آ گیا۔ علی گڑھ کا ٹکٹ لیا، پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ایک گاڑی کھڑی تھی۔ قلی سے پوچھا یہ گاڑی کہاں جائے گی۔ اس نے کہا اجمیر۔ میں علی گڑھ کی ٹکٹ کے ساتھ اجمیر کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی اجمیر کے نواح میں تھی۔ اتفاق کہیے کہ کسی نے ٹکٹ نہیں مانگا۔ لوگ اُترنے کی تیاریاں کر رہے تھے، ایک بزرگ نے مجھ سے بھی پوچھا آپ کہاں جائیں گے۔ میں نے کہا مزار شریف پر فاتحہ پڑھوں گا۔ مسکرا کر پوچھا ٹھہریں گے کہاں۔ میں نے کہا ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اللہ میاں کے یہاں ٹھہر جائیے۔ میں نے حیرت سے ان کو دیکھا۔ فرمایا ایک بزرگ ہیں جن کو لوگ اللہ میاں کہتے ہیں۔ میں نے تانگا کیا۔ تانگے والے سے کرایا پوچھا۔ اس نے کہا چار آنے اور ایک زینے کے سامنے مجھے اُتار دیا۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا پہنچا تو دیکھا صحن میں ایک

بزرگ کھڑے ہیں۔ سلام کے جواب میں فرمایا تشریف لائیے۔ پہلے ناشتہ کریں گے یا غسل فرمائیں گے۔ میں خاموش رہا۔ انھوں نے مسکرا کر مجھے ایک کمرے میں بٹھایا۔ چاندنی کا فرش تھا، گاؤ تکیے لگے تھے، پنکھا چل رہا تھا۔ میرے لیے چائے آئی۔ چائے پی کر میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا اور اخبار پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ بزرگ مسکراتے ہوئے آئے۔ فرمایا چلیے کھانا کھا لیجیے۔ میں نے بہت عمدہ کھانا کھایا اور پھر سو رہا۔ جب آنکھ کھلی تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ خیر میں تیار ہو کر درگاہ شریف گیا، فاتحہ پڑھا اور کسی کے ساتھ انا ساگر آ گیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا، پھر بھی رونق تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ آج جہاں آرا کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنا چاہیے۔ میں جب پہنچا تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز پڑھ کر بیٹھا تو خیال آیا کہ آج تہجد کی نماز بھی پڑھنی چاہیے، اب واپس کی کیا ضرورت ہے۔ تہجد کے وقت تک نفلیں پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے نفلیں پڑھنا شروع کیں۔ پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اذان ہو گئی۔ میں نے قریب میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیا یہاں تہجد کی اذان ہوتی ہے۔ انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا میاں صاحب زادے کہاں سے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا لکھنؤ سے تو کہنے لگے کہ مبارک ہو کہ آپ نے ساری رات عبادت میں گزار دی۔ یہ فجر کی اذان ہے۔ وہ واحد رات تھی جس میں ہم نے ساری رات بیدار رہ کر عبادت کی، ورنہ ہمارا تو یہ عالم تھا کہ ثریا کا ناچ ہو یا نوٹنکی، ہم چار بجے سو جاتے تھے اور اُٹھا کر لائے جاتے تھے، مگر اس رات یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہو گئی۔ نماز پڑھ کر ہم باہر نکلے تو مزار شریف کا غسل ہو رہا تھا۔ ہم بھی لائن میں لگ گئے۔ ایک شان دار بزرگ نے میرے سر پر غلاف ڈال دیا اور کہا یہاں کچھ پیسے رکھ دیجیے۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ انھوں نے فرمایا خدا بہت دے گا۔ اب میں اللہ میاں کے یہاں

پہنچا۔ انھوں نے سلام کے جواب میں فرمایا مبارک ہو۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ پھر مجھ سے میری روداد سنی اور فرمایا کہ آپ اعظم گڑھ اور دلّی کالج کیوں جاتے ہیں۔ علی گڑھ میں ہی رہیے۔ خدا یہیں صورت پیدا کر دے گا۔ آپ جب علی گڑھ پہنچیں گے تو انشاء اللہ وظیفہ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔ چلتے وقت میں نے اللہ میاں کو غور سے دیکھا۔ اوسط قد، بھرا ہوا بدن، سفید رنگ، سفید داڑھی، گرجدار آواز، آنکھوں سے جلال ٹپکتا ہوا، ہر چیز انتہائی نفیس۔ بالکل رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ خدا جانے ان کی کفالت کون کرتا تھا۔ ہم علی گڑھ آئے تو دیکھا رشید صاحب تشریف فرما ہیں۔ سلام کیا۔ فرمایا کہاں تھے آپ؟ اسکالرشپ آپ کا انتظار کر رہا ہے اور کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیا اور مختلف جگہوں پر دستخط کرایا۔ اسکالرشپ سات مہینے سے خالی پڑا تھا، مجھ کو پورے مدت کا اسکالرشپ مل گیا۔ اب تو ٹھاٹ تھے۔ راشد صاحب آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وارڈن روم کے کھانے کا خرچ تیس روپے تھا، ناشتے کا پندرہ روپے۔ شاید دس روپے ریسرچ کی فیس تھی۔

راشد: قاضی صاحب آپ کے ذہن میں یادوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب دیتے ہوئے بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور وہ تمام باتیں اس قدر دلچسپ ہوتی ہیں کہ مزید کچھ جاننے کی بے چینی پریشان کرتی رہتی ہے۔ میں نے بات شروع کی تھی علی گڑھ سے متعلق، لیکن اجمیر شریف کا ذکر فطری انداز میں شامل ہو گیا اور اللہ میاں کا ایسا کردار سامنے آیا جسے کوئی بھی اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکتا۔ اجمیر کا یہ سفر تو آپ نے اتفاقیہ طور پر کر لیا اور اس اتفاق میں دلّی کالج کی مایوسی شامل تھی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ایک تخلیقی فن کار زندگی میں جو تجربات حاصل کرتا ہے، انھیں کے ذریعے اس کے فن پاروں میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے علی گڑھ میں ہی آپ کے لیے ماحول سازگار ہوتا گیا اور آپ کو معاش کے مسائل سے نجات ملی۔ کیا ملازمت حاصل ہونے

کے بعد آپ نے پھر کبھی اجمیر کا رُخ کیا جہاں آپ کو 'اللہ میاں' کا دیدار حاصل ہوا تھا۔ کیا دوبارہ 'اللہ میاں' سے ملاقات ہوئی یا زندگی میں آپ کچھ اور انوکھے تجربات سے دوچار ہوئے۔

قاضی عبدالستار: جب میں علی گڑھ میں لکچرر ہو گیا تو جی چاہا کہ خواجہ صاحب کی بارگاہ میں حاضری دوں اور میں بغیر کسی پروگرام کے چل دیا۔ اس سفر میں 'اللہ میاں' سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں وکٹوریہ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ یہ بہت اچھا گیسٹ ہاؤس تھا اس زمانے میں۔ درگاہ شریف میں حاضری کے بعد میں اناساگر کی طرف چلا۔ عصر کا وقت تھا، میں شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں سے ایک عمارت میں خاموش بیٹھا رہا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو مجھے بھوک لگی۔ میں یہ سوچ کر اُٹھا کہ اپنے گیسٹ ہاؤس جاؤں گا اور جاتے ہی کھانا کھاؤں گا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک املی کے جڑ میں چولہا جل رہا ہے۔ چالیس پینتالیس سال کی ایک صاف ستھری خاتون روٹی پکا رہی ہیں۔ آٹھ دس سال کا ایک بچہ پاس ہی بیٹھا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں یہ عورت کیسے بیٹھی ہے۔ ڈرتے ڈرتے میں قریب پہنچا تو قورمے کی ایسی خوشبو آئی کہ میں نے کہا کھانا مل سکتا ہے۔ اس نے کہا کیوں نہیں مل سکتا، آیئے۔ بچے نے چٹائی بچھا دی، ایک گلاس میں پانی دیا ہاتھ دھونے کے لیے۔ میں ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا۔ عمدہ قورمہ، سفید دال، باسمتی کے چاول، پودینے کی چٹنی، میں نے سیر ہو کر کھایا۔ جب ہاتھ دھو کر پوچھا کتنے پیسے ہوئے تو اس نے بارہ یا چودہ آنے بتائے۔ میں نے پیسے ادا کیے اور مزار شریف آ گیا۔ دوسرے دن پھر میں شام کو نکلا، لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ سوچا کہ کل اتنا عمدہ کھانا کھایا ہے، آج بھی کھایا جائے۔ پہنچے تو املی کا پیڑ سنسان کھڑا تھا۔ کسی طرح یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کل یہاں چولہا جلا ہوگا۔ دو لڑکے وہاں کھڑے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج یہاں چولہا نہیں جلا۔ مسکرائے، کیسا چولہا؟ تو میں نے

ساری باتیں بتائیں۔ ایک لڑکا جو بڑا تھا کہنے لگا، گھر جایئے۔ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسن سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہاں آم کھائے جاتے ہیں، پیڑ نہیں گنے جاتے۔ آپ کو پوچھنا ہی نہیں تھا۔ آج تک اس قورمے کا مزہ یاد ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اللہ میاں نے جن خاتون سے شادی کی وہ ڈاکٹر محمد حسن کی عزیزہ ہیں۔ میں نے ان سے ملنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی۔

راشد: قاضی صاحب، میجک ریلزم یعنی جادوئی حقیقت نگاری کے متعلق میں نے کچھ سنا اور پڑھا بھی ہے، کچھ ایسے افسانے بھی پڑھے ہیں، جن میں جادوئی حقیقت نگاری کا بیان ہے، لیکن جو واقعہ ابھی آپ نے سنایا وہ مجھے میجک ریلزم کا انوکھا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اجمیر شریف سے متعلق اس نوع کے مختلف واقعات سنے ہیں، لیکن ان پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اس لیے کہ وہ سنے ہوئے واقعات تھے۔ براہِ راست کسی کے ذاتی تجربوں سے متعلق نہیں تھے، لیکن آپ کے واقعات سنے ہوئے ان واقعات سے قطعی مختلف ہیں کیوں کہ ان میں آپ کے براہِ راست تجربات شامل ہیں۔ میں اس بات کو طول دینا نہیں چاہتا کیوں کہ پھر اصل موضوع سے ہماری توجہ ہٹ جائے گی۔ ویسے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ کی تحریروں کی طرح آپ کی زبانی گفتگو بھی اتنی ہی دلچسپ اور پُرکشش ہوتی ہے۔ بات چوں کہ علی گڑھ کے پس منظر میں ہو رہی تھی، لہٰذا اسی موضوع کو آگے بڑھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے علی گڑھ میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا، لیکن آپ کی تخلیقات میں علی گڑھ کی زندگی، علی گڑھ کے لوگوں کی عکاسی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

قاضی عبدالستار: میں علی گڑھ سے متاثر ہی نہیں ہوا۔ مطلق متاثر نہیں ہوا۔ صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر علیم، پروفیسر نورالحسن (وزیر تعلیم) نے مجھے متاثر کیا۔ لیکن ظاہر ہے میں نے علی گڑھ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ

میں اگر لکھتا تو بہت سخت ہو جاتا۔ تلخ ہو جاتا۔ اس لیے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

راشد: آپ نے تحریری طور پر علی گڑھ کو نظر انداز تو کر دیا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی زندگی سے علی گڑھ کو منہا نہیں کیا جا سکتا۔ مچھریٹہ اور سیتا پور کے علاوہ علی گڑھ آپ کی یادوں میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ علی گڑھ سے متعلق بعض یادیں تلخ سہی، لیکن وہ یادیں آپ کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ یادوں کی بازیافت سے ہی تخلیقی عمل کی راہیں منور ہوتی ہیں۔ انھیں آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: بھئی راشد صاحب آپ تو میرا ماضی کھنگال رہے ہیں، اور وہ بھی اچانک۔ ماضی چاہے کتنا بھی تلخ کیوں نہ ہو، ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ مستقبل تو ایک خواب ہے۔ اندھا خواب جسے سب دیکھتے ہیں۔ حال کوئی چیز نہیں۔ جتنی دیر میں حال کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ حال کچھ نہیں ہوتا۔ حال کو گزرتی ہوئی لمحاتی رو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو فرداً فرداً چہرے نہیں دیکھتا، واقعات کی تفصیل نہیں دیکھتا۔ وہ درد پیش کرتا ہوں، مدتوں ذہن میں جس کی پرورش ہوتی ہے۔ سب سے پہلے میرے اندر لکھنے کی تحریک ترقی پسندوں کے رویے سے ہوئی۔ ہر کسان مظلوم ہے تو زمین دار بھی مظلوم ہے۔ میں یہ مانتا ہوں، لیکن زیادہ تر لوگوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زمین داروں کو ظالم بنا کر پیش کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ میں نے پہلی بار زمین دار کو ایک فرد کی طرح دیکھا اور پیش کیا اور افسانوں اور ناولوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ زمین دار کی موجودہ حالت خود قابلِ رحم ہو گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زمین دار اور جاگیردارانہ طبقے کو اس زاویے سے بھی دیکھا جائے۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں نے زمین داروں کو درست زاویے سے دیکھا ہی نہیں۔ وہ لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، لیکن میں ترقی پسندوں

کو احمق کہتا ہوں، اور اسی لیے کہتا ہوں کہ انھوں نے بعض چیزوں کو صحیح تناظر میں نہیں پیش کیا۔ ترقی پسندوں نے میرے خلاف بھی اپنا محاذ کھولا اور یہ کہہ کر مجھے سخت سست کہتے رہے کہ میں Landed aristocracy کو represent کرتا ہوں جو ترقی پسندوں کی لائن کے خلاف ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ میرا پہلا ہی ناول ''شکستے کی آواز'' ہندی میں ترجمہ ہوا۔ بابا ناگارجن جو کہ ایک جینوئن نقاد تھے، انھوں نے ۱۹۶۲ء میں الٰہ آباد کے الکا ہوٹل میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ مجھے ابھینندن پتر دیا اور یہ کہا دیہات پر جس کو لکھنا ہو وہ قاضی عبدالستار کو Text book کی طرح پڑھے۔ ظاہر ہے یہ اتنا بڑا اعلان تھا کہ اردو کی وہ دنیا، جس میں زیادہ تر ترقی پسندوں کا غلبہ تھا، وہ گویا Shock میں مبتلا ہو گئی، اور وہ ناول بہت تیزی کے ساتھ چار پانچ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہ میرا پہلا ناول تھا۔

راشد: باتوں باتوں میں ڈھیر ساری دوسری باتیں تو نکلتی چلی گئیں لیکن علی گڑھ کی یادوں سے آپ نے پھر کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اچھا یہ تو ضرور بتائیے کہ آپ کے پہلے ہی ناول کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی اور چار پانچ زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے تو علی گڑھ میں اس کے کیا تاثرات سامنے آئے؟

قاضی عبدالستار: علی گڑھ میں تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ یہ آپ کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس زمانے میں شعبۂ اردو میں اعظم گڑھ کا گروہ تھا، اور یہ گروہ یونیورسٹی پر حاوی تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے بہار کے اساتذہ اور طالب علموں کا کہ انھوں نے اعظم گڑھی گروہ کو توڑ پھوڑ کر ٹھکانے لگا دیا۔ اس گروہ کے سربراہ ہمارے یہاں میاں خلیل الرحمٰن اعظمی تھے اور ان کے لفٹنٹ شہریار ان کے کاموں میں ہر لحہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان دونوں کا رشتہ مثالی محبت کے طور پر مشہور تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی چودھری تھے۔ انتہا یہ ہے کہ سرور صاحب ان کے ہاتھ میں کھیلنے لگے تھے۔ ظاہر ہے وہ میرے خلاف تھے۔ سرور صاحب سے پہلے پروفیسر رشید احمد صدیقی چیئرمین تھے۔ اسی زمانے میں

ریسرچ اسٹوڈنٹس کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تھیسس کے متعلق کوئی پرچہ پڑھیں۔ نزلہ کمزور عضو پر گرتا ہے۔ سب سے کمزور ہمیں تھے۔ اس لیے کہ ہم چودھری صاحب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ رشید صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ پہلا پرچہ میں پڑھوں۔ میں باہر کا بھی تھا۔ یعنی بی۔اے اور ایم۔اے میں لاکھ آپ نے ٹاپ کیا ہو، گولڈ میڈل حاصل کیا ہو، لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ باہر والا ہونے کے ناطے میرے ساتھ مشفقانہ رویہ اختیار نہیں کیا جاتا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا رویہ بھی مشفقانہ کم تھا۔ چنانچہ یہ حکم ہوا کہ اگلے سنیچر کو آپ پرچہ پڑھیں گے۔ ہم نے پرچہ لکھا، تصوف پر لکھا جس کے نام سے لوگ گھبراتے تھے۔ رشید صاحب Chair کر رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس اور اساتذہ سے پورا ڈپارٹمنٹ بھرا ہوا تھا۔ اس وقت سرسید ہال میں شعبۂ اردو تھا۔ رشید صاحب نے مجھے حیرت سے سنا۔ چودھری صاحب نے انھیں بتایا تھا کہ میں جاہل ہوں، انھیں کچھ نہیں آتا۔ رشید صاحب خاموشی سے سنتے رہے۔ پرچہ ختم ہوا تو سناٹا چھا گیا۔ چودھری صاحب اپنا خنجر لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ آج چلے گا۔ وہ غلاف سے باہر ہی نہیں نکلا، تو ایک صاحب کھڑے کیے گئے۔ ان کا نام تھا حسن مثنیٰ انور (بہار والے نہیں، کچھوچھہ شریف والے) اور انھوں نے منھ چبلا چبلا کر فرمایا کہ مضمون تو بہت اچھا ہے، زبان خراب ہے۔ اس لیے خراب ہے کہ تنقید کی زبان کو خوب صورت نہیں ہونا چاہیے۔ لوگوں نے واہ واہ کیا اور خوب تعریف ہوئی کہ بہت اچھی بات کہی۔ رشید صاحب خاموش رہے۔ پھر حکم ہوا چیرمین کا کہ آپ کیا کہتے ہیں، تو میں نے اپنا مشہور جملہ کہا جو بار بار نقل ہوا ہے۔ زبان مضمون کے بیج سے پیدا ہوتی ہے۔ زبان کاغذ کا پھول نہیں ہوتی کہ بنا کر رکھ دیا جائے، اور جو لوگ کہتے ہیں اور زبان پر اعتراض کرتے ہیں، انھیں قرآن پڑھنا چاہیے۔ حسنِ بیان کا وہ کون سا زیور ہے جو قرآن میں موجود نہیں۔ آرائش و زیبائش کی کون سی شق ہے جو کلام اللہ موجود نہیں۔ کس کی مجال ہے جو یہ سوال کرے کہ زبان خراب ہے۔ اصل میں جو لوگ ننگی

بوچی، ٹوٹی پھوٹی اردو لکھتے ہیں، اس مضمون کی زبان سے ان کے کلیجے پر گھونسا لگا ہے، اور یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا۔ رشید صاحب نے خوش ہو کر جلسہ ختم کر دیا۔

راشد: یہ تو آپ نے زمانۂ طالب علمی کے واقعات سنائے۔ ظاہر ہے آپ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی.اے اور ایم.اے میں ٹاپ کرنے کے بعد ریسرچ میں داخلے کے لیے تشریف لائے تھے۔ نئے ماحول میں رفتہ رفتہ ہی ذہنی آہنگی کی فضا ہموار ہو پاتی ہے۔ قاضی صاحب آپ یہ بتائیں کہ ریسرچ کے بعد جب آپ اے.ایم.یو کے شعبۂ اردو سے بحیثیت استاد منسلک ہوئے تو کیا اس وقت بھی آپ کے کرم فرماؤں نے اسی طرح اپنی محبت جاری رکھی۔

قاضی عبدالستار: جس وقت میں شعبۂ اردو میں عارضی لکچرر ہوا، مجھے پہلا رجسٹر ایم.اے کا ملا۔ چودھری صاحب نے اعتراض کیا کہ اتنے جونیر آدمی کو ایم.اے کی کلاس نہیں ملنی چاہیے۔ رشید صاحب نے ڈپارٹمنٹ میں سب کے سامنے فرمایا اس کا بایوڈاٹا دیکھ لیجیے۔ ایک کتاب کا مصنف ہے۔ بی.اے اور ایم.اے کا ٹاپر ہے۔ میں نے کلاس اس لیے دیا ہے۔ اس پس منظر میں بابا ناگارجن کا جملہ ایک بم کی طرح گرا۔ رشید صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔ سرور صاحب شعبۂ اردو کی صدارت ہتھیا چکے تھے۔ سرور صاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ایک دن کا بھی Extension ملنے نہیں دیا۔ رشید صاحب جو سرور صاحب کو اردو ڈپارٹمنٹ میں لائے تھے، ان کی پرورش کی تھی، ان کو اس قابل بنایا تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہوں، انھوں نے کرنل بشیر حسن زیدی جو وائس چانسلر تھے اور سرور صاحب کی مٹھی میں تھے، انھیں شیشے میں اُتار کر رشید صاحب کو ایک دن کا Extension بھی نہیں ملنے دیا۔ یہ سب کوئی نہیں بتا سکتا۔ خدا نے صرف مجھے یہ توفیق دی ہے۔ اس یونیورسٹی کی تاریخ میں رشید صاحب وہ پہلے پروفیسر تھے جو ایک طرح سے جبراً ریٹائر کر دیے گئے تھے۔ سرور صاحب نے خاکسار کو بلایا اور فرمایا کہ بابا ناگارجن کی تعریف اردو زبان وادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

میں بہرحال زمین دار پوت تھا۔ سرور صاحب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ ہندوستان کی کوئی ایسی کمیٹی نہیں تھی جس کے وہ ممبر نہ ہوں۔ پوری اردو دنیا ان کے ہاتھ میں تھی۔ He was the most powerful person in Urdu world میں نے جواب دیا حضور والا آپ کا خادم اردو کے نقادوں کی آرائے محترم کو قبول نہیں کرتا، اور چلا آیا۔ سرور صاحب جیسے بیٹھے تھے، بیٹھے رہ گئے۔ جنگ کھل کر ہو چکی تھی، لیکن میں انتہائی ادب کر رہا تھا۔ سرور صاحب انتہائی ضبط سے کام لے رہے تھے۔ اتنی بات طے ہوگئی کہ میں اردو کا نہیں، ہندوستان کا Stablish writer ہوں۔ اب یہ فرمایا گیا، بلکہ مہم چلائی گئی کہ ٹھیک ہے انھیں اردو آتی ہے، لیکن انگریزی نہیں جانتے۔ اس مہم کے پیچھے حقیقت اتنی تھی کہ ریڈرشپ آنے والی تھی۔ ڈر تھا کہ میں اپلائی نہ کردوں۔ کرنل صاحب کی بیگم قدسیہ زیدی بہت اسمارٹ لیڈی تھیں اور یونیورسٹی کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والی خاتون تھیں، اور Aristocracy ان کے مزاج میں شامل تھی۔ ان کو خیال آیا کہ معلوم کیا جائے اس یونیورسٹی میں سب سے well dressed ٹیچر کون ہے۔ پوری خاموشی کے ساتھ وہ دو ایک خواتین کے ہمراہ شعبہ ہائے تعلیم کا دورہ کرنے لگیں۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میرے والد مستقل سیاحت پر رہتے تھے، شکار پر رہتے تھے اور میں ان کو ہڑکتا تھا اور روتا تھا۔ میری والدہ وہ سب کچھ کرتی تھیں جس سے میں بہلایا جا سکوں۔ کھانے کے علاوہ مجھے خوش کرنے کے لیے وہ عمدہ کپڑے اور جوتے دے کر مجھے خوش کرنا چاہتی تھیں۔ بہت کم عمری سے میں عمدہ لباس کا عادی ہو چکا تھا۔ بیگم صاحب جب تشریف لائیں تو میں Tip-Top تھا۔ تھری پیس ٹائی، بٹلر سوٹ، روزمرہ میں پہنے ہوا تھا۔ انھوں نے کن انکھیوں سے دوبار مجھے دیکھا پھر پوچھا آپ کا کیا نام ہے۔ میں نے نام بتایا۔ چلی گئیں۔ چند روز کے بعد ایک خط آیا کہ آپ کل شام کو چائے میرے ساتھ پیجیے۔ میں اب بہترین کپڑے پہن کر پہنچا۔ بیگم صاحب نے کھڑے ہو کر

استقبال کیا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ فرمایا آپ اس یونیورسٹی کے سب سے well dressed ٹیچر ہیں اور ایک لفافہ پیش کیا۔ اس میں گیارہ سو روپے تھے۔ باہر نکل کر میں سیدھا شہر گیا۔ Bata کی دُکان سے Ambassador جوتا خریدا، جو باٹا کا سب سے قیمتی جوتا تھا۔ یہ میں نے اس لیے بتایا کہ بیگم صاحب سے میرا تعارف ہو چکا تھا، چنانچہ پھر ایک خط آیا۔ کل آپ میرے ساتھ چائے پیجیے۔ ان کو بھی بتایا گیا تھا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔ سلام کے جواب میں انھوں نے فرمایا۔ Ebson کا ڈرامہ ہے Doll's House آپ نے اس کا نام سنا ہے۔ میں نے بہت لاپرواہی سے عرض کیا کہ میں پڑھ چکا ہوں۔ جی....؟ آپ پڑھ چکے ہیں؟ تو کیا آپ اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا انشاءاللہ ہو جائے گا۔ کتنے دن میں ہو جائے گا؟ میں نے کہا جو تین دن کی چھٹی آ رہی ہے، اسی میں انشاءاللہ ہو جائے گا۔ انھوں نے کتاب جلدی سے میرے حوالے کی۔ جب چھٹیاں ختم ہوئیں تو چپراسی کے ذریعے مجھے فوراً بلایا گیا۔ بیگم صاحبہ ہمیشہ کی طرح کھڑی ہوگئیں اور میرا ترجمہ دونوں ہاتھوں سے لیا۔ ادھر اُدھر سے دیکھا، چائے پلائی اور فرمایا اتوار کی شام آپ تشریف لائیے گا، جب تک میں اسے دیکھ لوں گی۔ میں نے اتوار کی شام کو جام دانی کی شیروانی اور بٹلر سوٹ پہنا اور خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ پھر کھڑی ہوئیں، چائے پلائی اور چلتے وقت ایک لفافہ پیش کیا۔ میں نے بہت انکار کیا، وہ میرے انکار سے خوش ہو رہی تھیں، لیکن حکم دیا کہ لفافہ آپ کو لینا ہی ہے۔ میں آپ سے بڑی ہوں، اس لیے آپ کو حکم دیتی ہوں۔ اس میں بھی گیارہ سو روپے تھے۔ جناب راشد انور راشد صاحب جب آدمی کی تنخواہ تین سو روپے ہو تو آپ جانتے ہیں کہ گیارہ سو روپے کے کیا معنی ہیں۔ یعنی تقریباً چوگنی تنخواہ۔ ان تمام واقعات نے شعبۂ اردو میں مجھے بالکل تنہا کر دیا۔ ہر شخص Compelx میں مبتلا تھا۔ ہر شخص سے مراد چودھری صاحب اینڈ کمپنی۔ ریڈرشپ آئی، ہم نے اپلائی کیا۔ ہم کو انٹرویو میں

نہیں بلایا گیا۔ خلیل صاحب ریڈر ہو گئے۔ ہم نے وائس چانسلر صاحب کو تمام واقعات سے آگاہ کرایا۔ انھوں نے بلا کر سمجھایا اور بتایا کہ دوسری ریڈر شپ آ رہی ہے، اس میں آپ ہو جائیں گے انشاء اللہ۔

شد: تو کیا واقعی جب ریڈر شپ کی جگہ آئی تو تمام کام بہ حسن وخوبی انجام پاتے چلے گئے۔ یعنی آپ کے مخالفین کا ایک گروپ سرگرم عمل تھا، تو اس گروپ نے یہاں بھی اپنی موجودگی کا ثبوت تو ضرور دیا ہوگا۔ آپ نے ان تمام حالات کو کس طرح اپنے قابو میں کیا؟

نبی عبدالستار: ریڈر شپ آئی، پوسٹ Advertise ہوئی اور تنقید کی کتاب کو ضروری سمجھا گیا۔ ڈاکٹر علیم وائس چانسلر تھے۔ میں ان کے پاس گیا کہ یہ ٹیلر میڈ Advertisement ہے۔ حیدرآباد سے مغنی تبسم صاحب لائے جا رہے ہیں۔ وہ مسکرائے۔ وائس چانسلر میں ہوں، آل احمد سرور پروفیسر ہیں۔ آپ انٹرویو میں آیئے۔ ہم انٹرویو میں گئے۔ پوری کمیٹی سرور صاحب کی، ہم reject ہو گئے۔ وائس چانسلر کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ علی گڑھ میں دو نثر نگار ہیں۔ ایک رشید احمد صدیقی، دوسرے قاضی عبدالستار۔ اگر قاضی عبدالستار ریڈر نہیں ہو سکتے تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ کمیٹی برخواست۔ وہاں مٹھائیوں کے تھال آ چکے تھے۔ مغنی تبسم کے لیے ہار وار بھی بن چکا تھا، سب پر اوس پڑ گیا۔ پندرہ دنوں کے اندر فوراً دوسرا Advertisement ہوا۔ اس میں لکھا گیا کہ تخلیقی کام ضروری ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن شاید اس وقت ڈین تھے۔ علیم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اب ڈپارٹمنٹ تو آپ کے خلاف ہوگا ہی۔ آپ پروفیسر نورالحسن سے مل لیجیے۔ President of India کا نامنی اور ڈین دونوں میرے ساتھ ہونے چاہیے۔ میں پروفیسر نورالحسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ میری داستان سنتے رہے۔ اپنے خاص انداز میں فرمایا برادر، جو اُن کا تکیہ کلام تھا، آپ ریڈر ہو گئے۔ میں چپ۔ یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا سر کیسے یقین آ سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی میز کی دراز کھولی، ایک فائل نکالی، فرمایا۔ اردو کے اللہ میاں (پروفیسر آل احمد سرور) نے وائس چانسلر کو یہ درخواست دی ہے کہ ان کی عمر زیادہ لکھی ہوئی ہے، اسے درست کیا جائے۔ وائس چانسلر نے فائل مجھے دی Comments کے لیے۔ تو برادر معاملہ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے کا ہے۔ آپ ریڈر ہوں گے تو ایک طرح کا کمنٹ ہوگا۔ آپ نہیں ہوں گے جسے آل احمد سرور برداشت نہیں کر سکتے تو دوسرا کمنٹ ہوگا۔ گھنٹی بجائی، چپراسی کو بلوایا اور کہا کہ اگر مٹھائی نہیں ہے تو کم از کم بسکٹ تو کھلا دیجیے، اور وہ پہلی کمیٹی تھی کہ مجھے تین بار بے روزگار کرنے کے بعد استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور نے ریڈر شپ کے لیے میرا نام تجویز فرمایا اور مغنی تبسم کے لیے جو مٹھائی کے ڈبے آئے تھے وہ کڑوے ہو گئے۔ میں ریڈر ہو گیا۔

راشد: جب مختلف مرحلوں سے ہوتی ہوئی بات چیت یہاں تک آ پہنچی ہے تو پروفیسر شپ کے نشیب و فراز کا بیان بھی ہو جائے۔ میں نے سنا ہے کہ پروفیسر شپ کا معاملہ بڑا پیچیدہ تھا۔ ایک دو مرتبہ آپ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آخر کار آپ اس شان کے ساتھ پروفیسر ہوئے کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔

قاضی عبدالستار: وقت گزرتا رہا۔ میرے خلاف پروفیسر آل احمد سرور نے ڈین کو شکایت نامہ لکھا کہ میں Co-operate نہیں کرتا اور لوگوں سے misbehave کرتا ہوں۔ میں کلاس نہیں لیتا اور میرا یہ خط EC کے سامنے رکھا گیا۔ اس وقت ڈین پروفیسر نذیر احمد تھے۔ انھوں نے مجھے وہ خط پڑھوایا اور پھر پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر میرا ٹائم ٹیبل مجھے دیا گیا جس میں دس گھنٹے تھے اور پہلا گھنٹہ روز تھا جو میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں نے وہ ٹائم ٹیبل پھاڑ کر پھینک دیا، اور وائس چانسلر ڈاکٹر علیم سے پوری بات کی۔ وائس چانسلر نے پروفیسر سرور کو خط لکھا۔ سیشن کے درمیان میں اس وقت کوئی تبدیلی ٹائم ٹیبل میں نہیں ہو سکتی جب تک کوئی خاص بات نہ ہو۔ اب وہ مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔ میں اپنے پرانے ٹائم ٹیبل پر کام کرتا رہا۔

۱۹۷۳ء آگیا۔ مجھے ۱۹۷۳ء میں صلاح الدین ایوبی پر فکشن کا پہلا غالب ایوارڈ ملا۔
سرور صاحب اس وقت ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ آخری زمانہ تھا۔ ڈپارٹمنٹ میں بالکل خاموشی طاری ہوگئی۔ ابھی ڈپارٹمنٹ Comma سے نکلا بھی نہیں تھا کہ میں پدم شری ہوگیا۔ چند دن گزرے تھے کہ معلوم ہوا خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کو کینسر کا مرض ہوگیا ہے اور اس کے ساتھ پروفیسر کی پوسٹ بھی ایڈورٹائز ہوگئی۔ درخواستیں تو بہت تھیں۔ چار آدمی انٹرویو میں آئے۔ خلیل صاحب، میں، ثریا حسین اور ظہیر صدیقی۔ ٹائی میرے اور خلیل صاحب کے درمیان تھی۔ طے ہوا کہ ایک پوسٹ اور منگائی جائے اور دونوں کو پروفیسر بنایا جائے۔ خسرو صاب وائس چانسلر تھے، جو انتہائی ناقابلِ اعتبار اور صاف جھوٹ بولنے والے تھے۔ خلیل صاحب کی حالت بگڑنے لگی۔ بہرحال انٹرویو ہوا۔ ہم میں سے کوئی نہیں ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خلیل صاحب کا انتقال ہوگیا۔ شہریار نے لائن لی کہ ان کا انتقال میری وجہ سے ہوگیا۔ یعنی ثریا حسین اور ظہیر احمد صدیقی کی وجہ سے نہیں۔ میری وجہ سے ہوا اور پورے ہندوستان میں میرے خلاف ابھیان چلایا گیا کہ میں خلیل الرحمٰن کا قاتل ہوں۔ اب دوسری پوسٹ آ گئی۔ شہریار کی کوشش بارآور ہوئیں۔ میں پروفیسر نہیں ہوا۔ ثریا حسین اور عتیق صدیقی پروفیسر ہوگئے۔ اس پر خسرو صاحب کی بہت لے دے ہوئی۔ انٹرویو بہت دلچسپ تھا۔ میں جب انٹرویو دینے گیا تھا تو دیکھا کہ یونین کے صدر مشتاق کھلو اور سکریٹری ریاست حسین دونوں ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں اور دونوں حضرات مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے انٹرویو میں آکر ان کے ساتھ کچھ زیادتی کی۔ سرور صاحب اور خورشید الاسلام ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے، لیکن شہریار نے پوری کوشش کرکے دونوں کو ایک میز پر بٹھایا اور دونوں نے میری مخالفت کی۔ انٹرویو کے تیسرے دن میں نے اندرا گاندھی سے اپوائنٹ منٹ لیا۔ ان کے سکریٹری شاردا پرشاد نے جو خود ہندی کے مشہور ادیب تھے، مجھے پیش کیا۔

میں نے پوری داستان سنائی اور جب میں نے یہ بتایا کہ انٹرویو کے وقت وائس چانسلر یونین کے عہدے داروں سے گفتگو کرتے رہے تو اندرا گاندھی کے چہرے پر شکن پڑ گئی۔ ایک منٹ کے بعد میں اُٹھنے لگا تو حکم ہوا کہ بیٹھیے۔ فرمایا آپ باہر جا سکتے ہیں یعنی، فورین۔ میں اتنا بڑا احمق کہ میں نے انکار کر دیا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت متاثر ہو گی۔ شاردا پرشاد نے بہت گالیاں دیں اور کہا کہ آپ نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔ وہ آپ کو باہر کسی منصب پر بھیجتیں۔ خیر خسرو صاحب ریٹائر ہو گئے۔ اخبار میں خبر آئی کہ وہ جرمن کے امبیسڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ میں اخبار پڑھتے ہی ٹیکسی پر سوار ہوا اور دلّی پہنچ گیا اور شاردا پرشاد کو اخبار دکھلایا۔ شارادپرشاد نے کہا کہ انٹرویو کے پہلے آپ مجھ سے مل لیتے تو یہ ڈرامہ نہیں ہوتا۔ خیر میں ان کو جوائن نہیں کرنے دوں گا اور سات مہینے، پورے سات مہینے خسرو صاحب پی. ایم. ہاؤس کے چکر لگاتے رہے۔ شاردا پرشاد نے ملاقات نہیں ہونے دی۔ خسرو صاحب نواب علی یاور جنگ کے بھانجے تھے، بمبئی کے گورنر تھے، انھوں نے اندرا گاندھی سے سفارش کی۔ تب خسرو صاحب جرمنی جا سکے اور شاردا پرشاد نے مجھے لکھا کہ

Nawab Yawar Ali Jung Prevailed on me.

اب سید والا تبار حامد صاحب وائس چانسلر ہو کر آئے اور آتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ جو کچھ برادرانِ یوسف نے ان سے کہا تھا میرے بارے میں اس سے متاثر تھے، لیکن آہستہ آہستہ وہ پورے واقعے کو سمجھنے لگے۔ مجھے بلایا، فارم میری طرف بڑھایا، کہا کہ اسے بھر دیجیے۔ میں نے کہا جناب والا میں انٹرویو میں نہیں آؤں گا۔ میں ریڈرشپ پر ریٹائر ہو جاؤں گا اور میں اردو کے ہما شما پروفیسروں کو انٹرویو نہیں دوں گا۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ نہیں آپ فارم بھر دیجیے۔ میں نے فارم لے کر اس پر شعر لکھ دیا:

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے

اور چلا آیا۔ انٹرویو کی ڈیٹ آ گئی۔ مجھے جیسے ہی معلوم ہوا، میں پچھریٹہ چلا گیا۔ مشہور تھا جس کی میں نے تردید کی۔ سید والا تبار غریب خانے پر تشریف لائے اور بیگم صاحب سے کہا کہ قاضی صاحب کو بلوائیے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس سلسلے میں ایک جملہ بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ معلوم نہیں میرا کیا حشر بنائیں گے۔ خیر ہم شکار کھیل رہے تھے جب ملازم یہ اطلاع لے کر پہنچا کہ ہم پروفیسر ہو گئے۔ اس یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی ٹیچر جو ہندوستان میں ہے، چند روز کی چھٹی لے کر باہر گیا ہے اور وائس چانسلر نے اسے پروفیسر بنا دیا۔

راشد: قاضی صاحب، علی گڑھ کے تعلق سے آپ نے آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار سے متعلق اپنے تلخ تجربات کا اظہار کیا۔ علی گڑھ کی زندگی میں آپ کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہوگا۔ کہیں کہیں ان شخصیتوں کا سرسری ذکر گفتگو میں آیا بھی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان شخصیات سے متعلق کچھ باتیں تفصیل سے بھی بیان کریں تاکہ ایک طرف جہاں آپ کے حلقۂ احباب کا اندازہ ہو تو دوسری طرف علی گڑھ کے مخصوص ماحول کی وضاحت بھی ہو سکے۔ رشید احمد صدیقی، معین احسن جذبی، خورشید الاسلام، وارث کرمانی، وحید اختر، اختر انصاری، اسلوب احمد انصاری اور دوسرے جن سے آپ کے قریبی مراسم تھے، ان کے متعلق بھی کچھ باتیں ضرور بتائیں۔ اردو ادب میں یہ شخصیتیں خاصی معروف ہیں اور دنیا ان کے ادبی کارناموں سے خاطر خواہ واقف ہے، لیکن آپ جو کچھ بھی ان شخصیات سے متعلق فرمائیں گے، ان میں مختلف نوعیت کے ذاتی تاثرات شامل ہوں گے جن کی مدد سے بعض شخصیتوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

قاضی عبدالستار: میرے احباب کا حلقہ تو وسیع کبھی نہیں رہا، البتہ چند لوگ احباب کی مخصوص فہرست میں ضرور شامل رہے۔ ان میں کچھ بزرگ بھی تھے جن کی کرما فرمائیاں مجھے ہمیشہ نصیب ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام رشید احمد صدیقی

کا ہے۔ میں استاذ محترم رشید احمد صدیقی سے عشق کرتا ہوں، لیکن میں ان کے قریب نہیں جاتا تھا، جیسے پروانہ شمع کے قریب نہیں جاتا اور جاتا ہے تو خاکستر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا بھی کہ قاضی عبدالستار مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے لیکن میرے پاس آتا نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا تھا آپ سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ معلوم نہیں کس وقت آپ کیا کہہ دیں۔ ایک دن بلا کر انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا مطلب؟ میں چپ کھڑا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ آپ نے مجھے چھیل چھبیلا نواب کہا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ میں بہت خوش لباس تھا۔ رشید صاحب مجھے 'Dandy' کہتے تھے۔ اس کے معنی ہیں چھیل چھبیلا نواب۔ جب ریڈر کا انٹرویو ہوا تو ڈاکٹر علیم جو وائس چانسلر تھے تو انھوں نے ہمارے پروفیسر چیئر مین آل احمد سرور سے کہا تھا کہ علی گڑھ میں دو نثر نگار ہیں۔ رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالستار۔ اگر قاضی عبدالستار ریڈر نہیں ہوسکتے تو کوئی نہیں ہوسکتا۔ Selection Committee Canceal کر دی گئی۔ رشید صاحب نے مجھے طلب فرمایا اور کہا جو بات مجھے کہنی تھی وہ علیم صاحب نے کہہ دی۔ آپ کو مبارک ہو۔ ان کی محبت کے بہت سے واقعات ہیں، لیکن صرف ایک واقعہ بیان کروں گا۔ رشید صاحب چیئر مین تھے۔ مچھریٹہ میں طاعون چلا۔ اس مرض میں ہماری والدہ بھی مبتلا ہوئیں۔ ہمارے مختار صاحب نے ہم کو ٹیلی گرام دیا۔ Bibi Sahab is ill. No hope. come soon. ان صاحب کو انگریزی بولنے اور لکھنے کا بہت شوق تھا، اور نپٹ جاہل تھے۔

میں کلاس لے کر آیا۔ رشید صاحب نے بلایا۔ آپ کی والدہ کچھ بیمار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ ابھی تو ایک ہفتہ ہوا جب ان کا منی آرڈر بھی آیا، خط بھی آیا۔ کہنے لگے کہ آپ منی آرڈر بھی منگاتے ہیں اور تنخواہ بھی لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ گھر چلے جائیں۔ اس لیے کہ ایک خط آیا تھا۔ اس میں آپ کی والدہ کی بیماری کا ذکر تھا۔ یہ کل کی بات ہے۔ وہ خط میں نے کہیں کھو دیا۔ میں

پریشان ہوگیا۔ اس لیے کہ میری ماں، ماں بھی تھیں، باپ بھی تھیں۔ میں نے کہا کہ سر مجھے چھٹی مل سکتی ہے۔ جواب ملا فوراً جائیں۔ چھٹی ضرور ملے گی۔ جب میں چلنے لگا تو اپنے پاس بلایا۔ سوروپے کا نوٹ میری جیب میں رکھا اور فرمایا یہ میں خیرات نہیں دے رہا ہوں۔ یہ قرض ہے، جب آیئے گا تو واپس کر دیجیے گا۔ خیر میں سیتاپور گیا۔ والدہ اسپتال میں پڑی تھیں۔ جب وہ بہتر ہوگئیں تو میں واپس آیا۔ تب رشید صاحب نے وہ ٹیلی گرام دیا اور فرمایا کہ میں نے آپ کو یہ ٹیلی گرام اس لیے نہیں دیا کہ معلوم نہیں آپ پر کیا گزرتی۔ اس لیے میں نے افسانہ گڑھ لیا اور آپ کو سنا دیا۔ لایئے پیسے لایئے۔ میں نے نوٹ پیش کیا۔ جی ہاں بہت سی ضرورتیں رُکی ہوئی تھیں اس پیسے کی وجہ سے۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ ان کی شفقتیں یاد آتی ہیں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ میں عارضی لکچرر تھا۔ کسی طالب علم نے بتایا کہ رشید صاحب غالب پڑھا رہے ہیں۔ یہ ان کا آخری زمانہ تھا۔ غالباً ۱۹۵۷ء کا زمانہ تھا۔ وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ سر اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی کلاس میں بیٹھ جاؤں۔ سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔ فرمایا آپ تو احتشام حسین سے غالب کو پڑھ چکے ہیں۔ میں نے کہا سر اسی لیے آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ گردن کی جنبش سے اجازت میسر آئی۔ کلاس میں بیٹھے۔ پہلا شعر پڑھا—

''ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب + ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا۔''

بتیس منٹ لیے اس شعر کو سمجھانے میں۔ علم کے دریا بہا دیے۔ میں دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اُٹھے، رجسٹر ہاتھ میں لیا اور کلاس روم سے چلے گئے۔ رشید صاحب کے لیے مشہور تھا کہ وہ کم پڑھاتے تھے، لیکن بے مثل پڑھاتے تھے۔ وہ جب تک غالب پڑھاتے رہے، میں بیٹھتا رہا اور ان کے ہر لکچر کو یادگار سمجھتا رہا۔

راشد: معین احسن جذبی صاحب بھی آپ کو عزیز رکھتے تھے اور جب بھی وہ کوئی نئی

غزل کہتے، آپ ہی اس کے پہلے سامع ہوتے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ عمر کے آخری زمانے میں آپ دونوں کے درمیان کچھ اختلاف ہو گئے تھے؟

قاضی عبدالستار: جذبی صاحب سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ جب وہ نئی غزل کہتے تو غریب خانے پر تشریف لاتے۔ وہ مجھے 'استاذ' کہتے تھے۔ یہ بذاتِ خود ایک شرف ہے۔ فرماتے۔ استاد ایک غزل ہوئی ہے، مگر شرط وہی ہے۔ میں کہتا جی مجھے منظور ہے۔ ان کی شرط یہ ہوتی تھی کہ بیت الغزل پر انگلی رکھنا اور جس دن آپ بیت الغزل پر انگلی نہیں رکھیں گے آپ کو غزل سنانا بند کر دیا جائے گا۔ تو آپ سوچیے کہ میں کس طرح کانپتا کانپتا سنتا رہا ہوں گا، لیکن خدا کی رحمت کہ بیت الغزل کے معاملے میں میں ہمیشہ کامیاب ہوا۔ ان سے آخری زمانے میں میرے جو اختلافات ہوئے، اس کا سبب یہ تھا کہ میں ٹہلنے کا پابند تھا مگر اکیلے اور جذبی صاحب تنہا نہیں ٹہل سکتے تھے۔ انھیں ہر شام کو ایک آدمی چاہیے تھا ٹہلنے کے لیے اور شام کا وقت میرے کلب جانے کا ہوا کرتا تھا۔ جب انھیں کوئی نہیں ملتا تو وہ کلب تشریف لے آتے۔ تھوڑی دیر بیٹھتے، چائے پیتے، گپ کرتے اور فرماتے چلو ٹہلنے چلو۔ میں چوں کہ Billiard اور شطرنج پابندی سے کھیلا کرتا تھا، لہٰذا ان سے معذرت کر لیتا جو انھیں ناگوار گزرتا۔ اس لیے آخری زمانے میں بیماری سے قبل وہ کچھ ناخوش رہنے لگے تھے۔ ایک بار ہم لوگ آنند بھون سے نکلے۔ جذبی صاحب، جیلانی بانو کے شوہر انور معظم (جو آج خود ایک مشہور ہستی ہیں) کے ساتھ خاکسار بھی تھا۔ جذبی صاحب حسبِ دستور ننگے سر تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ دودھ پور کے تھانے کے قریب ایک دو بوندیں پڑیں۔ جذبی صاحب نے فرمایا بھئی جلدی چلو پانی آ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں آواز ہم نے بھی سنی تھی۔ کیا مطلب؟ گھور کر پوچھا۔ میں نے کہا سر مبارک پر ایک موٹا سا بوند اتنی آواز سے گرا کہ ہم سب لوگ چونک پڑے۔ انور نے قہقہہ لگایا۔ جذبی صاحب

نے اپنی چھڑی گھمائی۔ انور بھاگ لیا اور میں دور ہوگیا۔ جذبی صاحب انتہائی خوش مزاج اور دلچسپ آدمی تھے۔ اگر کوئی اچھا جملہ ان کے سامنے ہو جاتا تو وہ داد دیتے چاہے اس کی ضرب انھیں پر پڑ رہی ہو۔ اب ایسے بزرگ بھی مشکل سے ملیں گے۔ بعض باتیں ذہن میں آتی ہیں اور پھر فوراً نکل جاتی ہیں۔ اس کا سبب عمر ہے۔ آخری دنوں میں ہمارے درمیان بس ایک سنگین خاموشی پیدا ہوگئی تھی، ورنہ وہ مجھ سے آخری وقت تک محبت کرتے رہے۔ جب بھی ملتے پُرجوش محبت کا اظہار کرتے۔ جذبی صاحب مجھ سے بہت خوش رہتے تھے۔ ''داراشکوہ'' کے لیے ان کا جملہ سارے علی گڑھ میں مشہور ہوگیا تھا کہ ''داراشکوہ'' میں قاضی عبدالستار نے استعارات کا جلوس نکال دیا ہے۔

راشد: استادِ محترم رشید احمد صدیقی اور معین احسن جذبی سے متعلق آپ کے تاثرات تو مختلف حوالوں سے دوسری جگہوں پر بھی آتے رہے ہیں، لیکن علی گڑھ میں بلکہ شعبۂ اردو میں اور بھی کچھ نمائندہ شخصیات تھیں جن سے آپ کے قریبی مراسم رہے تھے۔ یہ شخصیات چوں کہ ادبی سطح پر بھی فعال تھیں، لیکن ان سے متعلق آپ کے تاثرات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً خورشید الاسلام اپنے زمانے میں ادبی سطح پر بھی کافی سرگرم تھے اور انھوں نے تخلیقی تنقید کی بنا پر ادبی دنیا میں ہنگامے بھی برپا کیے تھے۔ ان سے متعلق آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں تو خوشی ہوگی۔

قاضی عبدالستار: منشی مہر الاسلام یعنی خورشید الاسلام عجیب و غریب آدمی تھے۔ ذہین آدمی تھے۔ کبھی پڑھا لکھا بھی ہوگا، لیکن جب وہ انگلینڈ سے آئے شاید ۱۹۵۷ء میں تو وہ بانجھ ہو چکے تھے۔ وہ ہمارے بہت عزیز دوست مسعود عالم کے ماموں تھے۔ مسعود عالم نے ہی میرا ان سے تعارف کرایا۔ میرے یہاں رشتوں کی بڑی قدر ہے۔ میں نے ان کو ماموں کا ہی مرتبہ دیا۔ جب وہ تشریف لاتے تو جیسی خاطر مدارات میں کرسکتا، وہ کرتا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی شام کی محفلوں میں شریک

کرنے لگے۔ وہ بلانوش تھے۔ نشے میں احمقانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ خورشید صاحب استادِ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی سلمٰی صدیقی سے شادی کرنا چاہتے تھے، جو ظاہر ہے کہ ممکن نہیں ہوئی۔ اب خورشید صاحب چڑھ گئے۔ چوں کہ رشید صاحب جون پور کے تھے اور جون پور پورب میں ہے، اس لیے وہ پورب کو گریاتے رہتے تھے۔ میں پہلے سمجھتا نہیں تھا، پھر کچھ سن گن ملی۔ بدکلام اور بدمزاج میں خود بھی کیا کم تھا بلکہ ہوں۔ ایک دن شام کی محفل میں بھڑک گیا۔ میں نے کہا دلّی کا پورب لکھنؤ ہے۔ کہنے لگے کہ جی۔ میں نے کہا لاہور کا پورب دلّی ہے اور پشاور کا پورب لاہور اور کابل کا پورب پشاور ہے۔ تو اس حساب سے بی بی دلّی کا حساب کہاں آیا۔ بہت زور سے چیخے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا خورشید صاحب میں آپ کا شاگرد نہیں ہوں۔ میں آپ کا لحاظ جو کر رہا ہوں، وہ مسعود عالم کے ماموں کا کر رہا ہوں۔ میں اس لہجے اور ان الفاظ میں گفتگو سننے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ بس خاموش ہو جائیں۔ موصوف خاموش ہو گئے، لیکن باطنی طور پر تعلقات ختم ہو گئے۔ وہ میرے گھر آتے تھے، اپنے گھر بھی بلاتے تھے۔ اپنی محفلوں میں شریک بھی کرتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے پروفیسر نہیں ہونا ہے، اور میری پوری مخالفت انھوں نے کی، لیکن میں نے ان سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ حضور خورشید الاسلام صاحب آپ مجھے سپورٹ کیجیے۔ میں نے اپنی پوری عمر میں کسی پروفیسر سے، کسی شخص سے، اپنی سفارش نہیں کرائی، جس کا انھیں بہت دکھ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان سے گزارش کروں، لیکن یہاں یہ حال:

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ایک دن فرمانے لگے کہ آپ کو معلوم ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے میرے

لیے کیا کہا۔ میرے مضمون کا ایک جملہ پڑھ کر وہ اُچھل پڑے تھے کہ شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ میں نے کہا خورشید صاحب! مولانا کے بارے میں مشہور ہے کہ شام کے وقت تنہا محفل سجاتے تھے۔ اس عالم میں انھوں نے پڑھا ہوگا اور وہ اُچھل پڑے ہوں گے ورنہ یہ جملہ مہمل ہے۔ یونانی سے کیا مطلب ہے آپ کا۔ یونانیوں کا تو بہت ذکر قومِ لوط کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ آپ کیا بکتے ہیں، بہت زور سے چلّائے۔ میں نے عرض کیا چلّایئے مت۔ شبلی کی یونانیت پر روشنی ڈالیے، محفل برخاست ہوگئی۔

راشد: علی گڑھ میں ہمیشہ سے ہی اردو شعروادب کی ایک کہکشاں موجود رہی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاعر و ادیب نے علی گڑھ کی ادبی فضا کو مستحکم کرنے میں بھرپور تعاون دیا۔ عصری رقابتیں بھی تھیں اور گاہے بہ گاہے اختلافات اور رنجشوں کا اظہار بھی کیا جاتا تھا، لیکن نمایاں ادبی شخصیتوں کی موجودگی نے ہمیشہ ہی علی گڑھ کو مرکز میں رکھا۔ یہاں کے ادیب و شاعر ادبی سطح پر اپنی فعالیت کا ثبوت بھی پیش کرتے تھے اور پوری اردو دنیا اس کا اعتراف کرتی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ شعروادب کی نمائندہ شخصیات صرف شعبۂ اردو سے وابستہ نہیں ہوتی تھیں۔ بہت سے لوگ دوسرے شعبوں سے متعلق ہوتے تھے، لیکن اردو شعروادب کے تئیں ان کی جو بنیادی دلچسپی تھی، اور جس کی بدولت ان کی بنیادی شناخت قائم تھی، اس بنا پر دوسرے مضامین سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ اردو شعروادب کا ناگزیر حصہ تھے۔ ایسی شخصیتوں میں وحید اختر کی شخصیت بے حد نمایاں تھی۔ وہ شعبۂ فلسفہ میں پروفیسر تھے اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین بھی رہ چکے تھے لیکن ادبی حلقوں میں ایک معیاری شاعر اور بہترین ناقد کی شناخت رکھتے تھے۔ یقیناً آپ کے بھی ان سے مراسم رہے ہوں گے۔ ان سے متعلق ادبی فرمودات تو دوسری جگہوں پر بھی مل جائیں گے لیکن آپ شخصی اعتبار سے ان کا مختصر جائزہ پیش کریں۔

قاضی عبدالستار: وحید اختر جب علی گڑھ آئے تو میرا تعارف انور معظم نے کرایا جو جیلانی بانو

کے شوہر ہیں اور خود ایک مشہور عالم ہیں۔ شروع میں بہت رسمی تعلقات رہے لیکن آہستہ آہستہ ہماری ان سے دوستی ہوگئی، اور جب وہ اپنی شادی کرنے حیدرآباد گئے تو اپنی آمد کی تاریخ سے صرف مجھے مطلع کیا۔ ان کو لینے کے لیے ہار پھول لے کر علی گڑھ سے صرف میں اسٹیشن گیا تھا جسے انھوں نے ساری عمر یاد رکھا۔ ان لوگوں کو جو مجھ کو پسند نہیں کرتے تھے، یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور میرے ان کے درمیان ناخوش گواریوں کی پوری ایک خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وحید اختر چار بھائی تھے۔ ایک بھائی آگرے میں جوتوں کے کارخانے میں ملازم تھا۔ دوسرے وحید اختر تھے۔ تیسرے کا نام احمد تھا۔ چوتھے کا نام نوید تھا۔ احمد اور نوید دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ احمد بہت مفسد آدمی تھا۔ وحید اختر کی بیوی حیدرآباد گئیں۔ وہاں سے انھوں نے وحید اختر کو خط لکھے۔ ڈاک ایسے وقت آتی تھی جب ہم لوگ ڈپارٹمنٹ میں ہوتے تھے۔ نوجوان احمد لفافے پھاڑ کر خط پڑھ لیا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے کسی بات پر اسے ڈانٹا۔ ہمارے اور وحید اختر کے مکان کے بیچ میں ایک دیوار تھی اور جمعدارن ایک ہی تھی جو دونوں گھروں میں کام کرتی تھی۔ ہمارے یہاں کے کوڑے میں احمد نے وہ لفافہ ڈال دیا اور خود ہی برآمد کر لیا اور وحید اختر کو دکھلا دیا کہ قاضی صاحب آپ کا خط پھاڑ کر پڑھ لیتے ہیں۔ وحید اختر کان کے کچے اور خاصے شعلہ مزاج تھے۔ لفافہ لے کر میرے پاس آئے کہ یہ آپ کے کوڑے سے برآمد ہوا ہے۔ یہ میری بیوی کے خط ہیں جو آپ نے غائب کر دیے۔ میں نے پوچھا یہ نادر اطلاع آپ کو کہاں سے فراہم ہوئی۔ بولے، احمد کہہ رہا تھا۔ احمد کے بارے میں ایک اور بات سن لیجیے۔ وہ باہری کمرے میں لیٹتا تھا۔ رات میں کسی وقت بھی دروازہ بند کر کے کہیں بھی چلا جایا کرتا تھا۔ ایک بار وحید اختر میرے پاس آئے اور کہا احمد رات میں نوٹنکی دیکھنے جانا چاہتا ہے۔ منع کرتا ہوں تو مانتا نہیں ہے۔ ذرا آپ ڈانٹ دیجیے۔ میں نے نہ صرف ڈانٹا بلکہ دھمکایا بھی کہ اگر تم نوٹنکی

دیکھنے گئے تو تمہاری ہڈیاں تڑوادوں گا۔ میں نے وحید اختر کو یہ واقعہ یاددلایا۔ وہ چپ تو ہو گئے لیکن دل صاف نہیں ہوا، اور کبھی کبھی وہ مجھ سے اُلجھنے لگے۔ جب میری پروفیسری کا معاملہ آیا تو انھوں نے میری شدید مخالفت کی۔ میں انگیز کرتا رہا۔ جب ان کی بیگم کے ساتھ ہوائی حادثہ ہوااور وہ انتقال فرما گئیں اور جب مجھے معلوم ہوا تو میں فوراً گیا۔ باہران کے شعبۂ فلسفہ کے کچھ لوگ پیڑ کے نیچے کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ میں سیدھا ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے، اور بہت روئے، ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہم نے بھی رونے میں کوئی کمی نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے بیٹے نے کہا کہ بابا کھانا نہیں کھا رہے ہیں، دوا نہیں پی رہے ہیں، صرف شراب پی رہے ہیں۔ میں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ کھانا لگوایا۔ کھایا تو خیر کیا، لیکن میرا دل رکھنے کو دو چار لقمے نگل لیے اور دوا بھی پی لی۔ میں بارہ بجے کا گیا ہوا پانچ بجے ان کے گھر سے نکلا۔ چلتے وقت کسی بچے نے کہا کہ آپ رات میں بھی آجایئے تا کہ بابا دوا پی لیں اور کھانا کھالیں۔ میں نے وحید اختر کے سامنے جو مجھے باہر رخصت کرنے آئے تھے، نوکر سے کہا کہ رات کا کھانا میں وحید اختر کے ساتھ کھاؤں گا۔ اس عالم میں بھی وحید اختر جملے بازی سے باز نہیں آئے۔ نوکر سے کہا آج قاضی صاحب کے یہاں کھانا نہیں پکے گا۔ اس لیے یہ بے چارے یہیں کھائیں گے۔ میں مسکرایا اور چلا آیا۔ آٹھ بجے رات کو پہنچا۔ ان کی شراب کی بوتل چھین کر کونے میں رکھ دی۔ دوا پلوائی۔ دس بجے کے قریب کھانا لگوایا اور اب انھوں نے کھانا کھایا جسے کھانا کھایا کہتے ہیں۔ پھر دوا پلوائی۔ بارہ بجے رات کو اپنے گھر آیا۔ اب ہمارے تعلقات بہت اچھے ہو چکے تھے۔ میں ہر آٹھویں دسویں روز ان کے یہاں جاتا تھا۔ وہ بھی میرے پاس آتے۔ ایک بار میں ان کے گھر گیا تو ان کے بیٹے نے کہا کہ بابا شادی کر رہے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا، لیکن بچوں نے اتنے دکھ اور یقین سے کہا کہ ان کی دل داری کے لیے میں نے زور دے کر

کہا کہ انشاء اللہ ہرگز ہرگز شادی نہیں ہوگی۔ چند روز بعد میں وحید اختر کے پاس گیا تو وحید اختر نے خود کہا کہ قاضی صاحب میں جب مروں گا تو میری پنشن ضائع ہوگی، تو چاہتا ہوں کہ کسی ادھیڑ سیدانی سے شادی کرلوں۔ میرے بعد وہ پنشن پاتی رہے گی۔ میں نے کہا ہاں یار ہمارے بزرگوں کا قاعدہ تھا کہ خدمت خلق کے لیے سرائے بنواتے تھے، باغ لگاتے تھے، کنویں کھدواتے تھے۔ تم اپنی بیوہ چھوڑ جانا۔ بس حلف ہوگیا اور گالیاں بکنے لگا، لیکن تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ جب نارمل ہوا تو بولا قاضی صاحب یہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں، میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور کہا میں اپنے سر کی قسم کھا کر تم سے کہہ رہا ہوں اور جب تک تم مرو گے نہیں اور ہم زندہ رہیں گے تو تمہارے پاس آنے جانے میں جو وقفہ ہوتا ہے، یہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ پھر گالیاں بکنے لگا، لیکن رات کے گیارہ بارہ بجے تک میں نے اسے قائل کرلیا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔

وحید اختر کی بیگم مہ لقا شعبۂ انگریزی میں ریسرچ اسکالر تھیں، اور صدر شعبہ اسلوب احمد انصاری سے کچھ کبیدہ خاطر تھیں، اور وحید اختر، انصاری صاحب سے سخت ناخوش تھے۔ اتفاق سے اسلوب احمد انصاری کی بیٹی نے انگریزی میں ہی تھیسس جمع کیا۔ وحید اختر ڈین تھے، وہ تھیسس کو داب کر بیٹھ گئے۔ اسلوب احمد انصاری میرے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر آپ سفارش کردیں تو بیٹی کی تھیسس جمع ہوجائے گی۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار ہوئی کہ اگر آپ باپ سے ناخوش ہیں تو اس کے بچوں نے آپ کا کیا بگاڑا۔ میں اسی دن شام کو پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں نے ذکر چھیڑا، وہ گالیاں بکنے لگا۔ میں بھی گالیاں بکنے لگا۔ اب ایک سیدزادہ گالیوں میں زمین دار کے پوت سے نہیں جیت سکتا تھا، وہ چپ ہوگیا۔ دوسرے دن میں ڈین آفس گیا۔ اپنے ساتھ لڑکی کی تھیسس Dispatch کرائی۔ جب سب کام ہوگیا تو بولا پورے علی گڑھ میں کوئی مائی کا لال مجھ سے یہ کام نہیں کرواسکتا تھا جو آپ نے کرالیا۔ نہ صرف یہ

بلکہ جب میرے ریٹائرمنٹ کا مسئلہ درپیش ہوا تب وحید اختر ہی ڈین تھے، انھوں نے میرے Extention کے سلسلے میں اتنا زبردست خط وائس چانسلر کو لکھا کہ پروفیسر عبدالعلیم اس خط کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے اور مجھ سے کہا کہ وحید اختر نے جیسا خط آپ کے لیے لکھا ہے، آپ کا کوئی عزیز ترین دوست بھی نہیں لکھ سکتا۔ بہت سے شاعروں کی طرح وحید اختر کو شراب نے پی لیا۔ ان کی وفات کے بعد جب تعزیتی جلسہ ہوا تو میں نے صدارت کی کرسی سے عرض کیا تھا کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میری تعزیت میں جلسہ برپا ہوتا اور وحید اختر صدارت کر رہے ہوتے، لیکن تقدیر الٰہی۔

راشد: قاضی صاحب علی گڑھ میں دوسرے شعبوں سے متعلق ایسی شخصیتیں بھی خاصی تعداد میں رہی ہیں جن کی بنیادی شناخت اردو شعر و ادب سے وابستہ تھی۔ بعض لوگوں کے حوالے سے تو ایک عرصے تک یہ تصور عام رہا کہ یہ لوگ شعبۂ اردو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو نام تو فوراً ہی ذہن میں دستک دے رہے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری اور سید امین اشرف۔ ایک نے اردو تنقید میں شہرت حاصل کی دوسرے نے اردو شاعری کی بدولت اپنا وقار قائم رکھا۔ ان دونوں سے آپ کے بھی قریبی مراسم رہے ہوں گے۔ اگر قریبی مراسم نہ بھی ہوں تو بہر حال برسوں تک ملنا جلنا تو رہا ہی ہوگا۔ پہلے میں اسلوب احمد انصاری سے متعلق آپ کے تاثرات جاننے کا خواہش مند ہوں۔ ایک تخلیق کار کے تاثرات، نقاد کے متعلق قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر نقاد نے اس تخلیقی فن کار سے متعلق کچھ لکھا ہو تو یقیناً تخلیقی فن کار کے تاثرات مثبت ہوں گے، بہ صورت دیگر وہ نقاد کو آڑے ہاتھوں لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اسلوب احمد انصاری نے آپ یا آپ کے فن پر کچھ نہیں لکھا۔ ایسی صورت میں آپ اسلوب صاحب کے کس طرح قائل ہو سکتے ہیں؟

قاضی عبدالستار: دیکھیے میرے قائل ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ لکھنے سے متعلق ہرگز نہیں ہے۔

کس نے مجھ پر لکھا، یا نہیں لکھا، میں اس کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ میں شعبۂ انگریزی میں سلامت اللہ خاں صاحب کا قائل تھا، اور انگریزی زبان کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو میں ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ جب میں نے بیگم قدسیہ زیدی کے ارشادِ گرامی کی تعمیل میں A Dolls House کا ترجمہ کیا تو میں نے کئی مقامات پر سلامت صاحب کا مشورہ لیا تھا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھے، اور اسلوب صاحب سے سخت ناخوش تھے۔ سلامت جب پروفیسر نہیں ہوئے تو انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا: Osloob succeeded to ruin my career.۔ اس پس منظر میں میرے تعلقات کبھی بھی اسلوب احمد انصاری سے بہت شگفتہ نہیں رہے۔ سلامت صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور میں سلامت صاحب ہی کے مکان میں منتقل ہو چکا تھا کہ ایک شام اسلوب احمد انصاری تشریف لائے، اور بیٹھتے ہی فرمایا کہ آپ بیگم فخر الدین علی احمد صاحب کے نام خط لکھ دیجیے کہ اس سال کا غالب ایوارڈ مجھے تفویض کیا جائے۔ میں نے کہا کہ بیگم صاحبہ سے میرے ایسے مراسم نہیں ہیں کہ میں ان سے سفارش کرنے کی جسارت کرسکوں، لیکن اسلوب صاحب نہیں مانے اور آخر میں کہا کہ آپ خط لکھیے۔ اگر ان پر آپ کے خط کا اثر نہیں ہوتا تو مجبوری ہے۔ یہ کہہ کر میرا پیڈ جو سامنے میز پر رکھا تھا، میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے طوعاً کرہاً بہت مختصر سا ایک خط لکھا اور کہا کہ میں یہ خط پوسٹ کرادوں گا۔ اسلوب صاحب نے وہ خط میرے ہاتھ سے لے لیا اور فرمایا کہ خط کو پوسٹ میں کردوں گا اور چلے گئے۔ میں دم بخود بیٹھا رہا۔ دوسرے دن میں صدر جمہوریہ عالی جناب فخر الدین علی احمد صاحب کی بہن حمیدہ سلطان صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا جو مجھے اپنا چھوٹا بھائی کہتی تھیں، اور اپنی بپتا سنائی۔ وہ مسکراتی رہیں اور فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ تمہارے سفارش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کل تمہارا پروگرام کیا ہے۔ کل تم دہلی رُک سکتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں آپ

کے حکم کی تعمیل میں رُک جاؤں گا اور میں پروفیسر شعیب احمد قدوائی کے پاس ٹھہر گیا۔ مشورہ یہ تھا کہ دوسرے دن لنچ کے وقت میں بظاہر اچانک حمیدہ آپا سے ملنے جاؤں گا جو بیگم صاحبہ کو لنچ کے لیے مدعو کر چکی ہوں گی اور اس طرح میں بیگم صاحبہ کے ساتھ لنچ کی میز پر شرکت کروں گا۔ چنانچہ میں پروگرام کے مطابق علی منزل پہنچا۔ بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ میری ملاقات ہوئی۔ میں نے بہت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں علی گڑھ سے اس لیے آیا ہوں کہ حمیدہ آپا میرا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش فرمائیں اور آپ اس پر ہمدردی کے ساتھ فیصلہ فرمائیں۔ بیگم صاحبہ نے بھی وہی جملہ کہا جو حمیدہ آپا نے دہرایا تھا، اور فرمایا کہ آپ مجھے بھابھی صاحب کہتے ہیں تو پھر آپ کو یہ کیسے یقین ہو گیا کہ آپ مجھ سے کوئی سفارش نہیں کر سکتے۔ میں انشاء اللہ پوری کوشش کروں گی۔ چند روز میں اعلان ہو گیا کہ اسلوب صاحب کو غالب ایوارڈ تفویض ہو گیا۔ اس کہانی کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ اسلوب صاحب نے مجھ سے اس ایوارڈ کا ذکر تک نہیں کیا۔ سید امین اشرف بے حد مخلص انسان تھے اور دوستوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کے حوالے سے بھی ڈھیر ساری یادیں ہیں، لیکن ان کا ذکر کبھی اور کروں گا۔

راشد: قاضی صاحب! معاصرانہ چشمک کے باعث دو شخصیتوں کے مابین خاص طرح کی دوری کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن کیا اسی بنا پر کسی شخصیت کو پوری طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ہمارے ساتھ بہتر رویہ رکھتے ہیں، جب کہ بعض لوگ پوری زندگی ہماری مخالفت میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم اپنے کرم فرماؤں سے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں، جب کہ مخالفین کو قدرے مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہے، لیکن کسی بھی شخصیت کو ہم صرف اسی بنا پر نظر انداز کر دیں کہ ان سے ہمارے معاملات درست نہیں ہیں، تو یہ بھی تو مناسب نہیں ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی سے

آپ کے شدید اختلافات تھے، لیکن ادبی منظرنامے پر ان کی اہمیت کو تو آپ بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ کیا شخصیت کی سطح پر اختلافات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ باقی تمام چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے حوالے سے بہت سی باتیں آپ کی گفتگو میں آئی ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ اور پہلوؤں کی وضاحت ہو۔

اضی عبدالستار: بھئی میں بہت سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرتا ہوں اور جب وہ رائے قائم ہو جاتی ہے تو اس میں تبدیلی کی گنجائش ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بہت بڑے گروہ بند شاعر تھے۔ ان کے گروہ کا کمال یہ تھا کہ معین احسن جذبی، اختر انصاری، وامق جون پوری اور منیب الرحمٰن جیسے شاعر بھی علی گڑھ میں موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ علی گڑھ کے مشاعروں میں شرکت کرنے کی جسارت کریں، کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی، کہیں بھی، آ گیا تو ان کا گروہ (''گروہ'' کا صحیح استعمال اس جگہ ہو رہا ہے) ان کی ہوٹنگ کرنے لگتا تھا۔ جس زمانے میں تنخواہ ۲۹۹ روپے ۹۰ پیسے تھی، اس وقت خلیل الرحمٰن اعظمی کا ڈاک خرچ تیس روپے ماہوار تھا۔ یہ اس وقت تھا جب موصوف صرف پوسٹ کارڈ لکھتے تھے۔ چوں کہ میں نے ان کو کبھی چودھری قبول نہیں کیا تو وہ میرے خلاف رہتے ہی تھے اور رہنا چاہیے تھا۔ ایک بار سرور صاحب کے ڈرائنگ روم میں ذکر ہو رہا تھا کہ ہم عصر ادب کا مطالعہ رسائل و جرائد کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ ایک بار سرور صاحب نے نگاہ اُٹھائی اور پوچھا قاضی صاحب آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا جناب والا آج مطالعے کے لفظ کے ساتھ شرط آپ نے پہلی بار لگائی ہے۔ آپ کے خادم کی رائے میں ادب کا مطالعہ کتابوں سے ہوتا ہے۔ سرور صاحب مسکراتے رہے اور خلیل الرحمٰن اعظمی بلبلاتے رہے۔ اصل میں یہ لوگ جو میرے خلاف تھے تو غلط نہیں تھے۔ میں کسی کو بخشتا نہیں تھا۔ ایک بار خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار اور ہم 'آنند بھون' سے

ڈپارٹمنٹ جارہے تھے۔ دودھ پور میں ڈاک خانے کے پاس پہنچے تو خلیل صاحب نے کہا یہ احتشام حسین معلوم نہیں کیا لکھتا رہتا ہے اَلّم غلّم۔ میں احتشام صاحب کا چہیتا شاگرد تھا۔ میرے آگ لگ گئی۔ شہریار نے چھیڑا قاضی صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا ہاتھی چلتے رہتے ہیں۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ اس وقت سے باقاعدہ جنگ ہوگئی جو الحمدللہ آخری وقت تک قائم رہی۔ خلیل صاحب بہت معمولی کپڑے پہنتے تھے۔ مجھے بچپن سے لباس کا ذوق و شوق رہا۔ میں عام طور پر عمدہ کپڑے پہنتا تھا۔ خلیل صاحب یہ کہتے تھے کہ جو شخص عمدہ کپڑے پہنتا ہے، وہ ادیب و شاعر نہیں ہوسکتا۔ اس کا سارا وقت کپڑوں کے انتخاب میں صَرف ہوجاتا ہے۔ میرا جواب تھا کہ آپ نے جتنا لکھا ہے اس کو ترازو پر رکھیے اور میں نے جتنا لکھا ہے اس کو بھی ترازو پر رکھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں کپڑے بھی عمدہ پہنتا ہوں اور آپ سے زیادہ لکھ بھی چکا ہوں۔ یہ مسئلہ سرور صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ سرور صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ پورا معاملہ سمجھ گئے۔ آہستہ سے کہا اس سلسلے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ پطرس بہت عمدہ کپڑے پہنتے تھے۔ رشید صاحب بہت معمولی کپڑے پہنتے تھے۔ پطرس کی صرف ایک کتاب ہے لیکن رشید صاحب کی کتابوں کے سامنے معمولی نہیں ہے۔ قابلِ قدر ہے۔ مسئلہ ختم ہوگیا۔ جب مشاعروں کا بہت ذکر ہوا تو ایک دن شام کو سرور صاحب کے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر علیم، منیب الرحمٰن اور پروفیسر مقبول (عربی والے) تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا۔ جناب والا ہر مہینے مشاعرہ جو آپ کرتے ہیں، اس میں مصرعۂ طرح کی شرط لگا دیجیے تاکہ سب کی لیاقت کا علم ہوتا رہے آپ کو۔ علیم صاحب، مقبول صاحب اور منیب صاحب سبھوں نے تائید کی۔ سرور صاحب نے حکم دیا کہ آپ بھی غزل کہیں گے۔ میں نے کہا جناب والا میں شاعر نہیں ہوں، اس لیے غزل کا وعدہ نہیں کرتا۔ ہاں دو چار اشعار کہنے کی کوشش کروں گا۔ پہلا

مصرعۂ طرح دیا گیا: غالب کی زمین میں...... ''کس کا آشنا'' مشاعرہ ہوا۔ میں نے صرف ایک شعر سنایا:

آنکھ، قاتل آنکھ، بے گانہ کی بے گانہ رہی
اور وہ کم بخت چہرہ آشنا کا آشنا

علیم صاحب جو صدارت کر رہے تھے، فرمایا آج کی شام کا حاصل صرف ایک شعر ہے جو قاضی عبدالستار نے کہا۔ دوسرے مہینے میں پڑی ہے، جڑی ہے، وغیرہ ردیف تھی۔ میں نے چند شعر سنائے۔ اس میں ایک شعر تھا:

اُٹھ کر تری محفل سے چلے آئے ہیں لیکن
چلتے ہیں تو لگتا ہے کہ زنجیر پڑی ہے

علیم صاحب نے اس کی بھی تعریف کی۔ تین چار مہینے کے بعد مصرعۂ طرح کی شرط ختم کر دی گئی۔ مجھ سے لڑائی کے اسباب بھی تھے۔ مجھے زیر کرنے میں مخالفین ناکام ہوں گے تو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کریں گے۔

راشد: آپ کے ملنے جلنے والوں میں وارث کرمانی بھی شامل تھے جنھوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''گھومتی ندی''، لکھی تو بہت سی اہم باتوں کا ذکر شعوری طور پر نہیں کیا۔ عام لوگوں کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پائے گا کہ کون سی چیزیں تحریر میں آنے سے رہ گئی ہے، لیکن جو لوگ تمام باتوں سے اچھی طرح واقف تھے، انھیں یہ بات شدید طور پر کھٹکتی ہے۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو ''گھومتی ندی'' میں پیش کی گئی بہت سی باتوں کی اصلیت سے واقف ہیں اور اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ وارث کرمانی نے کن کن پہلوؤں سے اجتناب برتا ہے۔ ان کے حوالے سے کچھ باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔

قاضی عبدالستار: وارث کرمانی نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم کیا لیکن ڈویژن خراب

ہو گیا، تھرڈ ڈویژن آیا۔ ظاہر ہے زمین داری ختم ہو چکی تھی، تمام زمیندار زادے پریشان تھے۔ وارث کرمانی علی گڑھ آ گئے۔ تھوڑے دنوں تک بے کار رہے، پھر جب سرور صاحب نے پوری غلط بیانی کے ساتھ شہر یار کی تھیسس کا اقرار کرلیا اور ایوننگ کلاسز میں ان کا تقرر ہو گیا تو ''ہماری زبان'' میں ایڈیٹر کی جگہ خالی ہوئی۔ سرور صاحب نے وارث کرمانی کی دوڑ دھوپ اور ڈاکٹر علیم کی سفارش پر وارث کرمانی کا تقرر کر دیا، لیکن وارث کرمانی کی تسلی اس ملازمت سے نہیں ہو سکتی تھی، اور نہیں ہوئی۔ وہ مسلم یونیورسٹی میں گھسنا چاہتے تھے۔ وزیر تعلیم نورالحسن صاحب کی سفارش پر پروفیسر بی اے خان نے ان کو Evening Classes میں Compulsory English پڑھانے کے لیے Recruit کرلیا۔ وارث کرمانی دو تین برس تک خوش وخرم رہے، پھر وہ عارضی جگہ ختم ہو گئی۔ اب ''ہماری زبان'' کی ادارت بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس سے وارث کرمانی بہت پریشان ہوئے۔ ڈاکٹر علیم اور پروفیسر نورالحسن نے پروفیسر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی پر دباؤ ڈال کے عارضی جگہ پر وارث کرمانی کا تقرر کرایا، لیکن وارث کرمانی کی ''میں'' بہت لمبی چوڑی تھی، وہ زبان کے زناٹے میں کسی سے بھی کچھ بھی کہہ سکتے تھے اور بعد میں بھگتتے تھے۔ پروفیسر اُمِ ہانی جو صدر شعبہ ہوئیں تو وہ وارث کرمانی سے ناخوش ہو گئیں۔ اسی ''میں'' کے چکر میں اور ملازمت ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر علیم نے ان کا مسئلہ وائس چانسلر سید والا تبار حامد صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حامد صاحب نے شعبۂ فارسی میں تقرر کر دیا۔ وہاں سے وہ پروفیسر چیئر مین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ یہ تفصیل خاکسار نے اس لیے بیان کی ہے کہ ان کی جو خودنوشت ہے ''گھومتی ندی''، اس میں وارث کرمانی نے ڈاکٹر علیم اور پروفیسر نورالحسن وزیر تعلیم کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ دونوں انتقال فرما چکے تھے۔ سید والا تبار کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ خدا کے فضل سے حیات ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ میرے

ڈاکٹر علیم، پروفیسر نورالحسن، پروفیسر مونس رضا وغیرہ سے مساویانہ تعلقات تھے۔ ظاہر ہے پوری طرح غلط بیانی برتی گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جتنی خودنوشتیں لکھی جاتی ہیں، اکثر پر مغرب کے مفکر کا وہ قول صادق آتا ہے کہ جھوٹ کی جتنی قسمیں ممکن ہیں وہ سب خودنوشت میں موجود ہوتی ہیں۔ ابھی لکھنؤ سے عابد سہیل کی خودنوشت شائع ہوئی۔ موصوف نے بھی وارث کرمانی کی طرح فلسفے میں ایم۔اے کیا اور تھرڈ ڈویژن حاصل کر سکے، لیکن خودنوشت میں تحریر فرمایا کہ پروفیسر کالی پرشاد جو شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین تھے، اور بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے، وہ کلاس لے رہے تھے۔ میں نے یعنی عابد سہیل نے ایک ایسا فلسفیانہ نکتہ پیش کیا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور فرمایا اگر ارسطو زندہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ میری ناچیز رائے میں Aristotle دیوانہ ہو گیا ہوتا۔ اس خودنوشت پر تبصرہ کرایا ہے ڈاکٹر صبیحہ انور سے۔ وہ بے چاری بھولی بھالی خوش فکر افسانہ نگار۔ اس کا لکھنؤ یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا فلسفے سے بھی کوئی رشتہ نہیں۔ اس نے معصومیت میں ایک بہت سینئر ہم عصر افسانہ نگار کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور پڑھنے والا ڈاکٹر صبیحہ انور کے بیان کی روشنی میں جب عابد سہیل کے بیانات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تو وہ خود شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اردو کے اکثر خودنوشت نگار اس مرض میں مبتلا ہیں۔ علی گڑھ میں کئی حضرات نے خودنوشت لکھی ہے، لیکن پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں کی خودنوشت ''دھوپ اور چھاؤں'' اور پروفیسر ساجدہ زیدی کی خودنوشت ایسی ہے جن کو پڑھ کر آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ خودنوشت اس طرح لکھی جاتی ہے، یا اس طرح لکھی جانی چاہیے۔ تو یہ دو خودنوشتیں ایسی ہیں جن پر علی گڑھ والے فخر کر سکتے ہیں۔ باقی جتنی بھی خودنوشتیں علی گڑھ میں لکھی گئیں وہ ناقابلِ اعتنا ہیں۔

راشد: قاضی صاحب! علی گڑھ کی یادگار شخصیتوں کا ذکر ہوا اور اختر انصاری اس فہرست

میں شامل نہ ہوں، ایسا ممکن ہی نہیں۔ میں نے انھیں دیکھا تو نہیں لیکن ان کے حوالے سے بہت سے دلچسپ واقعات سنے ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ واقعی اپنی طرز کے یکتا شاعر و ادیب تھے۔ نہ صرف ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں، بلکہ ان کا لباس اور وضع قطع بھی خاص انفرادیت کا حامل ہوا کرتا تھا۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے اور محفل کو زعفران زار بنانے کے فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ خوردوں سے ان کا رویہ بے حد مشفقانہ ہوتا اور جو کوئی بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ انھیں بھول نہیں پاتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے چاہنے والوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اختر انصاری کے حوالے سے ڈھیر ساری باتیں اور یادیں آپ کے ذہن میں بھی محفوظ ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان یادوں میں ہمیں بھی شریک کرنے کی زحمت کریں۔ آپ چوں کہ خود بے باک رہے ہیں، لہٰذا آپ کی رائے زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ ایک دلچسپ شخصیت کو آپ نے کس زاویے سے دیکھا؟

قاضی عبدالستار: جب ہم علی گڑھ آئے تو دو مشہور شاعر علی گڑھ میں تھے، معین احسن جذبی اور اختر انصاری۔ باقی شاعروں کی حیثیت مقامی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر انصاری کو لوگ نفرت سے دیکھتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اشتیاق ہوا کہ ان سے ملاقات کی جائے، لیکن کچھ ایسے حالات رہے کہ میں برسوں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ ''صلاح الدین ایوبی'' دکن کے ایک میگزین ''صبا'' میں مکمل طور پر شائع کیا گیا تھا جو اختر انصاری نے پڑھا تھا اور شہریار سے پوچھا تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ ان کو نہیں دیکھا ہے میں نے۔ چنانچہ میں دوسرے ہی دن چار جامہ چڑھا کر حاضر ہو گیا۔ وہ دیوان پر گاؤن پہنے بھاری بھرکم انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھرا ہوا بولتا چہرہ، ذہین غم ناک آنکھیں، بے قرار خدوخال۔ جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ کھڑے ہوئے۔

میں نے محسوس کیا کہ ان کا اوپر کا بدن بھاری ہے اور نیچے کا بدن ہلکا ہے۔ بہت اخلاق سے ملے اور ملتے ہی صلاح الدین ایوبی کا ذکر شروع کر دیا اور زبان کی غیر معمولی تعریف کرتے رہے۔ اصرار سے پوچھتے رہے کہ نثر لکھنا آپ نے کیسے سیکھا۔ میں پورے ادب سے جواب دیتا رہا۔ چائے آئی، خود بنائی، بسکٹ خود پیش کیے۔ میں نے اپنی جیب سے پاؤچ نکالا سگریٹ بنانے کے لیے تو وہ مسکرائے۔ فرمایا آپ سگریٹ رول کر کے پیتے ہیں۔ میں پائپ پیتا ہوں۔ ایک طرف اشارہ کیا پندرہ بیس پائپ رکھے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کا پاؤچ نکالا، ایک قہقہہ لگایا۔ فرمایا آپ جانتے ہیں یہ کون سی تمباکو ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے جو کھیت میں اُگتی ہے اور بازار میں خمیرہ اور سبا کو بنانے کے لیے آتی ہے وہ میں خرید لاتا ہوں اور اس کو صاف کر کے پاؤچ میں بھرتا ہوں اور بہت ٹھاٹ سے پائپ پیتا ہوں اور جب لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ کون سا تمباکو ہے تو میں علی گڑھ کے شاعروں کی طرح منھ سکھا کر آواز میں بھنبھناہٹ کی پتی لگا کر آہستہ سے کہتا ہوں کہ یہ باہر کی ہے۔ پھر ایک قہقہہ لگایا۔ فرمایا علی گڑھ کے جتنے شاعر اور نقاد ہیں، معاف کیجیے گا سب چیڑ قناتی ہیں۔ یہ لفظ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ میں نے بہت ادب سے پوچھا کہ سر چیڑ قناتی کے کیا معنی ہیں۔ فرمایا احمق اور ایڈیٹ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ چیڑ قناتی کے کیا معنی ہیں تو وہ آپ سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھرے بیٹھے ہیں۔ دیر تک وہ علی گڑھ پر لعنت بھیجتے رہے۔ میں جذبی صاحب کی محفلیں دیکھ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ علی گڑھ سے کیوں ناخوش ہیں، اور شعبۂ اردو سے بھی کیوں جلے بیٹھے ہیں۔ خورشید الاسلام کو شعبۂ اردو سے جو ناگواری تھی، اس کا بھی علم تھا۔ میں نے بہت ادب سے کہا کہ شعبے میں میاں خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں اور ان کا جو گروہ ہے، آپ سمجھ رہے ہیں نا۔ گروہ کے معنی معلوم ہیں آپ کو۔ میں نے کہا جی سر مجھے معلوم ہیں۔ کہنے لگے کہ ان کا

گروہ ادب کش ہے۔ یہ مشاعروں میں اپنے بیس پچیس لونڈوں کے ساتھ جاتے ہیں۔ جب یہ آنکھیں بند کر کے، منہ سکھا کے، آواز میں درد کے پیوند لگا کر اس طرح مصرع پڑھتے ہیں جیسے صبح کے وقت جبریل نے ان کے کان میں پھونک دیا ہو اور ان کے لونڈے ''واہ واہ، واہ واہ'' کے نعرے لگاتے ہیں۔ میں جذبی، وامق، منیب (منیب الرحمٰن) اپنا کلام سناتے ہیں تو وہی لونڈے ہی ہی، ہاہا، ہوہو کرتے ہیں۔ آپ جب سے آئے ہیں ہم چاروں میں سے کسی کو آپ نے غزل پڑھتے سنا ہے۔ ہمارے نہ پڑھنے کا سبب یہ ہے۔ یہ پوری سازش ہے ہمارے خلاف، لاحول ولاقوۃ، بڑے زور سے کہا۔ غالب کے دو شعر پڑھ دوں تو معنی نہیں بتا سکتے اور مولانا بنے پھرتے ہیں۔ میں جب اُٹھنے لگا تو بٹھالیا۔ آپ کی کیا رائے ہے کہ میں کیوں نہیں آتا۔ بہت تڑپ کر پوچھا۔ میں نے کہا سر مشہور یہ ہے کہ آپ بھی رشید احمد صدیقی کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے جیسے خورشید الاسلام آرزومند تھے کہ سلمیٰ صدیقی سے ان کی شادی ہو جائے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں تو ملکۂ ثریا، شہنشاہ ایران کی بیگم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اب نہیں ہوئی تو میں کیا کروں۔ وہ ہنستے رہے اور فرمایا رشید احمد صدیقی زمین دار ہیں۔ جوان کا دربار اُٹھائے وہ ادیب وشاعر، جوان کے گھر نہ جائے، وہ کچھ بھی نہیں۔ میں کسی کے گھر نہیں جاتا اور نہ جاؤں گا۔ امیر مال مست، غریب حال مست۔ میں میرے اپنے کپڑوں پر بہت اتراتا ہوں کہ میں لال کوٹ، نیلی قمیص، پیلا پتلون، ہرا جوتا پہنتا ہوں۔ جی میں پہنتا ہوں، یہ میرا شوق ہے۔ میرا باپ دلّی کا سول سرجن تھا۔ میں بچپن سے پہنتا آیا ہوں۔ جب تم جانگھیا اور بنیائن پہن کر گھومتے تھے اس وقت میں بابا سوٹ پہنتا تھا۔ میرے باپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا، لیکن ہم قطعات لکھتے رہے۔ والد کا انتقال ہو گیا۔ سوتیلے بھائیوں نے جعلی وصیت ناموں کے ذریعے ہماری ساری جائداد کو ہتھیا لیا ورنہ میں علی گڑھ کی تین سو روپلّی کی نوکری کرتا؟ اتنا روپیہ تو میرا باپ

اپنے نوکروں کو بانٹ دیا کرتا تھا۔اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔بتایئے کیسے کیسے لوگ جن کی صورتوں پر حماقت بیٹھی حقہ پی رہی ہے، جن کی آواز پر گدھے رینگ رہے ہیں، جن کے الفاظ پر استنجے کے ڈھیلے قہقہے لگا رہے ہیں، وہ ہمارے منھ آتے ہیں۔ یہ ہماری تقدیر ہے۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ وائس چانسلر ذاکر صاحب کے یہاں ملنے گئے۔ جب کمرے میں داخل ہوئے تو قالین پر جوتے کے نشان بنے ہوئے تھے۔میرے آگ لگ گئی۔ بدتہذیبی کی انتہا ہے۔قاضی صاحب تہذیب ایک مذہب ہے۔اس پر شریف زادے عمل کرتے ہیں۔آپ کو معلوم ہے میں جب قالین پر پیر رکھتا ہوں، اتنی دیر میں وائس چانسلر کھڑا ہو چکا ہوتا ہے اور آپ کی نفاست کی داد میں وہ آپ کو اپنے قریب بٹھاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں آدمی گھر سے سیکھ کر آتا ہے۔ان بے چاروں کے گھر کہاں تھے، گھروے تھے۔وہاں سے کودتے پھاندتے علی گڑھ آگئے۔

اختر انصاری گرجتے رہے، برستے رہے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ دوبارہ جب اُٹھنے لگا تو فرمایا کہ آیا کیجیے کبھی کبھی۔آپ کی خوش پوشی مجھے پسند آئی اور سڑک تک مجھے چھوڑنے تشریف لائے۔ایک دن میں جذبی صاحب کے ساتھ شام کو ٹہلنے نکلا۔دیکھا اختر انصاری آرہے ہیں۔فاختئی رنگ کا کوٹ، سرمئی پتلون، سرخ ٹائی اور سبز کروکو ڈائل کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ جذبی صاحب نے حسب دستور جملے بازی شروع کی۔فرمایا تمہارے کپڑے دیکھ کر مجھے آسکر وائلڈ کا جملہ یاد آتا ہے:

"Caricature is a tribute which mediocre pays to a genius."

اور جذبی تم کو دیکھ کر مجھے وائس چانسلر کا خانساماں یاد آتا ہے۔بس ایک فرق ہے۔شیروانی اس کی بھی سفید ہوتی ہے، تمہارا پائجامہ چوڑا ہے، اس کا علی گڑھ کٹ ہوتا ہے۔اس کا جوتا کرمز کا ہے، تم ایمبیسڈر پہنتے ہو اور اس کے

بعد قہقہہ لگایا۔ جذبی صاحب نے بھی ساتھ دیا اور مجھ سے فرمایا سن رہے ہو، ان کی جملے بازی سن رہے ہو۔ میں نے کہا سر آپ دونوں ہم عصر، ہم سفر، ہم مشرب، خاکسار کی کیا مجال، جو آپ حضرات کے معاملے میں دخل دے۔ اختر انصاری مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس قسم کا مذاق جذبی صاحب اور اختر انصاری میں ہوتا رہتا تھا۔ مشہور جملہ ہے جذبی صاحب کا: اختر تم قطعات کے بادشاہ ہو، لیکن میں قطعات کو شاعری ہی نہیں مانتا۔ اس پر ایک بار کچھ کہا تھا، بہت سخت جملہ کہا تھا اختر انصاری نے، لیکن میں بھول گیا۔ مجھے یاد نہیں ہے۔ بہرحال اختر انصاری اپنی وضع کے نرالے تھے۔ ساری عمر شان سے، ٹھاٹ سے، پوری کج کلاہی کے ساتھ گزار دی۔ کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لائے۔ ان میں ٹیڑھ تھی اور کس میں نہیں ہوتی، لیکن اب ایسے لوگ بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔

راشد: قاضی صاحب! ابھی آپ نے آسکر وائلڈ کا ایک جملہ نقل کیا۔ ذرا اس کے سیاق وسباق سے بھی ہمیں واقف کرادیں تو نوازش ہوگی۔

قاضی عبدالستار: ہاں آسکر وائلڈ کا جو جملہ ہے اس کے سیاق وسباق کو بتانا ضروری ہے۔ آسکر وائلڈ کی شہرت ساری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ لندن کی ایک ادبی انجمن نے 'کوئن' کے ہاتھوں اعزاز دینے کے لیے انھیں لندن آنے کی دعوت دی۔ آسکر وائلڈ لندن پہنچ گئے، لیکن جہاں ٹھہرے تھے، وہاں سے جلسہ گاہ تک پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی۔ کوئن آگئی۔ مہمان نہیں آیا۔ منتظمین پریشان ہو گئے اور انھوں نے ایک شخص کو لال کوٹ، ہرا پتلون، زرد قمیص، نیلی ٹائی پہنا کر آسکر وائلڈ بنا کر کھڑا کر دیا۔ ابھی Recitation پڑھا جارہا تھا کہ آسکر وائلڈ آ گیا۔ مجمع نے دیکھتے ہی clapping شروع کر دی۔ آسکر وائلڈ کو ڈائس پر لے جایا گیا۔ آسکر وائلڈ خم ہوئے۔ فرمایا—

"Your imperial majesty Caricature is a tribute which mediocre pays to a genius."

ایک شام میں کلب سے نکل رہا تھا کہ اختر انصاری کا ملازم آیا۔ کہا آپ کو صاحب نے یاد کیا ہے۔ میں پہنچا سلام کیا۔ جواب میں کھڑے ہوئے اور سینے سے لگایا اور فرمایا میں نے کل سے اب تک کم سے کم ایک درجن مرتبہ ''نقوش'' میں آپ کا افسانہ ''آنکھیں'' پڑھا ہے۔ بیٹھیے۔ میں بیٹھ گیا۔ پورا افسانہ سنا دیا۔ چند سطروں کے فرق سے پورا افسانہ سنا دیا۔ میں نے خوش ہو کر عرض کیا — کیا میں اس کو لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا تم بے شک لکھ سکتے ہو۔ میں کوئی بہانہ نکال کر خود لکھوں گا۔ میں نے اس زمانے کے کسی انٹرویو میں یہ واقعہ لکھوایا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا۔ سر اس عمر میں آپ کا حافظہ اتنے غضب کا ہے۔ انھوں نے کہا مجھے ایسی نثر پسند ہے۔ اس لیے یاد ہوگئی۔ آپ کی جو دیہات پر کہانیاں ہیں، ناول ہیں، وہ مجھے یاد نہیں ہو سکتیں۔ میں داد دے سکتا ہوں لیکن وہ مجھے یاد نہیں ہو سکتیں۔

اشد: علی گڑھ میں شروع سے ہی شعر و ادب کی نمائندہ ہستیاں موجود رہی ہیں جن کی بدولت ادب کا وقار قائم رہا اور ان کی موجودگی نے علی گڑھ کی ادبی فضا کو استحکام بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی رہے ہیں جو براہِ راست ادب سے وابستہ نہیں تھے، لیکن انھیں مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ بڑے بڑے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ آج بھی علی گڑھ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں لیکن ان کے ادب کا ذوق قابلِ رشک ہے۔ ظاہر ہے آپ کے زمانے میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں رہے ہوں گے جن کے دم سے علی گڑھ کی ادبی فضا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایسے ہی کچھ لوگوں سے ہمیں متعارف کرائیں جنھوں نے آپ کو متاثر کیا؟

قاضی عبدالستار: ایسے لوگ ہمارے زمانے میں اچھے خاصے تھے لیکن یہاں سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا، البتہ چنندہ لوگوں میں بھی میں بہ طور خاص ڈاکٹر علیم کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ جب پہلی بار ہم پروفیسر علیم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پرچے پر اپنا نام انگریزی میں لکھا: قاضی عبدل ستار۔ سلام کے جواب میں وہ پرچے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، پھر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے عرض کیا سر مجھے Numerology سے دلچسپی ہے۔ قاضی عبدالستار کے جو نمبر آتے ہیں وہ بدنصیب ہیں اور قاضی عبدل ستار کے جو نمبر آتے ہیں وہ خوش نصیب ہیں۔ اس لیے میں نے عبدل ستار لکھنا شروع کر دیا ہے۔ چلتے وقت حکم ہوا کہ کوئی بات ہو تو آجایئے گا۔ میں ''صلاح الدین ایوبی'' لکھ رہا تھا۔ سلطان کے ذکر میں ''تربوش'' کا لفظ آیا۔ لغت دیکھی تو اس میں سر کا لباس لکھا ہوا تھا۔ سر کے تو سینکڑوں لباس ہیں۔ جب تک تربوش کی تصویر ذہن میں نہ بنے، اس وقت تک سلطان کی شخصیت نموادر نہیں ہوتی۔ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ تربوش کے کیا معنی ہیں۔ اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ سوچتے رہے۔ پھر فرمایا آپ علیم کے پاس جایئے، اور کہیے کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ میں علیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو رشید صاحب کا ارشاد پیش کیا۔ وہ سگار کو چباتے رہے اور دھواں نکالتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد بولے، آپ پرسوں آیئے گا اسی وقت۔ میں ان دنوں روز لائبریری آتا تھا۔ ایک بار نظر اُٹھی تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ایک ایک سیڑھی چڑھ رہے ہیں اور لائبریرین ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی حیرت ہوئی، اس لیے کہ وہ بیماری سے اُٹھے تھے۔ زینہ چڑھنا منع تھا۔ خیر دوسرے دن ہم وقتِ معینہ پر حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کاغذ بڑھا دیا۔ اس میں تربوش کی تصویر بنی ہوئی تھی اور لکھا ہوا تھا کہ سلطان صلاح الدین تربوش پہنتا تھا۔ جب میں نے پڑھ لیا تو فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ

آپ کا کام چل جائے گا۔ میں نے کہا سر یہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ فرمایا جایئے، رشید صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہیے اور عرض کیجیے کہ ان کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ میری نظروں میں رشید صاحب کا مرتبہ اور بھی بلند ہو گیا۔

راشد: قاضی صاحب! آپ سے گفتگو کے دوران جن ادبی شخصیتوں کا ذکر مسلسل ہوتا رہا اُن میں قرۃ العین حیدر خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو آپ کے دل میں ان کے لیے شروع سے احترام کا جذبہ رہا اور پھر کچھ واقعات بھی ایسے ہوئے جس کی بنا پر آپ دونوں کے تعلقات میں مزید استحکام پیدا ہوتا چلا گیا، لیکن چوں کہ عینی سے مراسم کا ذکر تفصیلی طور پر نہیں ہوا، لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ قرۃ العین حیدر سے متعلق بعض اہم واقعات کو تازہ کرنے کی کوشش کریں۔ عینی کا تعلق علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے براہِ راست نہیں تھا، لیکن علی گڑھ کے ماحول میں وہ اتنی رچ بس گئی تھیں اور پابندی کے ساتھ یہاں جس طرح وہ آتی جاتی رہتی تھیں، یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ علی گڑھ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ قرۃ العین نے بھی اپنی زندگی خاص رعب اور شان وشوکت کے ساتھ گزاری اور اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لائیں۔ حسنِ اتفاق سے آپ نے بھی کچھ ایسا ہی مزاج پایا ہے۔ آپ کے خیالات سے اس بات کا اندازہ ہوگا کہ تقریباً ایک جیسا مزاج رکھنے والا، اپنے ہی جیسی دوسری شخصیت کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔

قاضی عبدالستار: جب قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا تو پہلی بار احساس ہوا کہ گیان پیٹھ اس کو ملا جو اس ایوارڈ کے قابل تھی۔ میں قرۃ العین حیدر کو مبارک باد دینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ ثریا حسین کے یہاں ٹھہری ہوئی ہیں، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ثریا حسین کا مکان کہاں ہے۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ کبیر کالونی کے پاس ہے۔ خیر میں گیا۔ قرۃ العین حیدر نے دیکھتے ہی کہا میں صبح سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں نے کہا نیک مادام (میں کبھی کبھی ان کو نیک مادام کہتا تھا) مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ جن صاحبہ کے مکان میں رہتی ہیں، ان کا مکان

کہاں ہے۔ ان کی میزبان پروفیسر ثریا حسین کے شوہر نامدار جن کا نام میں بھول گیا ہوں نے بہت چمک کر فرمایا کمال ہے قاضی صاحب آپ میرا مکان نہیں جانتے۔ میں نے کہا جناب والا آپ کا مکان راشٹر پتی بھون نہیں ہے جس کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ علی گڑھ میں دو مکان ہیں۔ ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا، دوسرا وائس چانسلر کا۔ میں ان دونوں کا مکان جانتا ہوں۔ تو پھر آپ یہ بتایئے کہ آپ میرے گھر کیسے تشریف لائے۔ میں نے کہا شعبۂ اردو کا چپراسی میرے ساتھ آیا ہے۔ نیک مادام ہر ملاقات پر مجھ سے اودھ کے بارے میں سوالات کرتی رہتی تھیں۔ ابھی وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں کہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی بیگم (ان کا نام بھی میں بھول گیا ہوں) نے اپنی موجودگی درج کرانے کی کوشش کی۔ وہ بہت بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتی تھیں۔ تعارف ہو یا نہ ہو، وہ دو آدمیوں کے درمیان کی گفتگو میں بھی بول پڑتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے پوچھا کہ قاضی صاحب یہ جو گاؤں میں، اودھ میں رؤسا ہوتے تھے ان کو ہر وقت تو برف ملتی نہیں ہوگی تو یہ آم کیسے کھاتے تھے۔ میں نے کہا رئیسوں کا ایک عام دستور تھا کہ شام کو منتخب آم ایک بورے میں بھر دیے گئے اور رسّی میں باندھ کر کنویں میں ڈال دیے گئے اور وہ رسّی چرخی میں باندھ دی گئی۔ رات بھر میں آم تو کیا آم کا جگر تک ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ جب وہ آم کھانے بیٹھتے تو سپاہی دوڑتا، بوری نکالتا، جتنے اور جیسے آموں کا حکم ہوتا، نکال لیتا اور باقی بوری میں بھر کر کنویں میں ڈال دیتا۔ پرنسپل صاحب کی بیگم صاحبہ نے تڑ سے سوال کیا کہ رات بھر آم پڑے رہتے تھے اور کوئی چرا نہیں لیتا تھا۔ میں نے جواب دیا میڈم وہ آم کسی پروفیسر کے نہیں تھے کہ جس کا جی چاہے نکال لے۔ رئیس کے ہوتے تھے کہ بڑے بڑے بدمعاش اس لیے اس راستے سے نہیں گزرتے تھے کہ اگر دو آم بھی کم ہو گئے تو ہم ہی پکڑے جائیں گے۔ کیا وہاں پولیس نہیں ہوتی۔ میڈم نے کہا۔ یہ ظلم زمین دار کیسے کرتا تھا۔

میں نے کہا پولیس زمین دار کے پاس بھی ہوتی تھی، اس کا نام تھا پاسی اور حکومت کی پولیس ان کے تحائف سے زیر بار رہتی تھی۔ تب وہ خاموش ہوئیں اور قرۃ العین حیدر نے ناگواری سے موضوع بدل دیا۔

۱۹۷۷ء میں جب Selection Committee نے مجھے reject کیا تو ظاہر ہے کہ مجھے بہت ناگوار گزرا۔ میں ایک سال کی Strategic leave پر چلا گیا۔ میں چھٹی پر تھا تو قرۃ العین حیدر سے فیکلٹی لاؤنج میں کہانی سنانے کی فرمائش ہوئی۔ انھوں نے چپراسی سے کہا کہ قاضی عبدالستار کو بلا کر لائیے۔ شہریار وغیرہ نے کہا وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ وہ ڈپارٹمنٹ سے ناخوش ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے فرمایا کہ وہ ڈپارٹمنٹ سے ناخوش ہوں، مجھ سے نہیں اور وہ میری دعوت پر ضرور آئیں گے۔ مجھے جب اطلاع ملی تو میں فوراً تیار ہو کر فیکلٹی لاؤنج آ گیا۔ قرۃ العین حیدر تین صفحے پڑھ چکی تھیں۔ فرمایا اب میں قاضی صاحب کی خاطر دوبارہ شروع سے پڑھوں گی۔ یہ بات بھی شعبۂ اردو کے اربابِ حل وعقد کو سخت ناگوار گزری لیکن وہ میڈم کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سید محمد افضل جب آئی اے ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے تو تشریف لائے اور کچھ سوالات کیے۔ ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اردو میں سب سے بڑا ناول نگار کون ہے تو میں نے کہا قرۃ العین حیدر۔ خیر وہ چلے گئے۔ امتحان دیا۔ واپس آئے تو ملنے آئے۔ فرمایا کہ انٹرویو میں ایک کشمیری بزرگ جو شاید کمیٹی کے وائس پریسیڈنٹ تھے، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اردو کا سب سے بڑا ناول نگار کون ہے تو میں نے کہا کہ قرۃ العین حیدر۔ ان صاحب نے فرمایا کہ آپ نے قاضی عبدالستار کو پڑھا ہے۔ میں نے کہا، سر یہ قاضی عبدالستار کا ہی جملہ ہے۔

میں اپنے شاگرد پروفیسر نصیر احمد خاں کا دہلی میں مہمان تھا کہ میرے شاگرد پروفیسر ابنِ کنول تشریف لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ آج

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قرۃ العین حیدر تشریف لا رہی ہیں۔ ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا جلسہ انھیں کے اعزاز میں ہے۔ میں نے کہا میں ضرور چلوں گا اور میں فوراً تیار ہونے لگا تو پروفیسر نصیر نے کہا ایک ذرا توقف کیجیے۔ میرا ڈرائیور آ جائے تو آپ آرام سے پہنچ جائیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ کے ڈرائیور کے انتظار میں قرۃ العین حیدر سے ملاقات کو قربان نہیں کر سکتا، اور ابن کنول کے ساتھ باہر نکلا اور تھری ویلر پر بیٹھ کر ہم دونوں جلسے گاہ میں پہنچے۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ ان کے برابر پروفیسر شمیم حنفی بیٹھے ہوئے تھے اور یہ جلسہ، میرا قیاس ہے فاروق بخشی کی طرف سے برپا ہوا تھا شاید۔ اس لیے کہ وہ کچھ زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔ میں ہال میں داخل ہوا اور جو کرسی خالی نظر آئی، اس پر بیٹھ گیا۔ قرۃ العین حیدر نے شمیم حنفی کے کان میں کچھ کہا اور شمیم حنفی ڈائس سے اُترے اور میرا ہاتھ پکڑ کر ڈائس پر لے گئے اور وہاں بٹھا دیا۔ قرۃ العین حیدر کی گفتگو جلد ہی ختم ہو گئی تو شاید فاروق بخشی نے سوال کیا کہ اردو کا سب سے اچھا ناول کون ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جواب دیا ''شب گزیدہ''۔ تھوڑی دیر کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ باہر نکل کر قرۃ العین حیدر نے پوچھا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جواب دیا آپ سے ملنا مقصود تھا۔ ملاقات ہو گئی، میں واپس جا رہا ہوں۔ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اپنے شاگرد پروفیسر نصیر احمد خاں کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ خیال آتا ہے کہ مجھے اپنی مصروفیت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا اور ان کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ مفصل ملاقات کو ایک مدت گزر چکی تھی، لیکن بے سبب ایک حجاب، بلاضرورت ایک تکلف ہمیشہ میرے ساتھ رہتا جسے سوچ سوچ کر کبھی کبھی دکھ بھی ہوتا۔

راشد: واقعی قاضی صاحب! قرۃ العین حیدر جس قدر آپ کا احترام کرتی تھیں، وہ کسی اعزاز سے کم نہیں۔ انھوں نے پوری زندگی اسی احترام کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے حوالے سے ان کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا کہ قاضی عبدالستار سے بہتر نثر صرف

قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اس طرح کے جملے کسی
اور کے لیے کبھی نہیں لکھے یا کہے۔ اپنے زمانے کے ایک بڑے ادیب کا
دوسرے بڑے ادیب کے ساتھ یہ مساویانہ رویہ قابلِ قدر ہے، ورنہ عام طور پر
ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنی انا کے حصار میں مقید ہوتے ہیں۔ اپنے علاوہ کسی کو
نہیں گردانتے اور معاصرانہ چشمک میں عقیدت اور احترام کو کچلتے ہوئے آگے
بڑھ جاتے ہیں۔ ادب کی اہم شخصیتیں جن کا تعلق علی گڑھ سے نہیں بھی تھا، وہ
تمام شخصیتیں وقفے وقفے سے علی گڑھ تشریف لایا کرتیں اور اپنی پسندیدہ
شخصیتوں سے ملاقات کا شرف حاصل کرتیں۔ فکشن سے وابستہ لوگ کی
ترجیحات میں ظاہر ہے آپ شامل ہوتے۔ احباب کے ضمن میں کوئی ایسی
شخصیت ذہن میں محفوظ جس کے حوالے سے کچھ انوکھی یادیں ذہن میں دستک
دیتی ہوں۔

قاضی عبدالستار: بھئی لوگ تو بہت سے ہیں۔ اب کس کس کا ذکر کیا جائے۔ تمام لوگوں کا
ذکر کرنے سے معاملہ غیر دلچسپ ہو جائے گا۔ میں انہی شخصیتوں کا ذکر کر رہا ہوں
جن سے متعلق کچھ نہ کچھ انوکھی یادیں ہیں۔ یادوں کا معاملہ بھی عجیب ہے۔
بعض لوگوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزرتا ہے لیکن ان کے حوالے سے کچھ
انوکھی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کی جائے تو کامیابی نہیں مل پاتی۔ اس کے
برعکس بعض لوگوں سے گنی چنی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایک آدھ ملاقات
ہی ہو پاتی ہے اور ان سے متعلق بعض انوکھی یادیں ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔
مثال کے طور پر اس وقت الیاس احمد گدی یاد آرہے ہیں۔ میں نے گزشتہ
شب ہی آپ کی کتاب ''فکشن مکالمہ'' میں آپ کا مضمون ''الیاس چا'' پڑھا۔
مجھے اچھا لگا۔ ہر چند کہ تشنگی کا احساس ہوا۔ کاش آپ نے ان کی موت کا بیان
قدرے تفصیل سے کیا ہوتا۔ جب الیاس کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تو وہ علی گڑھ
تشریف لائے غالباً ۱۹۹۷ء میں۔ میں میرس روڈ پر فرسٹ فلور والے مکان میں

تھا کہ کسی نے گھنٹی بجائی۔ ملازم نے اطلاع دی کوئی صاحب آئے ہیں، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دو حضرات تشریف لائے۔ ایک دروازے سے ہی واپس چلے گئے۔ میرے کہنے پر دوسرے صاحب نے چلمن اُٹھائی اور کمرے کے اندر آ گئے، اور بجائے کرسی پر بیٹھنے کے دونوں ہاتھوں سے میرا داہنا ہاتھ تھام لیا۔ میں یہ سمجھا کہ ان کو گھڑی کی ضرورت ہے اور یہ وقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ گھڑی کھل گئی تھی، لیکن بجائے گھڑی لینے کے لیے انھوں نے میرا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور ہونٹوں سے چوما اور فرمایا کہ میں الیاس احمد گدی ہوں۔ میں نے تقریباً چیخ کر کہا کہ تم غیاث احمد گدی کے بھائی ہو؟ جی۔ میں نے بھائی صاحب سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ ایک مدت سے آپ کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج آرزو پوری ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں شام کو سرمست رہا کرتا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ تم غیاث کے بھائی ہو، اس لیے میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ میں تو آپ کے سامنے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا، میری کیا مجال ہے۔ وہ دیر تک بہت نیازمندی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ میں ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ ہوں ہاں کرتے رہے۔ ان کے بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آج بھی مجھے ان کا ادب اور لحاظ یاد آتا ہے۔ یہ خیال بھی اس لیے آیا کہ میں نے رات ہی آپ کا مضمون پڑھا تھا۔ آپ کو الیاس کی شروع کی زندگی کے بارے میں بھی کچھ بتانا چاہیے تھا۔ آپ کے مضمون کو پڑھ کر مجھے خیال ہوا کہ آپ ان کے بارے میں خاصا جانتے ہیں۔ میری ایک گزارش ہے کہ آپ الیاس پر ان کی ابتدائی زندگی سے آخری زندگی تک اختصار میں لکھیے تا کہ میں بھی پڑھ سکوں اور خوش ہو سکوں۔

راشد: قاضی صاحب! علی گڑھ کے شب و روز کا ذکر ہو اور جن وادی لیکھک سنگھ کا اور کنور پال سنگھ کا ذکر نہ آئے، یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ

کے. پی. سنگھ سے، جن وادی لیکھک سنگھ سے آپ کا تعلق کتنا گہرا تھا۔ اردو کی تنظیموں سے کہیں زیادہ آپ جن وادی لیکھک سنگھ سے وابستہ رہے اور ہندی والوں میں خاصے مقبول رہے۔ آپ کے ناول شروع میں ہی ہندی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئے اور بابا ناگارجن نے ابتدا میں ہی آپ کی صلاحیت اور اہمیت کا اعتراف کیا۔ اس بنا پر ہندی والوں سے آپ کی قربت کا جواز سمجھ میں بھی آتا ہے۔ کنور پال سنگھ جو غالباً آپ کے سب سے عزیز دوست تھے، ان کے حوالے سے آپ کے خیالات اب تک گفتگو میں شامل نہیں ہو پائے۔ میں چاہتا ہوں کہ کے. پی. سنگھ اور جن وادی لیکھک سنگھ سے متعلق آپ اپنے خیالات تفصیل سے بتائیں۔ ان باتوں سے علی گڑھ کے شب و روز کے بہت سے ایسے گوشے بھی منور ہو سکتے ہیں جو اب تک گفتگو کے ذریعے پوری طرح واضح نہیں ہو پائے۔

قاضی عبدالستار: ۱۹۸۲ء میں ایک شام پروفیسر کنور پال سنگھ جو میرے سب سے عزیز دوست تھے، تشریف لائے اور فرمایا کہ دہلی میں جن وادی لیکھک سنگھ کی استھاپنا ہو چکی ہے۔ اس کے اُدگھاٹن بھاشن (افتتاحی تقریر) کے لیے کارکرنی کمیٹی کے سامنے دو نام تھے۔ مہادیوی ورما اور قاضی عبدالستار۔ مہادیوی ورما پر اعتراض ہوا کہ انھوں نے اردو کے خلاف سخت بیان دیا ہے۔ اس لیے میرے پاس message آیا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ جن وادی لیکھک سنگھ کا افتتاح کرنے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا یار کے. پی اس میں پولیس وغیرہ کا دخل تو نہیں ہوگا۔ اگر پکڑ لیا تو؟ کنور پال سنگھ نے کہا بھائی صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہونا ہے اور اگر ہوا بھی تو کئی زبانوں سے کئی سو ادیب آپ کے ساتھ جیل جائیں گے۔ میں نے کہا کے. پی. سنگھ تمہاری دوستی اپنی جگہ، لیکن میں کسی بھی قیمت پر جیل جانے کے لیے رضامند نہیں ہوں۔ وہ ہنسنے لگے۔ خیر میں برلا مندر پہنچا جہاں جلسہ ہو رہا تھا۔ کارکرنی کمیٹی کے کنوینر بھیرو پرشاد گپت نے میری پیشوائی کی۔ میں ان کو الگ لے گیا اور بہت ادب سے پوچھا کہ آپ

مجھے کوئی لائن دیں گے۔ وہ مسکرائے۔ میرا داہنا ہاتھ تھام لیا اور بہت جما کر فرمایا قاضی صاحب لائن آپ دیں گے، پالن ہم کریں گے۔ میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ میں نے اپنے کیریئر کی چند خوب صورت تقریروں میں سے ایک تقریر کی۔ میری تھیسس تھی کہ جن وادی لیکھک سنگھ کا ادب وہ ہے جو تندرست بھی ہو اور خوب صورت بھی۔ تندرستی اور خوب صورتی کی میں نے وضاحت کردی۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ شام کے اجلاس میں انور عظیم صاحب جو کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر بھی تھے، مائک پر آئے اور بہت غصے سے فرمایا کہ جس آدمی کے پاس گورنمنٹ کا خطاب ہو، وہ جن وادی لیکھک سنگھ کا افتتاح کیسے کرسکتا ہے۔ میں فوراً مائک پر گیا اور میں نے کہا کہ انور عظیم صاحب ابھی ترقی پسندی کا چہلم ہوا ہے۔ اس میں ترقی پسندوں کے ابا علی سردار جعفری نے صدر الصدور کا منصب قبول فرمایا، تب آپ کہاں تھے۔ وہاں آپ نے کوئی آواز بلند کی تھی۔ اتنی زور سے تالیاں بجیں کہ انور عظیم کا اعتراض دھواں ہو کر اڑ گیا۔ علی گڑھ آئے تو معلوم ہوا کہ صدور شعبہ ہائے تعلیم کا بھی ڈین آف دی فیکلٹیز کی طرح rotation ہوگا۔ قیاس ہے کہ پانچ سال کا term ہوا کرے گا۔ میں نے جب سید ہاشم علی صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ملاقات کی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے۔ میں نے کہا ۱۶ رجولائی ۱۹۳۰ء۔ تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا پانچ سال کے روٹیشن میں تو آپ کا چانس آئے گا بھی تو برائے نام۔ بیگم صاحبہ جو میری فین بھی تھیں، چائے بناتے بناتے رک گئیں اور فرمایا کیا یو.جی.سی کا یہ حکم ہے کہ پانچ سال کا ٹرم ہو۔ وائس چانسلر نے فرمایا نہیں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے۔ چائے کا ایک گھونٹ لے کر وائس چانسلر نے فرمایا۔ تم نے صحیح کہا۔ میں تین سال کا روٹیشن کروں گا تاکہ قاضی صاحب کو پورا ٹرم ملے اور محفل برخاست ہوگئی۔

تین سال کا روٹیشن آ گیا۔ اب سب سے زیادہ پریشانیاں دو آدمیوں کو تھیں۔ ایک اخلاق محمد خاں شہریار کو اور دوسرے نورالحسن نقوی کو۔ مجھے اس کا علم تھا لیکن عام لوگوں کو نہیں تھا۔ میں نے اپنے عزیز دوست کنور پال سنگھ کو بتا دیا۔ پروفیسر کنور پال سنگھ نے کسی محفل میں ذکر کیا کہ قاضی صاحب تین برس چیئرمین رہیں گے اور انھیں کی صدارت میں دو پروفیسر شپ بھری جائیں گی۔ علی گڑھ میں جن وادی لیکھک سنگھ کی شاخ قائم ہو چکی تھی اور جلسے بھی ہونے لگے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تھیسس ترقی پسندی کے خلاف تھی، اور شہریار ان کے مرید تھے۔ دونوں ترقی پسندی کے خلاف تھے۔ چوں کہ میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا سکریٹری رہ چکا تھا۔ اس لیے پروفیسر مجنوں گورکھ پوری اور ڈاکٹر عبدالعلیم کی مرضی سے مجھے علی گڑھ شاخ کا سکریٹری بنایا گیا اور انجمن جو کہ defang پڑی تھی، اس کے جلسے ہونے لگے۔ کسی جلسے میں کبھی نہ خلیل الرحمٰن اعظمی آئے، نہ شہریار آئے۔ جن وادی لیکھک سنگھ، انجمن ترقی پسند مصنّفین سے بھی زیادہ radical تھی۔ اب شہریار نے کے. پی. سنگھ کو جن سے ان کا تعارف تھا Cultivate کرنے لگے اور جن وادی لیکھک سنگھ کے جلسوں میں آنے لگے، اور کے. پی. سنگھ کی اتنی خوشامد کی کہ انھوں نے مجھ سے سفارش کی کہ بھائی صاحب شہریار کو معاف کر دیجیے۔ وہ بہت پریشان اور شرمندہ ہے۔ میرے یہاں خدا کے فضل سے نہ ریاکاری تھی، نہ کینہ پروری۔ میں نے کہا میں نے معاف کر دیا۔ ایک اتوار کو شہریار آئے اور میرا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سختی سے کہا یہ کیا کرتے ہو۔ میں مرد آدمی ہوں۔ جو زبان سے کہتا ہوں، اس پر عمل کرتا ہوں۔ میں نے کے. پی. سنگھ کی سفارش پر تم کو معاف کر دیا اور میں تمھاری پروفیسر شپ میں پوری مدد کروں گا انشاءاللہ۔ ایک شام کلب میں آئے۔ میں بلیرڈ کھیل رہا تھا کہ شہریار اور نورالحسن نقوی دونوں آئے اور گزارش کی کہ میں ان دونوں کو ساتھ لے کر دہلی جاؤں اور ڈاکٹر محمد حسن سے

جو Expert تھے اور قمر رئیس سے کہ وہ بھی دوسرے Expert تھے، ان کی معافی تلافی کروں۔ میں نے بہت چاہا کہ نہ جاؤں۔ میں نے ان کے شدید اصرار پر کہا کہ میں ڈاکٹر محمد حسن سے مل لوں گا، قمر رئیس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ان کا معاہدہ ہے کہ تم علی گڑھ میں میری بات مانو گے اور دہلی میں میں تمہاری بات مانوں گا، لیکن میرے اس بیان پر نہ تو اخلاق محمد خاں شہریار کو اعتماد ہوا اور نہ نورالحسن نقوی کو۔

خیر ایک دن ہم نے ٹیکسی لی اور دہلی پہنچے۔ نورالحسن نقوی اور شہریار ٹیکسی پر بیٹھے رہے۔ میں ڈاکٹر محمد حسن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے میں نے اپنی گزارشات پیش کی۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد انھوں نے کہا کہ میں ان دونوں میں سے کسی کو اہل نہیں سمجھتا لیکن تم اصرار کر رہے ہو تو میں دستخط کر دوں گا مگر ان کا نام propose نہیں کروں گا۔ میں نے کہا میں اس پر رضامند ہوں۔ میں نے وہیں سے قمر رئیس کو فون کیا کہ اس مقصد کے لیے دلی آیا ہوں۔ ڈاکٹر محمد حسن کو میں نے ہموار کرلیا ہے۔ تم کیا کہتے ہو، اور ذرا زور سے جواب دینا تاکہ شہریار اور نورالحسن نقوی بھی سن سکیں۔ قمر رئیس نے جواب دیا کہ قاضی صاحب شہریار اور نورالحسن نقوی تو آدمی ہیں۔ اگر آپ کسی کھمبے کے متعلق کہیں گے کہ اس کو سپورٹ کرو تو میں ایسا ہی کروں گا۔ یہ میرا آپ سے معاہدہ ہے۔ خیر ہم لوگ واپس آگئے۔ ان دونوں کے شدید اصرار کے باوجود ٹیکسی کا کرایا بھی میں نے ہی ادا کیا۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ شہریار اور نورالحسن دونوں الگ سے محمد حسن کے پاس گئے اور ایک ایک پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن بہت سخت آدمی تھے۔ انھوں نے فرمایا میں قاضی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس پر قائم رہوں گا۔ بس آپ لوگ جائیں۔ وہاں سے اُٹھ کر یہ دونوں حضرات قمر رئیس کے پاس گئے۔ نورالحسن کبھی کبھی قمر رئیس کو شیشے کی بوتل کا تحفہ پیش کیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ تو چپ چاپ بیٹھے رہے، لیکن

شہر یار نے ان کا بھی پیر پکڑ لیا۔ قمر رئیس نے کہا کہ میں قاضی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور قاضی صاحب آپ دونوں کا نام Propose کریں گے۔ میں second کروں گا۔ سلیکشن کمیٹی میں چند روز باقی تھے کہ وائس چانسلر سید ہاشم علی کا خط موصول ہوا کہ آج شام چائے میرے ساتھ پیجئے۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ بیٹھتے ہی فرمایا میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ شہر یار شراب پی کر کلاس لیتا ہے۔ میں گھبرا گیا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ شک تو مجھے بھی تھا، یقین نہیں تھا۔ خیال آیا کہ اگر میں نے پیروی نہیں کی تو وائس چانسلر ان کا تقرر نہیں کرے گا، اور میری سخت بدنامی ہوگی۔ میں نے عرض کیا سر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شہر یار نے کبھی شراب پی کر کلاس نہیں لی ہے اور گزارش کرتا ہوں کہ چوں کہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس لیے میری اس گزارش کو بھی قبول فرمایئے، چپ ہو گئے۔ میں چائے پی کر چلا آیا۔ Selection Committee ہوئی۔ ہاشم علی صاحب نے ڈاکٹر محمد حسن سے پوچھا کہ ہاں محمد حسن صاحب آپ نام دیجیے۔ محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ قاضی عبدالستار میرے بہت عزیز شاگرد ہیں۔ میں چاہوں گا کہ وہ خود نام تجویز کریں۔ میں نے فوراً ان دونوں کے نام تجویز کیے۔ قمر رئیس نے تائید کی۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے سامنے وہ کاغذ جب گیا تو وہ خاموش بیٹھے رہے۔ دستخط نہیں کر رہے تھے۔ تب میں اُٹھ کر ان کے پاس حاضر ہوا۔ گزارش کی کہ میری خاطر سے دستخط کر دیجیے۔ انھوں نے بہت تساہلی سے اپنا قلم نکالا، کھولا، دستخط فرمایا جناب قاضی عبدالستار صاحب یہ اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ہے۔ وصی الرحمٰن صاحب جو پی وی سی تھے وہ ہنسے اور فرمایا قاضی صاحب کا بس چلے تو ڈپارٹمنٹ میں جتنے لوگوں نے اپلائی کیا ہے سب کو پروفیسر بنوا دیں۔ جب سلیکشن کمیٹی ہوئی اور ہم لوگ باہر نکلے تو شہر یار اور نورالحسن دونوں زینے کے نیچے دروازے پر کھڑے تھے۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے

مسکرا کر Congratulate کیا۔ تب ان کے حواس درست ہوئے۔ ڈاکٹر محمد حسن بغیر مسکرائے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہریار اور نقوی دونوں نے قمر رئیس کا شکریہ ادا کیا تو قمر رئیس نے جواب دیا میں نے صرف قاضی صاحب سے دوستی نبھائی ہے۔

راشد: قاضی صاحب علی گڑھ کو آپ مجھ سے بہت بہتر جانتے ہیں۔ لوگوں کی نفسیات سے آپ جس قدر واقف ہیں، اتنی گہرائی اور باریک بینی سے شاید ہی کسی دوسرے نے مختلف النوع حالات کا تجزیہ کیا ہو۔ کہنے کی بات نہیں کہ اگر ماحول کسی کے لیے سازگار ہے تو یہاں لوگ اسے سرآنکھوں پر بٹھاتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو وہی لوگ اسے رُسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ویسے تو انسان کی اس عمومی نفسیات کا اطلاق ہر جگہ کے ماحول پر کیا جا سکتا ہے، لیکن شاید علی گڑھ میں یہ حقیقت زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ تعریف کا سلسلہ چلتا ہے تو بیشتر لوگ رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں اور تنقیص پر آتے ہیں تو وہاں بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کسی کو بھی ذلیل و خوار کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہم نواؤں کے ساتھ ہی علی گڑھ میں آپ کے مخالفین بھی ہمیشہ سرگرم رہے۔ یہاں تک کہ شعبۂ اردو کے لوگ بھی آپ سے ہمیشہ برہم رہے۔ کیا اس رویے نے آپ کو کبھی ایسا نقصان پہنچانے کی کوشش کی جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

قاضی عبدالستار: ہاں ہمارے کرم فرماؤں نے ایسا جال بنا تھا کہ خدا کی پناہ۔ میں اس سازش کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں Sabbatical Leave پر تھا اور ڈپارٹمنٹ بہت کم جاتا تھا۔ ایک دن خیال آیا کہ اپنی ڈاک لے لی جائے۔ ہر چند کہ میری ڈاک بہت کم ہوتی ہے، تاہم ہوتی ہے، اور اسے لینے ڈپارٹمنٹ گیا تو ڈپارٹمنٹ کے تمام کمرے بند تھے۔ صرف ڈاکٹر نادر علی خاں اپنے کمرے میں موجود تھے میں نے آفس سے اپنی ڈاک لی اور اپنے چیمبر کی طرف چلا تو

ڈاکٹر نادر علی خاں نے مجھے روک لیا اور فرمایا کہ حضرت آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب میں کہاں چلوں۔تو خاصی تلخی اور رنج سے فرمایا آج آپ صرف میرے ساتھ چلیں۔ میں ان کے ساتھ PVC آفس پہنچا۔ PVC آفس کے کمیٹی روم میں سارا ڈپارٹمنٹ موجود تھا اور وائس چانسلر علی محمد خسرو کرسی صدارت پر رونق افروز تھے۔سب سے پیچھے دو تین کرسیاں خالی تھیں۔ اس پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔اس وقت بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب حضرات یہاں کیوں جمع ہیں۔اچانک علی محمد خسرو نے شہریار سے کہا کہ ہاں وہ کاغذ لائیے۔ وائس چانسلر علی محمد خسرو نے ایک کاغذ پڑھا، کھڑے ہوئے اور فرمایا جناب قاضی عبدالستار صاحب آپ کے خلاف شکایت ہے کہ آپ اسلام کی مخالفت میں تقریریں کرتے ہیں اور یونیورسٹی پر بہت سخت اعتراضات بھی کرتے ہیں۔آپ کو اس سلسلے میں کیا کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میری آگ لگ گئی۔ میں زور سے کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہوا اور عرض کیا، صلاح الدین ایوبی کے مصنف سے اسلام پر گفتگو کرتے وقت احتیاط برتنا چاہیے۔ میں نے ابھی اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر نادر علی خاں کھڑے ہو گئے اور بہت غصے کے ساتھ فرمایا کہ میں قاضی عبدالستار کے بیان کے ایک ایک لفظ کی تائید کرتا ہوں۔ وہ لوگ جس کی شامیں...... ان کے منھ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ میں ے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ خاں صاحب بس کیجیے۔ وائس چانسلر علی محمد خسرو تقریباً آدھا منٹ کھڑے رہے۔اس کے بعد فرمایا جلسہ برخاست۔باہر نکلے تو پروفیسر کنور پال سنگھ کھڑے ہوئے تھے۔انھوں نے نادر علی خاں کو Congratulate کیا اور کہا کہ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ وائس چانسلر صاحب نے قاضی صاحب کو dismiss کرنے کے لیے یہ پوری سازش رچی تھی، لیکن صرف آپ کی مخالفت نے اس سازش کو ختم کر دیا۔ قانوناً جب تک ڈپارٹمنٹ کا ایک ایک آدمی ایسی شکایت میں شامل نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی ایکشن نہیں لیا

جا سکتا۔ کے پی سنگھ نے نادر علی خاں سے ہاتھ ملایا اور میرے ساتھ ساتھ میرے گھر تک آ گئے۔ کرم فرماؤں نے تو کوشش بہت کی کہ میں ملازمت سے برخاست کر دیا جاؤں لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل پائی۔

راشد: قاضی صاحب ہر انسان اپنے اصولوں کے ساتھ جینا چاہتا ہے، لیکن ناسازگار حالات اس قدر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ شاد و ناشاد زندگی سے سمجھوتا کرنے کا مرتکب ہو جاتا ہے اور لاشعوری طور پر مصلحت پسندی اس کے مزاج اور اس کی مجموعی شخصیت کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ کم و بیش ہر انسان نہ چاہتے ہوئے زندگی میں مصلحت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ شروع میں تو بعض چیزیں مجبوراً اس کی زندگی میں شامل ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے، اور پھر زندگی میں ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ مصلحت پسندی کے بغیر کسی کام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں یہ تمام باتیں ایک خاص مقصد کے تحت کر رہا ہوں۔ آپ نے اپنے رویوں اور بے باک گفتگو کی بدولت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ نے مصلحت پسندی سے کبھی سروکار نہیں رکھا، اور ایک مخصوص مزاج کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ اس مزاج نے آپ کو نقصان بھی بہت پہنچایا لیکن آپ نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی۔ مصلحت پسندی کے رویے کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

قاضی عبدالستار: میری زندگی ہمیشہ ایک کھلی کتاب کی طرح رہی ہے۔ میرے پاس چھپانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے مصلحت پسندی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زندگی میں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اسے میں نے نہ صرف من وعن قبول کیا ہے، بلکہ ہمیشہ اس کا بے باک اظہار بھی کیا ہے۔ کبھی کسی چیز پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ عشق کیا تو ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ لڑائیاں لڑیں تو بھی کھلم کھلا۔ کینہ پروری، منتقل مزاجی جیسی صفاتِ عالیہ سے خدا نے مجھے محفوظ رکھا ہے اور میں نے اپنے اس رویے کی بنا پر زندگی میں بہت

سے نقصان اُٹھائے، لیکن مجھے آج تک کسی نے کسی کے پاس بھی روتے گاتے نہیں سنا ہوگا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس کرپٹ سوسائٹی میں آپ بے محابہ گفتگو کرتے ہیں تو پھر آپ کو اس کے تلخ اور ترش اور شدید ردِ عمل کا نشانہ بننے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے اور میں اپنے اس رویے کے لیے بہت نقصان اُٹھا چکا ہوں مگر مطلق شرمندہ اور شرمسار نہیں ہوں۔

راشد: آپ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ آپ نے زندگی میں کبھی بھی مصلحت پسندی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا اور وہی کیا جو آپ کو مناسب معلوم ہوا۔ کبھی ذہن کو اپنا رہنما بنایا اور کبھی دل کی آواز پر لبیک کہا، اور زندگی میں جس طرح بھی نشیب و فراز سے گزرتے رہے، کبھی اس کی شکایت زبان پر نہیں لائی۔ ظاہر ہے جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کو سن کر فیصلہ کرے گا تو اسی فیصلے سے ہونے والے نقصانات کے لیے وہ خود ذمے دار ہوگا۔ آپ اپنی پوری زندگی میں اس نشیب و فراز سے دوچار رہے لیکن ان سب کے لیے آپ کسی بھی طرح شرمندہ اور شرمسار نہیں ہیں۔ یہ ساری باتیں مصلحت پسندی کو بالائے طاق رکھنے پر ہی ممکن ہیں۔ میں پچھلے دنوں آپ کے تحقیقی مقالے ''اردو شاعری میں قنوطیت'' کا مطالعہ کر رہا تھا تو انتساب کا صفحہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کتاب کا انتساب آل احمد سرور کے نام ہے جن سے تمام عمر آپ کے شدید اختلافات رہے اور آپ نے اس کتاب میں جگہ جگہ ان تلخ باتوں کا ذکر قدرے بے باک انداز میں بھی کیا ہے۔ نام سے زیادہ ''انتساب'' کے شعر نے مجھے پریشان کیا جو اس طرح ہے:

''لکیر جو ورقِ دل پر جگمگائی ہے
تیرے قدم کے چراغوں کی روشنائی ہے''

ایک تو کتاب کا انتساب آل احمد سرور کے نام اور پھر یہ شعر۔ قاضی صاحب مجھے تو یہ مصلحت پسندی کی انتہا نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو آپ مصلحت پسندی کو

سختی کے ساتھ رد کرتے ہیں اور زور دے کر اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی مصلحت پسندی سے کوسوں دور ہے اور دوسری طرف کتاب کا انتساب کرتے ہوئے یہ شدید مصلحت پسندانہ شعر درج کرتے ہیں۔ان باتوں سے تو آپ کی پوری تھیسس از خود رد ہو سکتی ہے۔اپنی وضاحت میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

قاضی عبدالستار: اس بات کی وضاحت کے لیے پورا واقعہ تفصیل سے سنانا ضروری ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھنؤ میں مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ میں ان کے عزیز ترین شاگردوں میں رہا۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی، صدر شعبۂ اردو و فارسی اور پروفیسر احتشام حسین جیسی ہستیوں کا تقرب بھی مجھے نصیب تھا، لیکن ان دونوں حضرات نے اپنا کوئی نجی کام مجھ سے نہیں لیا، جب کہ پروفیسر آل احمد سرور نے مجھے کرامت حسین گرلز کالج کی انٹرمیڈیٹ کی کاپیاں دو برس تک دیکھنے کو دیں، اور بھی چھوٹے موٹے کام مجھ سے لیے۔ دوا منگوالی، کسی کو کچھ میسج بھیجنا ہو تو مجھ سے بھیج دیا وغیرہ وغیرہ، لیکن جب ایم اے فائنل کا اردو کا وائیوا ہوا اور رشید صاحب کے سوال کے جواب میں میں نے کلیم الدین احمد کا نام لیا کہ وہ سب سے بڑا نقاد ہے تو احتشام صاحب نے مجھے معاف کر دیا، لیکن سرور صاحب نے مجھے معاف نہیں کیا۔ جب میں نے ریسرچ میں جولائی ۱۹۵۴ء میں داخلہ لیا تو اردو ڈپارٹمنٹ، فارسی ڈپارٹمنٹ سے الگ ہو چکا تھا اور سرور صاحب اس کے سربراہ ہو چکے تھے اور جب میری تھیسس کے موضوع کا سوال پیدا ہوا تو میں نے خواہش کی کہ مجھے پریم چند کا Topic دیا جائے لیکن سرور صاحب نے منظور نہیں کیا۔ تب میں نے ترقی پسند افسانے کے لیے کہا تو وہ منظور نہیں ہوا۔ آخر آخر میں نے ترقی پسند ناول پر کام کرنے کے لیے زور دیا لیکن یہ گزارش بھی منظور نہیں ہوئی اور سرور صاحب نے مجھ پر ''اردو شاعری میں قنوطیت'' جیسا موضوع مسلط کر دیا۔ میں ایک ناول کا مصنف تھا۔ اس لحاظ

سے مجھے فکشن کا موضوع ملنا چاہیے تھا جو انھوں نے نہیں دیا۔ سرور صاحب کا خیال تھا کہ میں اس موضوع پر تھیس نہیں لکھ سکوں گا، لیکن جب میں علی گڑھ میں فیلو ہو گیا تو میں نے اسی موضوع کو برقرار رکھا۔ میرے سپروائزر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مجھے اجازت دی کہ میں اپنا موضوع تبدیل کر سکتا ہوں، لیکن میں نے منظور نہیں کیا۔ کچھ تو اس لیے کہ میں ابتدائی کام کر چکا تھا اور کچھ اپنی انانیت کے لیے کہ میں اس موضوع پر کام کر کے دکھلا سکتا ہوں، اس موضوع کو برقرار رکھا۔ جب میری تھیس منظور ہو گئی اور ڈگری تفویض ہو گئی، تب شعبۂ اردو کی ایک میٹنگ میں پروفیسر آل احمد سرور نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کی تھیس مکمل ہے تو وہ اگر چاہیں تو ڈپارٹمنٹ اس کی اشاعت کا انتظام کر سکتا ہے۔ تین آدمیوں کی تھیس منظور ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر معین احسن جذبی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور خاکسار۔ سرور صاحب کی خواہش تھی کہ خلیل الرحمٰن اعظمی جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے خلاف اپنی تھیس لکھی تھی، وہ شائع کی جائے، لیکن خلیل صاحب رضامند نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر معین احسن جذبی اور خاکسار نے اپنی اپنی تھیس پیش کی۔ جب اس کی اشاعت کا مسئلہ خدا کے فضل سے آیا تو پروفیسر رشید احمد صدیقی جن کی رہنمائی میں میری تھیس مکمل ہوئی تھی، حیات تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ پورے علی گڑھ میں جو مجھے جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں آپ کا کتنا لحاظ کرتا ہوں، کتنی محبت کرتا ہوں، لیکن میں یہ تھیس پروفیسر آل احمد سرور کے نام dedicate کرنا چاہتا ہوں۔ رشید صاحب نے پوچھا اس میں کیا مصلحت ہے تو میں نے عرض کیا کہ سرور صاحب نے یہ موضوع مجھے اس لیے دیا تھا کہ ان کو یقین تھا کہ میں یہ تھیس مکمل نہیں کر سکتا، لیکن میں نے دیے ہوئے وقت میں تھیس مکمل کی۔ ۱۹۵۵ء میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۷ء میں ڈگری لے لی۔ اس لیے میں ان کو dedicate کرنا چاہتا ہوں۔ رشید صاحب مسکرائے اور فرمایا

میں نے آپ کو اجازت دی، پھر فرمایا بیٹھیے۔ تھوڑی دیر کے بعد حکم ہوا کہ جب آپ ان کے نام معنون کر ہی رہے ہیں تو سلیقے سے کیجیے۔ سرور کو شعر کہنے کا بھی شوق ہے۔ کوئی اچھا سا شعر تلاش کیجیے۔ ایک خاص طرح کی مسکراہٹ کے بعد مجھے رخصت کر دیا۔ اس رات میں نے یہ شعر موزوں کیا۔ میں نے اس رات پوری غزل کہی، اور یہ شعر لکھ کر ان کو دیا۔ سرور صاحب کو خوش گوار حیرت ہوئی اور سوال کیا کہ رشید صاحب آپ سے ناخوش تو نہیں ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان سے اجازت حاصل کر چکا ہوں۔ وہ دیر تک مجھے دیکھتے رہے لیکن خاموش رہے۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے سنایا کہ لوگ سوچتے ہوں گے کہ شاید میں نے یہ dedicate خوشامدانہ طور پر کیا ہے۔ اس کی تردید کے لیے میں نے پورا واقعہ آپ کو سنایا۔ میرا کوئی خانہ مصلحت پسندانہ نہیں ہے، اور ثبوت یہ ہے کہ سرور صاحب بھی میری نیت کو سمجھتے تھے۔ میرے تقرر میں ان کی خاموش مخالفت شامل رہی۔ اگر پروفیسر مسعود حسین رضوی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی جیسے آدمی نہ ہوتے تو میرا تقرر نہیں ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ سرور صاحب مجھے Permament نہیں کر رہے تھے، وہ تو خدا بھلا کرے صدیق حسین صاحب آئی سی ایس کا جو Executive Council کے ممبر تھے اور میرے بزرگوں کے دوست تھے۔ انھوں نے ملازمت کو مستقل ہونے میں مدد کی۔ سرور صاحب نے کوشش کی کہ میں ریڈر نہ ہوؤں، میری جگہ وہ مغنی تبسم کو لا رہے تھے لیکن وائس چانسلر ڈاکٹر علیم اور ڈین پروفیسر نورالحسن جو بعد میں وزیر تعلیم ہوئے، کی مدد سے میں ریڈر ہوا۔ میں پروفیسر بھی سرور صاحب کی مرضی کے خلاف ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے میرے خلاف جو شکایتی خط لکھا وہ پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ میرے ٹائم ٹیبل کو بدلنے کی کوشش کو وائس چانسلر نے ناکام کیا۔ یہ تمام ثبوت دلائل ہیں کہ وہ شعر، وہ dedication کسی مصلحت کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ ایک طرح کا اظہار تھا اپنی صلاحیت کا۔

○○○

دورۂ پاکستان

راشد: قاضی صاحب! مختلف علاقوں کا دورہ آپ کی ترجیحات میں شامل رہا ہے اور آپ شیخ سعدی کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اسفار کے ذریعے زندگی کے بیش قیمتی تجربوں میں اضافہ کرتے رہے ہیں، لیکن یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ ہوائی سفر کو آپ نے اکثر و بیشتر نظر انداز کرنے کی کوشش کی، اور اس بنا پر دوسرے ممالک کی سیر سے محروم رہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ آپ ٹرین کے ذریعے ہی کرتے رہے، یہاں تک کہ پاکستان کے دورے میں بھی آپ نے ٹرین کے سفر کو ہی ترجیح دی۔ پاکستان کا دورہ بھی آپ نے ایک ہی مرتبہ کیا۔ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی زاویوں سے پاکستان کا سفر کافی اہم رہا ہوگا اور مختلف النوع تاثرات آپ کے ذہن میں محفوظ ہوں گے۔ آپ تفصیل کے ساتھ دورۂ پاکستان کی روداد بیان کریں تاکہ اندازہ ہو کہ فکشن کا ایک باکمال فن کار ایک دوسرے ماحول کا حصہ بن کر زندگی کی جزئیات کو کن زاویوں سے دیکھتا ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ ہوائی سفر میں آپ کو اس قدر تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی ہوائی سفر میں پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں، لیکن میں آپ کے تاثرات جاننے کا خواہش مند ہوں۔

قاضی عبدالستار: پہلے گفتگو سفر سے متعلق ہی شروع کی جائے۔ سفر میں پریشانیاں لاحق تو ہوتی ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ زیادہ سفر کرنے سے انسان نسبتاً تروتازہ بھی رہتا ہے۔ ہمارے دوست قمر رئیس اکثر کہا کرتے تھے کہ سفر کی وجہ سے ہی وہ ہمہ وقت چست، تندرست اور تروتازہ رہتے ہیں۔ جو انسان مسلسل سفر کرتا ہے وہ جسمانی طور پر بھی زیادہ active رہتا ہے، اور پھر یہ بھی ہے کہ مختلف جگہوں پر جانے سے، آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے جو صحت کے لیے بے حد فرحت بخش ہوتی ہے۔ زندگی کے تجربوں میں جو اضافے ہوتے ہیں، وہ الگ ہیں۔ یہ تو ہوئی سفر کی بات جس سے کم و بیش ہر انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں دور دراز کے علاقوں کا زیادہ تر سفر میں نے ٹرین کے ذریعے کیا ہے۔ ٹرین کے ذریعے سفر کرنے کا، ایک الگ ہی لطف ہے، لیکن میرے لیے ہوائی جہاز سے سفر کرنے کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ بحالت مجبوری میں نے دو ایک سفر ہوائی جہاز سے بھی کیا ہے لیکن میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ ڈاکٹروں نے صلاح دی ہے کہ میں ہوائی سفر کو نظر انداز کروں، ورنہ سفر کے دوران مجھے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میری حالت ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے۔ اس کمزوری کی وجہ سے میں دیگر ممالک کا سفر نہیں کر پایا۔ ہندوستان کے باہر صرف دو مرتبہ ہی میں کسی طرح جانے میں کامیاب ہو سکا۔ دور قطر والے سفر میں تو خیر مجبوری تھی لیکن پاکستان سے واپسی کا جو معاملہ تھا وہ سفر میں نے بذریعہ ٹرین ہی کیا۔ کیا کروں مجھے نفسیاتی طور پر شدید ذہنی دباؤ سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اب تو میں ٹرین کے سفر کو بھی نظر انداز کرتا ہوں اور زیادہ تر آرام کو ترجیح دیتا ہوں۔

ہاں تو بات دورۂ پاکستان کی ہو رہی تھی۔ میں تاجم سلطان کی موت اور کوثر کی بیماری سے ٹوٹا پڑا تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن آ گئے اور فرمایا کہ انجمن اساتذہ

جامعاتِ ہند کا وفد پاکستان جارہا ہے۔ وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے میرا جانا ضروری ہے۔ میں نے انھیں ٹالنے کی کوشش کی، لیکن ڈاکٹر صاحب جو میرے استاد بھی تھے، زبردستی مجھے تیار کیا۔ ہم لوگوں کے ایمرجنسی پاسپورٹ بنے، اور شام کو چار بجے ہم لوگ بذریعہ طیارہ لاہور پہنچ گئے۔ جاتے ہی میں نے ''نقوش'' کے ایڈیٹر محمد طفیل کو فون کیا کہ آپ سے ملاقات کی سبیل کیا ہو تو انھوں نے فرمایا کہ آپ داراشکوہ والے قاضی عبدالستار ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں میں وہی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں خود آرہا ہوں۔ دس منٹ کے اندر وہ آ گئے۔ وفد میں ڈاکٹر محمد حسن Leader of the delegation تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین، عنوان چشتی، قمر رئیس، عبدالحق وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ محمد طفیل مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر آفس لے گئے۔ وہاں پوچھا شام ہوگئی ہے، آپ جوشؔ صاحب کے دیار سے آپ رہے ہیں۔ کچھ خدمت کی جائے۔ میں نے کہا نہیں میں محروم ہوں، مسکرائے۔ ہم نے تو کچھ اور سن رکھا ہے۔ ہم نے ٹال دیا اور کہا کہ ہمیں داتا گنج بخش کے مزار پر لے چلیے۔ ہم فاتحہ پڑھیں گے۔ ہم انھیں کے ساتھ ساڑھے نو بجے رات تک رہے۔ پھر اپنے قیام گاہ لاہور ہوٹل واپس آئے۔ محمد طفیل نے ڈاکٹر محمد حسن سے ملاقات کر کے گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا اور سب کو فہرست دکھا کر پوچھا کہ اور جس نام کو آپ چاہیں، بڑھا دیں۔ میں نے جمیلہ ہاشمی کا نام لیا۔ محمد طفیل نے فرمایا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ پارٹی میں نہیں آئیں گی۔ میں نے کہا آپ دعوت نامہ بھیجیے۔ میرے حوالے سے بھیجیے۔ انشاءاللہ آئیں گی۔ دعوت سے پندرہ منٹ پہلے ایک مکلّف آدمی میرے پاس آیا کہ جمیلہ ہاشمی صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ میں باہر نکلا تو قدرے دراز قد، ہلکے بدن، دبتا ہوا گندمی رنگ، خوش چہرگی سے آراستہ ایک خاتون کھڑی تھیں۔ میں جمیلہ ہاشمی ہوں۔ ہم دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں طفیل سے ناخوش

ہوں۔ صرف آپ کی خاطر آئی ہوں۔ میں نے طفیل صاحب کو بلایا۔ انھوں نے مسکرا کر پذیرائی کی، اور بہت اہتمام اور احترام کے ساتھ ان کو مہمانوں کے پاس لے آئے۔

مہمانوں کا پورا جم غفیر تھا۔ خاصے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جمیلہ ہاشمی نے چلتے وقت مجھ سے وعدہ لیا کہ کل لنچ آپ میرے ساتھ کریں گے۔ ہر چند ہمارا پروگرام محمد حسن کے ہاتھ میں تھا، لیکن ہم نے وعدہ کرلیا۔ دوسرے دن گیارہ بجے ایک لمبی سی گاڑی آئی اور ہم کو لے گئی۔ ایک شاندار کوٹھی کے پورٹیکو میں گاڑی رکتے ہی جمیلہ ہاشمی آگئیں اور سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں ہم لوگ داخل ہوئے۔ اتنے میں انھوں نے آواز دی۔ ان کی صاحب زادی لڑکوں کا لباس پہنے، باب ہیئر، قمیص پتلون پہنے، چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی سامنے آئی۔ جمیلہ ہاشمی نے کہا قاضی عبدالستار صاحب ہیں۔ سلام کرو، اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ جمیلہ ہاشمی نے کہا کہ یہ آپ سے بہت ناخوش ہیں، اس لیے کہ جب میں 'شب گزیدہ' پڑھتی ہوں تو کہتی ہے کہ آپ سو مرتبہ پڑھ چکی ہیں۔ کیا حفظ کریں گی۔ میں کہتی ہوں کہ بیٹے جب آپ بڑی ہو جائیں گی تو آپ بھی میری طرح پڑھیں گی۔ وہ لڑکی بعد میں پاکستان سول سروسز میں آگئی۔ جب ہم لوگ اسلام آباد چلنے لگے تو محمد طفیل صاحب تشریف لائے، اور مجھ سے کہا کہ ذرا آنکھیں بند کر لیجیے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ انھوں نے میری جیب میں کچھ رکھ دیا۔ آنکھیں کھولیں، جیب سے چیک نکالا۔ محمد طفیل نے فرمایا لاکھ دو لاکھ روپیہ ہر وقت بینک میں رہتا ہے خدا کے فضل و کرم سے (خدا کے فضل و کرم پر خاصا زور دیا)۔ میں نے چیک لکھ دیا ہے۔ رقم آپ لکھ لیجیے، جو آپ کا جی چاہے۔ میں ان کی اس محبت سے سراسیما ہو گیا اور خاموش رہا۔

راشد: قاضی صاحب! اس محبت پر تو کوئی بھی مر مٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔ واقعی پرانے لوگوں میں زندگی کی خوش گوار قدریں جس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

تھیں، موجودہ زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ادیب اور فن کار جب دوسرے ملک میں جائے اور وہاں لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں تو اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر دولت بے معنی ہو جاتی ہے اور لوگوں کا خلوص لہو میں شامل ہو کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ پاکستان میں تو آپ کے قدردانوں کا جم غفیر ہوگا۔ ایک دو نہیں، کئی لوگوں کی خلوص عنایتیں آپ کے ساتھ شامل رہی ہوں گی۔ تمام باتوں کا تو ذکر نہیں کیا جا سکتا، لیکن خاص خاص شخصیات اور واقعات کا حوالہ تو آنا ہی چاہیے۔

قاضی عبدالستار: آپ نے درست فرمایا۔ تمام باتیں تو بیان نہیں کی جا سکتیں، لیکن خاص باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم لوگ کراچی پہنچے تو جمیل جالبی صاحب تشریف لائے اور ہم لوگوں کو ڈنر پر Invite کیا۔ جمیل جالبی صاحب اس وقت کراچی میں انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ انھوں نے بہت بڑی دعوت کی۔ مجھ سے پوچھا بھی گیا اُم الخبائث کے بارے میں۔ میں نے انکار کر دیا۔ دعوت سے پہلے میں ''غالب'' ناول کا ایک باب لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے جمیل جالبی کے کان میں بتا دیا۔ انھوں نے فرمائش کی۔ ان کا پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ میں نے وہ باب سنایا۔ اس پر ابوالخیر کشفی نے کہا کہ اس اسٹائل میں پورا ناول لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے۔ ایک دن ہم نے شام کو جمیل جالبی کی خدمت میں عرض کیا کہ کسی کو ہمارے ساتھ کر دیجیے۔ ہم زری کے کام کے سینڈل خریدنا چاہتے ہیں۔ وہ ازراہِ محبت خود تیار ہو گئے اور مجھے سب سے بڑی دوکان پر لے گئے اور فرمایا جتنے جی چاہے خرید لیجیے۔ میں نے چار جوڑے سینڈل اور ایک زرکار جوتا پسند کیا اور قاضی صاحب جو اس کے مالک تھے، ان کے پاس گیا کہ یہ سب کتنے کا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کی قیمت یہ ہے کہ آپ قبول کر لیجیے۔ جمیل جالبی مسکراتے رہے۔ معلوم ہوا سارا payment وہ کر چکے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے ایک گھڑی بھی میری بیگم کے لیے

دی تھی جو میں نے آتے ہی کوثر کو پہنا دی تھی۔ اسی دعوت میں جمیل الدین عالی سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں حمیدہ سلطان صاحبہ کا منہ بولا بھائی ہوں تو ان کے اخلاق کا میک اَپ بدل گیا اور وہ بہت خوش ہوئے۔ اپنی بیگم سے بھی ملایا جو انھیں کی طرح انتہائی مہذب نواب زادی تھیں۔ میں نے یوں ہی مذاق میں پوچھا کہ 'ادقچہ' کسے کہتے ہیں۔فوراً جواب دیا بادشاہوں اور نوابوں کی محل سرا میں چھپر کھٹ کے ایک طرف ادقچہ اس لیے پڑا ہوتا کہ اس پر اگر جی چاہے تو رقاصہ کا رقص بھی ہو جائے۔یعنی ادقچہ زرکار قالین جیسا ہوتا ہے۔

جمیل الدین عالی نے پوچھا کہ حمیدہ سلطان سے آپ کے مراسم کیسے ہو گئے۔ میں نے عرض کیا کہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر میں سلام مچھلی شہری کے کمرے سے نکلا تھا کہ ایک صاحب زادی نے کمر تک خم ہو کر آداب کیا اور فرمایا بھائی صاحب آداب۔ میرا نام اختر آرا بیگم ہے۔ ابھی میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ آواز آئی۔ قاضی عبدالستار میں حمیدہ سلطان ہوں۔تمہاری بڑی بہن، اور یہ اختر تمہاری چھوٹی بہن۔تمہاری شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جو اختر نے نہ پڑھی ہو اور مجھ کو اور آقا بھائی کو نہ پڑھوائی ہو۔آقا بھائی سمجھے۔ میں نے کہا جی نہیں۔فرمایا جناب فخرالدین علی احمد صاحب۔ میں نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔اس وقت وہ شاید آسام میں وزیر تھے۔ پھر ہم کو حمیدہ آپا نیچے لے آئیں۔ اصرار کر کے گاڑی میں بٹھایا اور اپنے ساتھ بھی علی منزل لے گئیں۔علی منزل میں کھانے کی میز لگی تو معلوم ہوا کہ سارا کھانا سفید ہے۔سفید قورمہ،سفید بریانی،سفید زردہ، سفید مضافر،سفید روٹیاں۔ میں اس لیے واقف تھا کہ میرے ابوجان اپنے دوستوں کے لیے کبھی کبھی ایسے ہی کھانے پکواتے تھے۔ جب حمیدہ آپا نے دیکھا کہ میں بغیر کسی تحیر کے کھانے لگا ہوں تو انھوں نے کچھ سوالات کیے تھے۔ کھاتے وقت حمیدہ آپا نے پوچھا کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔ میں نے عرض

کیا کہ چار بجے ڈی لکس جاتی ہے۔ میں اسی سے علی گڑھ جاؤں گا، اس لیے کہ آج اسٹاف کلب کا فنکشن ہے اور مجھے بلیئرڈ کلب کا انعام لینا ہے۔ اچانک اختر آرا بیگم میز سے اُٹھ گئیں، ڈیوڑھی تک گئیں اور واپس آ گئیں۔ کھانے کے بعد ہم لوگوں نے کافی پی۔ جب میں اٹھا تو اختر آرا بیگم نے حمیدہ آپا سے فرمایا کہ میں بھائی صاحب کو رخصت کر دوں۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو حمیدہ آپا کسی مسلم نسواں کالج کی پرنسپل معلوم ہوئیں اور اختر آرا بیگم معمولی لباس میں بھی شہزادی کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ جب میں اسٹیشن پہنچا تو بکنگ آفس کی طرف بڑھا تو اختر آرا بیگم کے خادم نے ٹکٹ پیش کر دیا۔ میں نے تکلف کیا تو فرمایا کہ یہ حمیدہ آپا کا حکم تھا۔ میں بے قصور ہوں۔ جب تک گاڑی سے وہ نظر آتی رہیں، وہ مجھ کو اسی طرح کھڑی نظر آتی رہیں۔ جمیل الدین عالی ایک چھوٹی سی کہانی کی طرح ان ساری باتوں کو سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔

راشد: پاکستان کا دورہ ہو، اور اسلام آباد کا ذکر نہ آئے، یہ ممکن ہی نہیں۔ لاہور اور کراچی کی طرح اسلام آباد میں بھی شاعروں اور ادیبوں کا ایک جمگھٹ ہے اور وہاں کے لوگ بھی مہمان نوازی اور ادب نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے بلکہ کئی معاملوں میں انھیں اوّلیت حاصل ہوتی ہے۔ یقیناً آپ کے تاثرات بھی اسلام آباد سے متعلق بڑے خوش گوار رہے ہوں گے اور وہاں کے ادیبوں نے آپ کے شایانِ شان جلسوں کا اہتمام کیا ہوگا۔ اس طرح کے پروگرام تو بلاشبہ آپ کے لیے یادگار رہے ہوں گے، لیکن دوسرے لوگ جو آپ کے ساتھ تھے، یا آپ جن کے ساتھ تھے، انھیں اس نوع کے اعزاز سے پریشانیاں بھی تو ہوتی ہوں گی۔

قاضی عبدالستار: جب ہم لوگ اسلام آباد آئے اور میں نے لاہور اور کراچی کے تجربوں سے ڈاکٹر محمد حسن کو آگاہ کیا تو ان کو رشک آمیز حیرت ہوئی۔ اسلام آباد پہنچتے ہی دعوت نامہ آیا کہ شام کو ہندوستان کی ایمبیسی میں ہمارا Reception ہے اور

چھ بجے شام کو بلایا گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کی آخری تاریخیں تھیں، ہم لوگ پہنچے۔ بھرت پور کے شہزادے کنور نٹور سنگھ ہندوستان کے سفیر تھے۔ سیاہ شیروانی، گلو اور آستینوں پر مخمل لگا ہوا چوڑی دار پاجامہ، ڈربی شو پہنے شان کے ساتھ پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ ہم لوگوں کو وہ ایک جگمگاتے ہوئے ہال میں لے گئے۔ ایک طرف کے صوفوں پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ میں ڈاکٹر محمد حسن کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک ٹرالی آئی، وہ تین Layers کی تھی۔ اوپر solf drinks کے گلاس رکھے تھے اور درمیان میں بیئر کے مگ رکھے تھے اور سب سے نیچے وہسکی کے پیمانے سجے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن جو محفلوں میں پابندی کے ساتھ شراب نوشی فرماتے تھے، انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر، شاید مارشل لا کا خیال کر کے اور اپنی لیڈری کا احترام کر کے soft drinks کا گلاس اُٹھالیا۔ ٹرالی میرے سامنے آئی۔ ہم صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پیمانے چھلک رہے تھے۔ ہم نے ایک پیمانہ اُٹھالیا۔ کنور نٹور سنگھ کھڑے ہوئے۔ Here is writer، پھر کہا۔ Writer always betray the truth اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور پیمانہ اُٹھالیا اور اب گویا محفل میں کوئی دوسرا تھا ہی نہیں۔ ہم تھے، کنور صاحب تھے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، وہ مجھے اُٹھا کر اندر لے گئے۔ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور Bar attender کو طلب کیا۔ چھ فٹ کا ایک آدمی، ایک فٹ کا طرہ باندھے حاضر ہوا۔ کنور صاحب نے فرمایا یہ قاضی صاحب ہیں، اودھ کے رئیس۔ جب سے آئے ہیں، مارشل لا کی وجہ سے ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ بہترین شرابیں لے کر آؤ۔

ہاں میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ ساڑھے آٹھ بجے رات کو وزیر تعلیم نواب ہنٹی کے یہاں ہمارا ڈنر تھا۔ سب لوگ رخصت ہو کر Federal Guest House چلے گئے تھے۔ صرف ہم کو کنور صاحب نے روک لیا تھا۔ چاندی کی ایک پوری کشتی قسم قسم کے شرابوں سے بھری ہوئی Bar attender نے سامنے لا کر

رکھ دی۔ میں کنور صاحب کو یقین دلاتا رہا کہ میں محفلوں میں ذرا سی سرخوشی کے لیے تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ میں شراب کا عادی نہیں ہوں۔ وہ مسکرائے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی تعلیم ہے نا؟ ہر پیانے میں ایک چوتھائی پیگ تھا۔ وہ مجھے پلاتے رہے، میں پیتا رہا۔ واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُٹھتے ہوئے محسوس ہوا کہ پیر میرے نہیں ہیں۔ کنور صاحب مسکرائے اور ایک خادم نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا۔ ٹھیک سوا آٹھ بجے چلتے وقت بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ میں نے بہت خم ہو کر ان کو سلام کیا۔ کنور صاحب مسکراتے رہے۔ ایک خادم کے سہارے میں باہر آیا۔ جہاں کنور صاحب کھڑے ہوئے تھے، وہیں گاڑی آ گئی۔ وہاں میں نے یہ دیکھا کہ بڑے لوگ گاڑی کی طرف نہیں بڑھتے تھے بلکہ جہاں وہ کھڑے ہو جاتے، گاڑی وہیں آ جاتی تھی۔ پہلے مجھے بٹھایا گیا، پھر کنور صاحب تشریف فرما ہوئے۔ نواب صاحب کے ڈرائنگ روم تک ہم اس قابل ہو چکے تھے کہ اپنے پیروں پر چل کر جائیں، لیکن سر اپنے قابو میں نہیں تھا۔ ڈائننگ روم میں میزوں پر میوے رکھے تھے اور رسمی گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم چلغوزے ٹونگتے رہے اور ہوں ہاں کرتے رہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہم لوگ شاہی مہمان ہیں اور ہم چیف گیسٹ یعنی مہمانِ خصوصی ہیں، اس لیے کہ نواب نے سب سے پہلے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ڈائننگ روم کے لیے اُٹھوں، اور صدر کی میز پر مجھے بٹھایا۔ ڈاکٹر محمد حسن میرے بائیں طرف تھے اور کنور صاحب میرے داہنی طرف تھے۔ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ نواب صاحب نے فرمایا بسم اللہ۔ پلیٹیں اُلٹی رکھی ہوئی تھیں، جب ڈونگا میرے بائیں طرف آیا تو میں نے پورا چمچ اُلٹے پلیٹ پر انڈیل دیا۔ ایک خادم نے فوراً پلیٹ اُٹھائی اور دوسری لگا دی اور خود پلیٹ کی خدمت کی۔ ہم کو نہیں معلوم کہ ہم نے کیا کھایا۔ نواب جو سامنے بیٹھے ہوئے تھے، مسکرا کر مجھے دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی داہنی کہنی میرے پہلو پر چلتی رہی۔ خیر ہم کسی نہ کسی طرح اپنے

گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ پورا اسلام آباد گھومتے رہے، اس لیے کہ پریسیڈنٹ کی دعوت ہونے والی تھی۔ اچانک ڈاکٹر محمد حسن آئے اور کہا ''مری'' چلتے ہو۔ میں نے کہا چلیے۔

راشد: واہ! ''مری'' کا ذکر سنتے ہی ایک خوب صورت پہاڑی کا تصور ذہن میں روشن ہو گیا۔ میں نے اب تک وہ مقام تو نہیں دیکھا ہے لیکن ''مری'' کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے۔ مختلف لوگوں نے بھی بتایا ہے کہ یہ ایک بے حد خوب صورت مقام ہے اور جو لوگ بھی اسلام آباد جاتے ہیں، وہ ''مری'' کا دورہ ضرور کرتے ہیں۔ ''مری'' جیسے مقام کا تصور کرتے ہی احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''رئیس خانہ'' یاد آتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایسے مقامات کی سیر کرتے ہوئے ایک عام آدمی جہاں فقط قدرت کے حسین مناظر میں کھویا رہتا ہے، ایک حساس ادیب دوسری بہت سی چیزوں کا باریکی کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی تحریک پر آپ نے ''مری'' کے دورے کے لیے حامی تو بھر لی، لیکن اس پہاڑی مقام سے اپنے طور پر آپ کس طرح لطف اندوز ہوئے۔

قاضی عبدالستار: تین گاڑیوں پر ہم لوگ بٹھائے گئے۔ بہت خطرناک موڑ آتے رہے، گزرتے رہے۔ ایک آدھ جگہ تو موڑ بالکل دست پنہا (بہت گھماؤدار) کی طرح تھا۔ تھوڑی دیر تک مناظر کو دیکھتے رہے۔ پھر وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں لنچ کے لیے گئے۔ پورے ہال میں پندرہ بیس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ ایک کونے کی میز پر بٹھا دیے گئے۔ مخالف سمت کی دیوار کے نیچے ایک صاحب سفید ہائی نیک اور سفید فلالین کا پتلون پہنے ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے اور بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ حکومت کا ایک افسر ہر وقت رہتا تھا۔ ان حضرت نے انگلی کے اشارے سے اس افسر کو بلایا اور کچھ باتیں کیں۔ چلے گئے۔ جب ہم لوگ لنچ لے کر اُٹھے اور بل پیش ہوا تو معلوم ہوا کہ ''مری'' کے Commandent General نے وہ بل pay کر دیا۔ تب ہم لوگوں کو

معلوم ہوا کہ وہ سفید ہائی نیک کمانڈنگ جنرل تھا۔ وہ تشریف لائے۔ ہم لوگ چار آدمی تھے، اس لیے کہ قمر رئیس اپنی گم شدہ محبتوں کی تلاش میں مبتلا تھے۔ عنوان چشتی اپنی بیٹی کی شادی کی خریداری کے سلسلے میں ٹھہر گئے تھے۔ جنرل نے پوچھا آنے میں کوئی تکلیف ہوئی؟ ڈاکٹر محمد حسن نے فوراً فرمایا نہیں نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے بات کاٹ کر عرض کیا جناب والا بے انتہا تکلیف ہوئی۔ ہر موڑ پر ہم آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ وہ مسکراتے رہے۔ ہم لوگوں سے ہاتھ ملایا اور رخصت کر دیا۔ ہم لوگ اپنی گاڑیوں پر بیٹھ گئے۔ جب ''مری'' سے نکلنے لگے تو روک دیے گئے۔ ایک کیپٹن تین ستارے لگائے ہوئے آیا اور فرمایا کہ میرا انتظار کیجیے۔ جنرل صاحب کا حکم ہے کہ آپ کی گاڑیاں پائلٹ کے ساتھ جائیں گی اور ہر موڑ پر دوسری طرف سے آنے والی گاڑیاں روک دی جائیں گی، جب تک آپ کی گاڑیاں گزر نہیں جاتیں۔ ہم لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ایک جیپ آئی جس میں سُرخ جھنڈا لگا ہوا تھا، وہ ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔ ہر موڑ پر جب ہماری گاڑی پاس کھڑی ہوئی گاڑیوں کے پاس سے گزرتی تو ان میں بیٹھے ہوئے لوگ ہم لوگوں کو حیرت سے دیکھتے۔ اسلام آباد میں داخل ہونے سے پہلے وہ پائلٹ کار واپس ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد حسن حیرت زدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کیا جنرل کو اتنا اختیار ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب مارشل لا لگا ہوا ہے۔ جنرل کے علاوہ کس کا اختیار چل سکتا ہے۔ دوسرے دن اسلام آباد یونیورسٹی میں جلسہ ہوا۔ رشید امجد کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اتنا لمبا چوڑا افسانہ نگار پہلی بار دیکھا۔ میرے پاس رشید امجد آئے اور پوچھا آپ قاضی عبدالستار ہیں۔ میں نے کہا ہاں آپ کس کو سمجھ رہے تھے۔ چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوئیں، پھر ہم لوگ چلے آئے۔ دو دن پڑے رہے کہ پریسیڈنٹ کا کارڈ نہیں آرہا تھا۔ کسی کا بایوڈاٹا پورا نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ سارا وقت سائٹ سین میں گزارتے تھے۔ ایک دن صبح

ناشتے پر اطلاع ملی کہ آج رات کو پریسیڈنٹ ہاؤس میں ہمارا ڈنر ہے۔ ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ ایک وردی پوش شخص آیا اور اس نے سب کو دعوت نامے دیے۔ میں نے کن انکھیوں سے اپنا دعوت نامہ دیکھا۔ اس پر نمبر ایک لکھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً جیب میں رکھ لیا کہ پورے ہندوستان میں ایک ہی پروفیسر ہے جو میری پروفیسری کے لیے کوشاں ہے، آج وہ عنایت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے خود ہی فرمایا کہ دو نمبر کا کارڈ میرا ہے۔ ایک نمبر کا کارڈ کنور صاحب کا ہوگا۔ خیر ایمبیسی سے ایک شخص شام کو شراب کی بوتل روز کی طرح لے کر آ گیا۔ میں نے دو پیگ لیے اور تیار ہو گیا۔

راشد: قاضی صاحب کوئی بھی شخص اگر دوسرے ملک میں جائے اور وہاں کے صدر کے ساتھ عشائیے کا اہتمام کیا جائے تو اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ آپ جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں، اس وقت تو پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکمرانی تھی۔ ایک تو ملٹری حکومت اور اس میں بھی جنرل ضیاء الحق کی رعب دار شخصیت کہ انسان دیکھنے کی تاب نہ لا پائے۔ President کی دعوت میں یقیناً آپ کو President of Pakistan سے روبرو ملنے کی سعادت نصیب ہوئی ہوگی۔ اس ضمن میں اپنے مخصوص تاثرات سے نوازیں تاکہ اس وقت کے صدر پاکستان کی کچھ مختلف شبیہ بھی سامنے آ سکے، اور یہ بھی معلوم ہو کہ صدر کی دعوت، عام دعوتوں سے کس طرح مختلف ہوتی ہے۔

قاضی عبدالستار: ٹھیک سات بجے گاڑیاں لگ گئیں۔ ہر مہمان کے لیے ایک گاڑی تھی۔ میں کنور صاحب کی گاڑی پر تھا۔ تین گاڑیاں پولیس کی تھیں۔ ہمارا Correl Code (گاڑیوں کا قافلہ ٹھیک آٹھ بجے پریسیڈنٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ پورٹیکو میں گاڑی روک دی گئی۔ سب سے آگے کی گاڑی کنور صاحب کی تھی۔ پورٹیکو میں گاڑی رُکی۔ کنور صاحب نے فرمایا دیکھیے جنرل صاحب کھڑے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق سیاہ شیروانی، سفید شلوار، سیاہ جوتا، گھڑی کی زنجیریں دونوں جیبوں

میں لگی ہوئی، خاموش کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دو یونیفارم میں آدمی تھے اور دو شیروانی پہنے ہوئے۔ ہم لوگوں نے اُتر کر انھیں سلام کیا، مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ پہلے انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر کنور صاحب سے۔ جو یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہم لوگوں کو ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ جنرل صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم لوگ صوفوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جب جنرل صاحب اندر آ گئے تب ہم لوگ بیٹھے۔ جنرل صاحب میرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے برابر بروہی صاحب (جنرل ضیاء الحق کے گاڈ فادر کہے جاتے تھے) پھر آغا شاہی Foreign Minister جگمگا رہے تھے۔ انتہائی خوب صورت آدمی، سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں دمک رہا تھا۔ پھر چیف آف آرمی اسٹاف تھا شیروانی پہنے ہوئے۔ تین آدمی اور تھے جن کو میں نہیں جانتا۔ بیٹھتے ہی محسوس ہوا کہ کنور صاحب ہال کے کونے میں بیٹھے ہوئے میگزین پڑھ رہے ہیں۔ جنرل صاحب نے پہلا سوال مجھ سے کیا کہ آپ کے گیسٹ ہاؤس میں بلیرڈ روم ہے۔ آپ بلیرڈ کیوں نہیں کھیلتے۔ میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا میں بہت خراب کھیلتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ پھر وہ بروہی صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ ایک طرّے باز خادم حاضر ہوا۔ بہت جھک کر اس نے جنرل صاحب کے سامنے کہا ڈنر تیار ہے۔ جنرل صاحب کھڑے ہوئے اور مجھ سے فرمایا تشریف لائیے۔ ڈائننگ روم میں صدر میں ایک میز تھی اور اس کے دونوں طرف تین تین میزیں تھیں، اور صدر میز کے مقابل ایک اور میز تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن اس میز پر تھے، بہت دور۔ ان کے برابر ہی کنور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا اور میں اپنے مستقبل کا تصور کر کے کانپ رہا تھا۔ میرے داہنی طرف کنور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں طرف آغا شاہی، کنور صاحب داہنی طرف بروہی صاحب اور دو آدمی جو دائیں بائیں تھے، انھیں میں نہیں جانتا تھا۔

ہماری میز پر کل پانچ آدمی تھے۔ خادموں نے ہمارے سامنے پلیٹیں لاکر رکھیں۔ ان میں جو چیز رکھی تھی وہ تھری ان وَن آئس کریم، معلوم ہو رہی تھی۔ مجھ کو گھر میں بتایا گیا تھا کہ جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو جو دوسرے کریں وہی کرو، لیکن بائیں طرف سے ایک خادم نے گردن نکالی اور کہا یہ لیجیے۔ ساتھ ہی جنرل صاحب نے کہا بسم اللہ۔ میں سخت پریشان۔ یا اللہ اتنی سردی میں کیا آئس کریم سے کھانا شروع ہوگا۔ تیسری بار اس خادم نے کہا یہ رومال ہیں ہاتھ صاف کر لیجیے۔ میرے اُٹھاتے ہی سب لوگوں نے رومال اُٹھا لیے اور جنرل صاحب نے پورا منہ پونچھ ڈالا۔ خادم نے مرغ (روسٹڈ مرغ) نکال کر میری میز پر رکھا۔ جنرل صاحب نے پوچھا ان دنوں آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا سر میں آج کل ''خالد بن ولید'' لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں، لیکن پریشانی یہ ہے کہ سعودی عرب کا صحرا اور سعودی عرب کی آبادی کی تصویر ذہن میں نہیں بن پا رہی ہے۔ جنرل صاحب نے فوراً کہا کنور صاحب، قاضی صاحب کو اگر آپ سعودی عرب نہیں بھیج رہے ہیں تو ہم بھجوا دیں۔ یہ اپنے ناول کی Topography کے لیے بے قرار ہیں۔ جنرل صاحب کھانا کھا رہے تھے لیکن کھڑے ہوئے۔ سر قاضی صاحب جس وقت چاہیں گے، عرب بھیج دیے جائیں گے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں، اور بھی وہ کچھ فرماتے رہے، جو یاد نہیں۔ پھر کہا، ہم نے دیوانِ غالب شائع کرایا ہے۔ کھانے کے بعد آپ لوگوں کو اس کی کاپی پیش کی جائے گی۔

کھانے کے بعد ہم لوگ کافی روم میں آئے۔ جنرل صاحب نے وہاں پوچھا کوئی مسئلہ ہے آپ کا۔ میں نے کہا، سر یہاں بہت اچھی اچھی کتابیں چھپتی ہیں، لیکن ہم لوگوں تک نہیں پہنچ پاتیں۔ جنرل صاحب تھوڑا سا مڑے میری طرف اور فرمایا ایک پوسٹ کارڈ پر تمام کتابوں کے نام لکھ کر دہلی میں ہمارے سفیر کو بھیج دیجیے۔ تمام کتابیں علی گڑھ آپ کے دولت خانے پر پہنچ جائیں گی۔ اس کے بعد ہم چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ آغا شاہی سے

باتیں کرنے لگے۔ اس وقت بھی کنور صاحب کافی روم کے کونے میں ہی بیٹھے رہے۔ جنرل صاحب ہم لوگوں کو رخصت کرنے پورٹیکو تک تشریف لائے۔ ہاں ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گیا۔ کافی روم میں سگریٹ پیش ہوئی۔ میں نے منع کردیا۔ پھر سگار پیش ہوئے۔ ہر سگار بالکل سیاہ تھا اور پلاسٹک کے کیس میں بند تھا۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ یہ سگار بہت عمدہ اور قیمتی ہوتا ہے۔ میں نے بہت تکلف سے ایک سگار اُٹھا کر اپنی شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔ جنرل صاحب نے کہا پیجیئے۔ میں نے کہا سر میں گھر پر پیئوں گا۔ مسکرائے، خادم کو بلایا کہ دیوانِ غالب کے ساتھ سگار کا ایک ڈبہ قاضی صاحب کی گاڑی میں رکھ دیا جائے۔ اس ڈبے میں ۲۵ سگار تھے۔ ہر کھانے کے بعد ہم پیتے تھے۔ پھر کبھی وہ سگار میسر نہیں آیا۔ جب گیسٹ ہاؤس پہنچے تو ڈاکٹر محمد حسن کا چہرہ ہاتھ بھر کا لمبا ہو چکا تھا اور آواز سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ہم بے قصور تھے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ ہم پشاور جائیں گے۔ پشاور یونیورسٹی میں ہمارا جو reception ہوا، وہ میرے حافظے میں آج بھی تازہ ہے۔ ایک Garden party تھی۔ چاروں طرف پھولوں کے تختے تھے، چار بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف سفید لباس میں خوب صورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایسا حسین منظر تھا کہ اس پر تقدس کی پرچھائیاں سی لرزتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہاں ہم لوگوں کے استقبال میں ایک خاتون نے جو عابد علی عابد کی بیٹی تھی اور جن کا نام میں بھول گیا ہوں، انھوں نے ایک استقبالیہ پڑھا اور اس میں صرف میرا نام لیا، میرے ناولوں کا ذکر کیا اور اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ میں پشاور آیا ہوں۔ آج سوچتا ہوں کہ اس دہشت گردی کے زمانے میں اسی پشاور یونیورسٹی کی سفید جنت کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

پشاور سے ہم لوگ کوئٹہ آئے ہوائی جہاز سے۔ میں ہوائی جہاز پر نہیں بیٹھتا کہ میں Sink کرنے لگتا ہوں، یعنی بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جب میں لاہور سے اسلام آباد کے لیے سوار ہوا تو میں نے کسی سے کہا تھا کہ میں Sink کرنے لگتا ہوں۔ اس نے ایک گولی مجھے دی کہ اسے منہ میں رکھ لیجیے بلکہ پورا ایک پتہ دس گولیوں کا مجھے دیا اور ہدایت کی کہ ہر دو گھنٹے کے بعد ایک گولی لے لیجیے۔ پشاور میں میرا باقاعدہ چیک اَپ ہوا اور ہدایت کی گئی کہ آپ جہاز پر بیٹھنے میں احتیاط برتیے، اور drinks لے کر بیٹھا کیجیے، اور اس گولی کا بھی استعمال کرتے رہیے۔ آپ کے لیے خطرہ ہے۔ لاہور کے سفر میں دو باتیں کہنا رہ گئیں۔ ایک یہ کہ احمد سجاد سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے صلاح الدین کے کردار پر اعتراض کیا اور انتظار حسین سے بھی ملاقات ہوئی۔ انتظار حسین نے بہت رکھی انداز میں ملاقات کی۔ کہیں سے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں ہونے دیا، حالاں کہ میں ایک انٹرویو میں ان کے خلاف بہت سخت باتیں کہہ چکا تھا۔ پشاور سے ہم لوگ کوئٹہ آئے۔ غیر معمولی سردی تھی۔ کوئٹہ میں ہم نے بادام کے باغ دیکھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ روکھ (ایک درخت جس میں پھل نہیں ہوتے) کے درخت ہیں اور سامنے تین پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ بیچ کی پہاڑی کا نام گورِ رستم تھا اور یہ پہاڑیاں ایران میں تھیں۔ اتنی سردی تھی کہ میں Sight seen کے لیے نہیں نکلا۔ سارا وقت گیسٹ ہاؤس میں رہا اور کنور صاحب کی میزبانی کی داد دیتا رہا۔ ایک شام کو ہم لوگ اسٹیشن آئے اور میری ہی رعایت سے ٹرین سے کراچی پہنچنے کا ارادہ ہوا۔ گیسٹ ہاؤس میں بلایا گیا کہ ساڑھے نو بجے رات کو ایک گاڑی بہت تیز گاڑی کراچی کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ یہ گاڑی ہفتے میں تین دن چلتی ہے اور آج گاڑی کا دن ہے۔ جب ہم لوگ اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج گاڑی کا دن نہیں ہے۔ حکومت کا وہ افسر جو ہمارے ساتھ تھا، اس نے اسٹیشن ماسٹر سے ملاقات کی، اور ایک گھنٹے کے اندر ایک نئی گاڑی کا انتظام کیا گیا جس میں صرف تین ڈبے تھے اور ہم لوگ اس گاڑی سے کراچی آئے۔ گاڑی کے انتظار میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پلیٹ فارم پر

رہنا پڑا۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ ڈاکٹر عبدالحق کسی صاحب سے ایسی دل داری اور خود فراموشی سے گفتگو کر رہے تھے کہ ڈاکٹر محمد حسن کو میں نے پہلی بار مسکراتے ہوئے دیکھا۔

تین بوگیوں کی اسپیشل ٹرین میں چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ خواہش تھی کہ دریائے اٹک کو دیکھوں۔ کسی نے بتایا تھا کہ رات میں ٹرین گزرے گی، لیکن سویا تو آنکھ صبح کھلی۔ تھوڑی دیر میں کراچی آ گیا۔ میں اس ڈبے میں واحد آدمی تھا جس کا کوئی عزیز پاکستان میں نہیں تھا۔ کراچی کے Federal Guest House میں ہم لوگ اس طرح ٹھہرے کہ پہلا کمرا میرا تھا، دوسرا ڈاکٹر محمد حسن کا۔ میں اس ترتیب پر ہی لرز رہا تھا۔ خیر پہلا بڑا فنکشن پریس کلب کا ہوا جس میں ڈھائی سو آدمی تھے۔ میرا خیال ہے کہ دو سو آدمیوں نے فرداً فرداً مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ سب لوگ ''داراشکوہ'' کے قائل تھے۔ پروفیسر مجنوں گورکھ پوری صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے بھی میری تعریف کی تھی۔ پھر کہا گیا کہ میں تقریر کروں۔ ہاؤس سے آواز آئی کسی موضوع پر تقریر کیجیے۔ خیر میں نے علی گڑھ کی شان میں تقریر کی۔ اس جلسے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں ریڈرشپ بہت ہے۔ اس جلسے کا نشہ رات بھر طاری رہا۔

ارشد: دورۂ پاکستان کی اس روداد میں بہت سی باتیں آپ نے بیان کیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ معلوماتی بھی ہیں۔ دوسری جگہوں پر اعزاز میں جلسے ہوتے ہیں، لوگ ہاتھوں ہاتھوں لیتے ہیں تو کسے خوشی نہیں ہوگی اور کون ہوگا جو اپنی خوش قسمتی پر ناز نہیں کرے گا۔ پاکستان کی اب تک کی روداد بلاشبہ پُرلطف ہے، لیکن کیا اس سفر میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو خلافِ توقع تھی اور اس کی یاد میں آپ کے ذہن سے اب تک محو نہیں ہوئیں؟

ضی عبدالستار: ہاں ایک واقعہ تو ایسا ضرور ہوا۔ دوسرے دن میں کسی کے ساتھ زاہدہ حنا کے شوہر جون ایلیا کے پاس گیا جو مشہور شاعر تو تھے ہی، ایک ڈائجسٹ کے مدیر

بھی تھے۔ شاید عالمی ڈائجسٹ نام تھا اس کا۔ گھر پر وہ نہیں ملے۔ بعد میں وہ گیسٹ ہاؤس تشریف لائے اور مجھے تیس ہزار روپیہ دیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس سلسلے کا ہے۔ جواب ملا ہم نے جو تحریریں آپ کی شائع کی ہیں، ان کا یہ حقیر سا نذرانہ ہے۔ پھر سیارہ ڈائجسٹ کے ایک مدیر سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام بھی یاد نہیں ہے، شاید شکیل عادل زادہ۔ انھوں نے میری تحریروں پر مبالغہ آمیز Captions لگائے تھے۔ انھوں نے مجھے چالیس ہزار روپے دیے۔ ایک روز ہم لوگ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بلائے گئے۔ ابوالخیر کشفی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے کوئی تحفہ بھی دیا تھا۔ کشفی صاحب نے ایک صاحب سے ملاقات کرائی جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ رام پور کے ہیں۔ ان کا نام جمیل خاں تھا۔ جمیل خاں میرے پیچھے لگ گئے اور دو تین دن مس اتنی قربت حاصل کر لی کہ مجھے ان پر پورا اعتماد ہو گیا۔ تب انھوں نے فرمایا کہ اگر میں انڈین کرنسی میں روپیہ تبدیل کرانا چاہتا ہوں تو ان کو دے دوں۔ کراچی سے روانگی کے تین دن پہلے میں نے ان کو ستر ہزار پاکستانی روپیہ دیا۔ وہ دوسرے دن آنے والے تھے، نہیں آئے۔ کسی محفل میں وہ مل گئے۔ میں نے لپک کر ان سے تقاضا کیا۔ انھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، آپ بھول گئے ہیں۔ آپ نے مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ علی گڑھ میں ایک صاحب زادی تھیں، ایم اے میں داخلہ لیا تھا، وہ پاکستان ہجرت کر گئیں۔ بہت خوش گلو تھیں۔ وہاں انھوں نے اتنی عمدہ نعتیں پڑھیں کہ جنرل ضیاء الحق کی صبح ان کی نعت خوانی کی سماعت سے شروع ہوتی تھی۔ تھوڑے دنوں بعد انھیں خاتون سے جمیل خاں کی شادی ہو گئی۔ ان خاتون نے بھی مجھے تحفہ دیا تھا۔ میں نے جمیل خاں کی شکایت کئی لوگوں سے کی، لیکن جمیل خاں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ علی گڑھ آنے کے تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ جمیل خاں کا انتقال ہو گیا۔ پاکستان کے سفر میں یہ بات ایسی ہوئی جسے میں اب تک نہیں بھول پایا۔

راشد: واقعی آپ نے ایسا واقعہ سنایا جسے کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ یہ تو چوری اور سینہ زوری سے بڑھ کر ایک عجیب حیرت انگیز بات ہوگئی۔ آپ نے جس زمانے کی بات کی، اس وقت کے پیش نظر ستر ہزار روپے کی ایک خاص اہمیت تھی لیکن کوئی انسان کتنی ڈھٹائی سے حق کو باطل قرار دے دیتا ہے، یقین نہیں آتا۔ ہم جو بوئیں گے، ایک دن ہم وہی کاٹیں گے۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ جس نے برا کیا اس کا انجام عبرت ناک ہوا۔ میں نے کسی یادگار واقعے کے متعلق دریافت کیا تھا، لیکن آپ نے ایک ایسی بات بتادی کہ ذہن ماؤف ہوگیا۔ بہر حال دورۂ پاکستان میں ابھی کچھ اور باتیں بھی ہوں گی جن کے بغیر یہ روداد مکمل نہیں ہوسکتی۔ میری درخواست ہے کہ گفتگو کی بکھری ہوئی کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کریں۔

قاضی عبدالستار: ایک دن ہم لوگ ساحل پر ٹہل رہے تھے کہ ایک بہت خوب صورت pair نظر آیا۔ سفید قمیص، سفید پتلون پہنے ایک سرخ وسفید شخص نے مجھ کو سلام کیا اور فرمایا میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو اپنے گھر لے جاؤں۔ آپ کی باتیں سنوں اور ٹیپ کروں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ کہ میری اس خواہش کا ہندوستان میں معلوم نہیں کیا مفہوم لیا جائے۔ انھوں نے لمبی گفتگو کی تھی۔ ان کے برابر ان کی بیگم سفید شلوار وقمیض پہنے کھڑی تھیں۔ دونوں بہت خوب صورت تھے۔ پھر ان صاحب نے مجھے ایک کارڈ نکال کر دیا۔ Visiting card اور فرمایا کہ اسے پاکستان میں ہی ضائع کر دیجیے گا۔ پاکستان میں کہیں بھی کوئی بھی تکلیف آپ کو ہو، یہ کارڈ دکھلا دیجیے گا، انشاء اللہ وہ تکلیف رفع ہو جائے گی۔ کراچی میں ہم لوگ شاید ایک ہفتہ رہے۔ وقت، وقت کی رفتار سے زیادہ تیزی سے گزرا۔ ہم لوگوں کو لاہور سے ہندوستان آنا تھا ٹرین سے۔ ہم لوگ لاہور آ گئے۔ دوسرے دن محمد طفیل نے الوداعی گارڈن پارٹی دی۔ جب میری ملاقات ہوئی لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کے جھرمٹ میں، میں نے محمد طفیل کو

وہ چیک جو انھوں نے مجھے دیا تھا، دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پر رکھ کر واپس کیا اور کہا کہ خدا گواہ ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی ورنہ میں دس بیس ہزار رکھ لیتا۔ محمد طفیل تو چپ رہے لیکن جو لوگ کھڑے تھے، انھوں نے تحیر کا اظہار کیا اور میری تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ محمد طفیل نے چیک نہیں اُٹھایا۔ میں نے اسی طرح ان کی جیب میں رکھا جس طرح انھوں نے میری جیب میں رکھا تھا۔ ادیبوں کے جھرمٹ سے آواز آئی۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا۔ دوسرے دن یہ خبر شائع بھی ہوگئی۔ ایک شام میں لاہور کے کافی ہاؤس میں لاہور کے لیے ادیبوں اور شاعروں کے پاس بیٹھا تھا۔ مارشل لا کے زمانے میں کافی ہاؤس دس بجے بند ہو جاتا تھا، لیکن میری میزبانی میں شاید گیارہ بجے تک کھلا رہا۔ جب ہم لوگ باہر نکلے تو ٹیکسی اسٹینڈ تک خالی تھا۔ کئی دوستوں نے فرمایا کہ ہم لوگ آپ کو فیڈرل گیسٹ ہاؤس پہنچا دیں۔ میں نے انکار کر دیا کہ میری جیب میں الہ دین کا چراغ موجود تھا۔ سامنے کوتوالی تھی۔ میں چلتا ہوا گیا۔ سنتری سے میں نے کہا کہ میں کوتوال سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ کہے، اس سے پہلے میں نے بتایا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوا مہمان ہوں۔ اس نے بہت بے نیازی سے جواب دیا کہ صاحب گھر جا چکے ہیں۔ میں نے وہ کارڈ اس کو دکھلایا۔ ایسا لگا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پہلے تو اس نے مجھے سیلوٹ کیا، پھر فرمایا بندہ حاضر ہوتا ہے۔ چند منٹ کے اندر کوتوال صاحب آ گئے۔ میں نے ان کی خدمت میں بھی کارڈ پیش کیا۔ انھوں نے مجھے سیلوٹ کیا۔ میں نے وہ کارڈ ان سے لے لیا۔ آناً فاناً دو جیپیں آئیں۔ ایک پر تنہا مجھ کو بٹھایا گیا۔ کوتوال صاحب کے ساتھ دوسری پر ان کے سپاہی تشریف فرما ہوئے اور ہم لوگ فیڈرل گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ انھوں نے فیڈرل گیسٹ ہاؤس میں بڑی دھما چوکڑی مچائی کہ کھانا گرم کیا جائے اور فوراً پیش کیا جائے۔ جب میز پر کھانا لگا تب تقریباً بارہ بج رہے تھے تو انھوں نے ایک کاغذ اور ایک قلم پیش

کیا کہ اس پر یہ لکھ دیجیے کہ آج کی تاریخ، اتنے بجے لاہور کے شہر کوتوال، شاید نواز محمد خاں نام تھا ان کا، نے میری خدمت کی اور دستخط کر دیجیے۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔ جب یہ واقعہ محمد طفیل نے سنا تو بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور فرمایا قاضی صاحب لاہور کا کوتوال ڈی ایس پی کی رینک (rank) کا ہوتا ہے، اس کی ترقی فوراً ہوگی۔ دوسرے لوگ بھی ہنستے رہے۔

اب جانے کا دن آ گیا۔ مجھ کو یقین تھا کہ قمر آئے گی، اس لیے میں جلد از جلد اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا۔ قمر نے مجھے فون نمبر دیا تھا، لیکن میں نے اس کی گھریلو زندگی کو پُرسکون رکھنے کے لیے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ گاڑی کو چار بجے جانا تھا۔ میں نے اسی کارڈ کو الہ دین کے چراغ کی طرح استعمال کیا اور لاہور اسٹیشن پہنچ گیا۔ انکوائری کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھا میں کافی پی رہا تھا کہ قمر اپنے شوہر کے ساتھ آ گئی۔ میں قمر سے کم، قمر کے شوہر سے زیادہ گفتگو کرتا رہا اور بے نیازی کی ایسی خوب صورت acting کی کہ مجھے اپنی اس صلاحیت پر رشک آیا۔ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ عنوان چشتی آ گئے۔ بہت گڑگڑا کر مجھے الگ لے گئے اور اپنے ٹین کے چار ٹرنک دکھلائے کہ ان میں ان کی بیٹیوں یا میری بھتیجیوں کے جہیز کا سامان ہے اور مجھے اسے پار کرانا ہے۔ تین بجے کے قریب وہی pair جو کراچی میں ملا تھا، سمندر کے کنارے نظر آ گیا۔ میں نے لیک کران کو سلام کیا اور پوری روداد سنائی۔ وہ مسکراتے رہے اور فرمایا کہ دس منٹ کے اندر مجھے اطلاع مل گئی تھی۔ تب میں نے کہا کہ اب تو میں جا رہا ہوں۔ میں آپ سے آپ کا نام نہیں پوچھوں گا کہ وہ کارڈ پر موجود ہے، لیکن آپ کا rank کیا ہے۔ مسکرائے۔ بیگم نے فرمایا یہ پاکستان انٹیلیجنس کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ یہ President of Pakistan سے کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔ مجھے کچھ اسی قسم کے رینک کا احساس تھا، لیکن اب یقین ہو گیا۔ میں نے عنوان چشتی کو ملایا اور ان کا مسئلہ پیش کیا۔ اس نے خالص پولیس والوں کے انداز میں

بہت ٹھنڈے اور بے نیازی کے لہجے میں فرمایا کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری بھتیجیوں کے جہیز کا سامان ہندوستان پہنچ جائے۔ وہ مسکرائے اور فرمایا کہ سمجھیے پہنچ گیا۔ کچھ لوگ ان سے ملنے آگئے اور میں پھر قمر کے پاس آگیا۔ تھوڑی دیر میں محمد طفیل چار چھ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ تشریف لائے۔ سب سے آخر میں پھر قمر کے پاس آگیا۔ اپنے ڈبے میں بیٹھ گیا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی چلنے کے باوجود میں ابھی اسٹیشن پر پڑا ہوا ہوں۔ پاکستانی یا ہندوستانی دونوں چوکیوں پر عنوان چشتی کے بکس پر بغیر کسی تامل کے چاک سے کراس کا نشان بنا تھا۔ دہلی اسٹیشن پر شکریے کا ایک لفظ کہے بغیر عنوان چشتی اپنے چاروں بکسوں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ میں پہلی available گاڑی کے ساتھ علی گڑھ آگیا۔ اتنی تھکن تھی کہ میں دوسرے دن بھی سوتا رہا۔ شام کو چائے پی رہا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کوئی افسر آئے ہیں۔ ایک صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ دہلی Prime Minister سے ملنے کب جا سکتے ہیں؟ میں نے کہا جب ان کا حکم ہو۔ تو کل کسی گاڑی سے تشریف لے جائیے۔

راشد: قاضی صاحب یہ اچانک ہندوستان کے وزیراعظم کا بلاوا کیوں آگیا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے دونوں ملکوں کے سنگین حالات کے پیش نظر وزیراعظم ہند نے یہ جاننے کی کوشش کی ہو کہ آخر اساتذہ کے وفد نے پاکستان کا دورہ کر کے کیا نتیجہ اخذ کیا، یا سیاسی نزاکتوں کے سلسلے میں دانش وروں کا کیا ردِ عمل ہے۔

قاضی عبدالستار: مجھے نہیں معلوم کہ وزیراعظم ہند نے مجھے کس لیے طلب کیا تھا۔ بہر حال میں نے آسام میل سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسٹیشن پہنچا تو وہ صاحب موجود تھے۔ انھوں نے ٹکٹ لینے کی کوشش کی لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا۔ دہلی اسٹیشن سے میں تھری ویلر پر پہنچا۔ شاید ۱۰ صفدر جنگ ہاؤس پہنچا۔ گیٹ پر میں

دھڑ دھڑاتے ہوئے تھری ویلر سے اُترا۔ اپنا کارڈ دیا۔ اس نے فون کیا۔ علی گڑھ سے تھری ویلر پر ایک صاحب آئے ہیں۔ ان کا نام قاضی عبدالستار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا Appointment ہے۔ ادھر سے معلوم نہیں کیا جواب ملا، لیکن یہ دیکھا کہ ادھر سے ایک صاحب تقریباً دوڑتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ مجھ کو ایک ہال میں بٹھا دیا گیا۔ ابھی میں رومال سے اپنا چہرہ صاف کر رہا تھا کہ ان کے سکریٹری شاید دھون صاحب تشریف لائے کہ چلیے۔ میری یہ تیسری ملاقات تھی وزیراعظم سے۔ میرے سلام پر وہ کھڑی ہوئیں، ہاتھ جوڑے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے آپ تشریف رکھیے۔ جب وہ تشریف فرما ہوگئیں تب میں ایک کرسی پر ٹک گیا۔ وزیراعظم ہند اندرا گاندھی نے پہلا سوال کیا کہ آپ کو صدر پاکستان نے اتنا اعزاز کیوں دیا؟ میرے ہوش اُڑ گئے، لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور عرض کیا کہ آپ جو اعزاز مجھے عطا فرما چکی ہیں (پدم شری)، جنرل صاحب نے اس کا احترام کیا اور مجھے چیف گیسٹ بنایا۔ تبسم خفی میں نے محسوس کیا۔ فرمایا، کہا جاتا ہے کہ ان کا ٹی وی ہمارے ٹی وی سے بہتر ہے۔ آپ کیا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ کیوں؟ سوال ہوا۔ میں نے عرض کیا اس لیے کہ ہمارے یہاں ٹی وی پروگرامس کا ڈائرکٹر جنرل آفیسر ہوتا ہے اور پاکستان میں کوئی رائٹر ہوتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھے رات کو کسی افسر کا message ملے کہ صبح آپ دہلی آیئے تو اس کا امکان ہے کہ میں ٹال جاؤں، بیماری کا بہانہ کر دوں، لیکن اگر کوئی رائٹر ہے، Poet ہے، Critic ہے تو میں پہلی فرصت میں دہلی آنے کی کوشش کروں گا۔ اتنی دیر میں چائے بن گئی۔ اپنے ہاتھ سے پیالہ پیش کیا۔ وہاں جو ہمارا میگزین نکلتا ہے، وہ آپ نے دیکھا ہے۔ جی میں نے دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھا نہیں ہے۔ اگر آپ اس کے ایڈیٹر ہو جائیں تو۔ میں نے عرض کیا کہ وہ جیسا نکل رہا ہے اس سے بھی

بدتر ہو جائے گا، اس لیے کہ پاکستان مجھے قبول نہیں کرے گا۔ ٹی وی ڈائرکٹر
کے لیے کچھ نام دیجیے۔ میں نے پہلا نام کملیشور کا لیا، دوسرا بھیروں پرشاد گپت
اور تیسرا راجندر یادو۔ میں نے اردو کے کسی ادیب کا نام نہیں لیا۔ اس لیے کہ
مجھے معلوم تھا کہ وہ منظور نہیں ہوگا۔ کچھ اور بھی پوچھا تھا مسز گاندھی نے جواب
یاد نہیں۔ جیسے ہی کمرے میں ایک aid داخل ہوا، میں نے اجازت مانگی۔ وہ
ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے خم ہو کر سلام کیا اور چلا آیا۔ یہ تو ہوئی
وزیراعظم سے تیسری ملاقات لیکن پہلی اور دوسری ملاقات بھی میں آپ کو
بتا دوں تو آپ خوش ہوں گے۔

راشد: تو دیر کس بات کی ہے قاضی صاحب! بتائیے اور ضرور بتائیے تاکہ بکھری ہوئی
کڑیوں کو جوڑنے میں مدد مل سکے۔ وزیراعظم ہند سے ایسی یادگار ملاقاتوں کا
شرف کتنے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنے مخصوص تیور
کے ساتھ وزیراعظم سے بھی بات کر لی، ورنہ اچھے اچھے لوگوں کی زبان سے
ایک جملہ بھی صحیح طریقے سے ادا نہیں ہو پائے گا۔ پہلی اور دوسری ملاقات کی
تفصیل ضرور بتائیں۔

قاضی عبدالستار: وزیراعظم نے کرشن چندر کے کسی فنکشن میں بمبئی میں فرمایا تھا کہ دوسرے
ملکوں میں جیسے بڑے ادیب پیدا ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں نہیں ہوتے۔
میں نے وہ خبر اخبار میں پڑھی اور فوراً اپنا پیڈ نکال کر ایک خط لکھا کہ امریکہ اور
روس کی حکومتیں اپنے معمولی معمولی ادیبوں کو اتنا روپیہ دے دیتی ہیں کہ وہ عیش
کے ساتھ پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں بلکہ ایشیا میں
ادیب اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آٹھ گھنٹے کی نوکری کرتا ہے۔ اس کے بعد جو
وقت بچتا ہے اس وقت میں وہ تخلیقی کام کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کا وہ معیار نہیں
ہوتا جو روس اور امریکہ کے ادیبوں کی تخلیقات کا ہوتا ہے۔ چند روز گزرے
تھے کہ اس کا جواب آیا۔ جواب اردو میں ٹائپ تھا۔ نیچے قلم سے اندرا گاندھی

لکھا ہوا تھا۔ اس میں حکم تھا کہ آپ مجھ سے ملیے۔ تب میں تھری ویلر پر بیٹھ کر پہلی بار وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ شاید ۱۹۸۲ء کے فساد ہوئے تھے کہ میں اسی طرح بلایا گیا اور اسی طرح میں وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ وزیراعظم ہند نے مسکرا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فساد کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ میں جواب دیتا رہا کہ ایک شخص رجسٹر لے کر میرے پاس آیا اور بہت آہستہ سے کہا کہ اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کا ٹی اے، ڈی اے ہے۔ میں نے جواب دیا ہندوستان کے وزیراعظم سے ملنے آنا ایک عزت ہے جو بیچی نہیں جاتی۔ میں نے وہ رجسٹر ہٹا دیا۔ جب میں رخصت ہوا تو وزیراعظم گیلری تک مجھے چھوڑنے آئیں۔ وہاں ملنے والوں کی ایک بھیڑ اکٹھا تھی۔ جب میں داخل ہو رہا تھا تو میں nobody تھا، لیکن اب سبھی لوگ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

OOO

ادبی مباحث

راشد: قاضی صاحب! آپ کے متعلق نقاد حضرات یہ تو فرماتے ہیں کہ قاضی عبدالستار کے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا گیا دیہات، پریم چند کے دیہات سے الگ ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں کرتے کہ یہ فرق کن بنیادوں پر قائم ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو لوگ اپنی تنقیدوں میں دیہات کا ورد کرتے ہیں، انھیں دیہات کے معنی ہی نہیں معلوم ہوں اور جن چیزوں کو وہ دیہات کے بیان سے تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل دیہات کا بیان ہی نہ ہو۔ یہ عین ممکن ہے کیوں کہ اصولی باتیں کرنا اور ان باتوں کا عملی تجربہ ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ جن لوگوں نے دیہات کی زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا ہو، وہ نہ تو تخلیقی فن پاروں میں دیہات کی حقیقی تصویریں پیش کر سکتے ہیں، نہ ہی ان کی تنقیدی تحریروں میں دیہات سے متعلق پیش کیے گئے نکات حقائق پر مبنی ہوں گے۔ اس ضمن میں آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں تا کہ یہ اندازہ ہو علمی تجربہ رکھنے والا تخلیقی فن کار ان باتوں کو کس زاویے سے دیکھتا ہے۔

قاضی عبدالستار: میں طالب علمی کے زمانے میں جب ترقی پسندوں کے اردو ناول پڑھتا تھا تو خیال آتا تھا کہ یہ لوگ یا جھوٹ بول رہے ہیں، یا انھیں ہمارے دیہات کے

بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ ابھی تک پریم چند اور ان کے ہم عصروں کے دیہات میں زندہ ہیں۔ یہ لوگ ایئرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنے تخیل کے گاؤں کے باشندوں کو زمین داروں اور کسانوں میں تقسیم کر کے سیلولائڈ کے گاؤں بنا رہے ہی جو صریحاً غلط ہے۔ میں نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' کے نام سے لکھا جو ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ جب وہ ناول شائع ہوا تو ''قومی آواز'' کے ادبی ایڈیشن میں ایک ترقی پسند مولوی رضا انصاری فرنگی محل نے تبصرہ کیا کہ یہ reactionary ہے اور میلوڈرامہ ہے۔ ایک بات اور بتاؤں آپ کو۔ میں نے آج تک اپنی کوئی کتاب کسی نقاد، کسی استاد کی خدمت میں نہیں پیش کی۔ نہ صرف یہ بلکہ میں نے اپنی کوئی کتاب کسی میگزین کو تبصرے کے لیے نہیں بھیجی، نہ کسی انعامی کمیٹی کے لیے بھیجی۔ کیا آپ ایسی کوئی دوسری مثال اردو ادب میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں تو بات تبصرے کی چل رہی تھی۔ اس تبصرے کا ردِّعمل مجھ پر بہت شدید ہوا اور میں نے طے کیا کہ میں اور لکھوں گا اور اسی نقطۂ نظر سے لکھوں گا۔ چنانچہ میں نے 'شب گزیدہ'، 'غبارِ شب'، 'مجو بھیا' اور 'بادل' تابڑتوڑ لکھے۔ اگر میرا پہلا ناول یعنی ''شکست کی آواز'' reactionary ہے تو یہ سب reactionary ہے۔ زمین دار جس کی حالت قابلِ رحم ہے، وہ گاؤں کی عدالت، پنچایت کے سامنے جیسے کٹہرے میں کھڑا ہوا ملزم ہے اور اس کے مقدمات کا فیصلہ آج وہ آدمی کر رہا ہے جو اس کے سامنے کبھی بیٹھنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اس torcher کو میں نے افسانوں اور ناولوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ جب میرے ناول ''شب گزیدہ'' کو روسی زبان میں ترجمہ کرنے کی بات آگے بڑھی تاشقند میں تو علی سردار جعفری نے اس کی بہت مخالفت کی۔ یہ واقعہ میرے دوست کملیشور نے بتایا تو میں بھی پنجے جھاڑ کر علی سردار جعفری کے پیچھے پڑ گیا، اور ان سے میں نے انتقام لے لیا۔ جب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند تھے علی گڑھ میں خبر آئی کہ علی سردار جعفری، ترقی اردو بورڈ کے

وائس چیئر مین ہونے جا رہے ہیں۔Prime Minister کے آفس میں ان کا نام recommend ہو کر صدر کے دستخط کے لیے گیا ہے۔ میں نے دوسرے ہی دن صدر جمہوریہ ہند آنریبل فخر الدین علی احمد سے ملاقات کی اور علی سردار جعفری کی مخالفت کی اور ان کے مقابلے میں حیات اللہ انصاری کو پیش کیا اور ان کے کارنامے بیان کیے۔ صدر جمہوریہ ہند نے سردار جعفری کا نام کاٹ دیا، حیات اللہ انصاری کا نام لکھ دیا۔ علی گڑھ میں ہنگامہ ہو گیا۔ مجھ میں ایک خرابی یہ ہے کہ میں کسی بات کو چھپا نہیں پاتا۔ میں نے دہلی سے آتے ہی وحید اختر سے کہہ دیا کہ علی سردار جعفری وائس چیئر مین نہیں ہو سکتے، حیات اللہ انصاری ہوں گے۔ استادِ محترم آل احمد سرور نے مجھے طلب فرمایا اور پوچھا کیا قصہ ہے تو میں نے عرض کیا جب میں reactionary ادیب ہوں تو میں انقلابی لوگوں کے خلاف جو کر پاؤں گا، کروں گا۔ سرور صاحب مسکرا مسکرا کر پوری روداد سنتے رہے اور پوری عمر میں صرف ایک بار فرمایا کہ آپ کی تحریریں progressive ہیں۔ جو شخص ان کو reactionary کہتا ہے، اسے progressive اور reactionary کے معنی نہیں معلوم۔ مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ پہلے ہی ناول سے مجھے شہرت ملی لیکن ''شب گزیدہ'' کی اشاعت سے تو میں پورے ہندوستان میں جانا گیا۔۱۹۶۲ء میں بابا ناگارجن نے میرے قلم کی داد دی تھی اور ترقی پسند کہا تھا۔

شد: آپ کا پہلا ناول ہی کافی ہنگامہ خیز رہا۔ زبان و بیان اور اسلوب کی سطح پر اس میں بھی وہ خوبی موجود تھی جو بعد میں آپ کا اختصاص قرار پائی اور شاید اسی بنا پر مسعود حسن رضوی ادیب نے اسے آپ کی تخلیق ماننے سے انکار کر دیا تھا، لیکن پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی recommendation پر نہ صرف وہ ناول اہتمام سے شائع ہوا بلکہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پہلے ناول پر کچھ تلخ تبصرے بھی ہوئے، لیکن اس پر کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے آپ نے اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ بہت اہم بات ہے،

ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ اوّلین تخلیق اگر مخالفین کی زد میں آجائے اور اعتراضات کا سلسلہ پروان چڑھنے لگے تو مصنف کے تمام تر حوصلے جواب دینے لگتے ہیں اور وہ اپنا تخلیقی سفر ترک کر کے، احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر گوشۂ گم نامی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور آپ نے اپنا ردِعمل، مستقل تحریروں کے ذریعے کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ بات ناولوں کی چل نکلی ہے تو میں چاہوں گا کہ یکے بعد دیگرے تمام ناولوں پر بحیثیت تخلیق کار آپ کا نقطۂ نظر سامنے آئے۔ اس سے یہ نظریہ بھی سامنے آئے گا کہ ایک نقاد کتنی چیزوں سے صَرفِ نظر کرتا ہے، اور تخلیق کار کن پہلوؤں کو اپنی بنیادی ترجیحات میں شامل رکھتا ہے۔

قاضی عبدالستار: ''شب گزیدہ'' میرا دوسرا ناول ہے، یہ خالص معاشرتی ناول ہے۔ پہلے ناول میں پوری بات، پورا دیہات اور دیہات کے وہ بڑے بڑے کردار جو میں نے دیکھے تھے، یا جنھیں میں جانتا تھا، وہ نہیں آسکے تھے۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے کوشش کی ہے کہ وہ تمام باتیں آجائیں جو بحیثیت تخلیق کار مجھے اندر سے بے چین کر رہی تھیں۔ اس ناول میں میں نے زمین دارانہ نظام کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے۔ دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمین دار ہے۔ وہ اپنی زمین داری پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اپنے بیٹے، باپ، بھائی کسی کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔ اگر اس کو کسی کا ہاتھی یا گھوڑا پسند آگیا تو اس کے حصول کے لیے گھروں کو اُجاڑ سکتا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے مذہب کو بھی تبدیل کر سکتا ہے، لیکن اپنے ہاتھ سے زمامِ اقتدار کو نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے قدیم تصورات کے حامل زمین دار اور نئی قدروں کے حامل اس کے اکلوتے بیٹے کے ٹکراؤ کی کہانی پیش کی ہے۔ جو کچھ بھی میں نے ناول میں پیش کیا ہے وہ حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ میرے جوار کے ایک رئیس نے اپنے بیٹے کو اپنی حکومت کے نام پر قتل کر دیا۔ اس ہولناک

واقعے پر میں نے ''شب گزیدہ'' لکھا۔ اس ناول میں پہلی بار کسی تعلوقے دار کے
گھر کی پوری روداد بیان کی گئی ہے۔ داشتاؤں، رکھیلوں کا بیان ہے، بیوی کی مجبوری
اور بیٹے کی معذوری اور ملازموں کی خود اختیاری تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔
نہ صرف یہ بلکہ قصباتی زندگی میں مولوی، پہلوان، ساہوکار، بدمعاش، گروہ بند
اور وفادار کرداروں کو پیش کیا گیا ہے، اور مجھے یاد پڑتا ہے شاید یہ ناول بھی
''نقوش'' نے پہلی سطر سے آخری سطر تک پورا چھاپ دیا۔ اسی ناول کے ترجمے
نے بابا ناگارجن کو مزید تقویت دی جو ''پہلا اور آخری خط'' کے ذریعے پیدا
ہوئی تھی اور انھوں نے مجھے ''تام پتر'' دیا۔ ناول میں میں نے دکھایا ہے کہ
زمین دار کا نوجوان بیٹا، جب زمین دار پر غالب آنے لگتا ہے تو وہ اس کو زہر
دے دیتا ہے۔ پورا ناول اودھ کے زمین داروں کی اقدار، ان کی اچھی بری
پہچان، ان کی گھریلو زندگی کے بکھان پر مبنی ہے۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ
بہت سے ایسے حضرات جنھوں نے میرا سرسری مطالعہ کیا ہے، یا مطالعہ ہی نہیں
کیا ہے، وہ مجھ کو زمین دارانہ نظام کا حامی تصور کرتے ہیں، لیکن اگر وہ مجھے
غور سے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ میرے عہد میں کسی نے بھی زمین داروں
کے مظالم کا مجھ سے سخت بیان نہیں کیا ہے۔ خیر یہ تو میں نے اپنے خیالات کا
اظہار کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے پڑھنے والے پوری طرح اس سے اتفاق نہ
کریں، لیکن میرا یہ بیان ان کے مطالعے کی نشان دہی تو کر ہی سکتا ہے۔

راشد: قاضی صاحب! ایک ہی متن کو پڑھنے کے زاویے مختلف ہوسکتے ہیں۔ کوئی
ضروری نہیں کہ ہم کسی متن کو پڑھ کر جو تاثرات قبول کر رہے ہیں، بالکل وہی
تاثرات دوسروں کے بھی ہوں۔ یہ تو ضرور ہوتا ہے اور ایک اچھے متن کی یہ خوبی
بھی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو مختلف جہتوں پر غور کرنے کے لیے
مجبور کرے۔ ہر قاری کی اپنی ایک ذہنی سطح ہوتی ہے، تربیت کا مختلف پس منظر
کارفرما ہوتا ہے، غور و فکر کی صلاحیتیں جداگانہ ہوتی ہیں اور اسی بنا پر متن سے

متعلق ردِعمل کی سطح مختلف ہوتی ہے۔قارئین کے مقابلے میں تخلیق کار کا زاویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ایک نقاد اور قاری، فن پاروں کے حوالے جن نکات کو اجاگر کرتا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس متن کا خالق، اس متن سے متعلق کیا کچھ سوچتا ہے اور اس کے غور و فکر کی مختلف جہات کیا ہیں، یہ باتیں بھی کسی طرح نظرانداز نہیں کی جاسکتیں۔متن کی تخلیق کے بعد ہر چند کہ مصنف کا اس متن سے رشتہ باقی نہیں رہ جاتا اور نئے تنقیدی تصورات نے اس نوع کے نظریات کو کافی فروغ بھی دیا ہے، لیکن کسی تخلیق کے ساتھ تخلیق کار کا جو رشتہ ہوتا ہے، اس رشتے کی مناسبت سے وہ جن پہلوؤں کا بیان کرے گا، اس کی بنیادی اہمیت کسی طرح نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔آپ کے خیالات سے ممکن ہے نقاد حضرات اختلاف فرمائیں، لیکن آپ کے خیالات سے ان کے مطالعے کی نشان دہی ضرور ہوگی اور اسی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ اپنے تمام ناولوں پر آپ اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار فرمائیں۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے خیالات سے کتنے لوگ اتفاق کریں گے۔ مجھے نقاد حضرات کے خیالات سے نہیں، ایک تخلیق کار کے براہِ راست وضاحت سے زیادہ دلچسپی ہے۔میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے مشہور ناول ''دارا شکوہ'' کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اس ناول کی تفہیم میں مزید معاون ہو سکیں۔

قاضی عبدالستار: ''دارا شکوہ'' کے بارے میں مشہور ہوا کہ پاکستان میں اس کی جلدیں جلائی گئیں اور کراچی پریس کلب میں جلائی گئیں۔ جب میں کراچی گیا اور مجھے کراچی پریس کلب نے مدعو کیا تو مجھے ڈر تھا کہ دیکھیے کیا سلوک ہوتا ہے، لیکن ڈیڑھ دو سو کا مجمع تھا۔میرا خیال ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور تقریر کی فرمائش کی۔تقریباً ہر مورّخ نے اورنگ زیب کی مذہبی حیثیت کی پیش کش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور اس کی عظمت کے بیان میں چار چاند لگا دیے۔میں نے جب پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اورنگ زیب غاصب تھا۔

اس لیے کہ ساموگڑھ کی لڑائی داراشکوہ سے تھی، شاہ جہاں سے نہیں تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ داراشکوہ کوشکست دے کر آگرے آتا اور اپنے باپ کے قدموں پر سر جھکا دیتا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر قلعے پر قبضہ کرلیا، باپ کو نظر بند کر دیا، پانی بند کر دیا تا کہ قلعے کے ملازمین کی اکثریت قلعہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ حکم دیا گیا کہ قلعے سے جو جانا چاہتا ہے، وہ جائے، لیکن کوئی شخص قلعے کے اندر نہیں جا سکتا۔ ایک بہت بھیانک واقعہ ہے جس کی روایت موجود ہے کہ اورنگ زیب نے داراشکوہ کا سر کاٹ کر سونے کے برتن میں بند کر کے آگرے بھیجا اور حکم دیا کہ جب شاہ جہاں دسترخوان پر بیٹھے تو یہ سر پیش کیا جائے۔ چوں کہ اس بیان کی صداقت پر مجھے شبہ ہے، میرے پاس کوئی سند نہیں ہے، اس لیے میں نے اپنے ناول میں اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس واقعے پر مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب (اورنگ زیب) نے یہ حرکت یقیناً کی ہو گی۔

مجھے پوری Mughal dynsty میں اورنگ زیب سے زیادہ جابر اور ظالم، قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیے ہوئے بیان کو فراموش کر دینے والا، اپنے خوردوں سے وعدہ فراموش کرنے والا اور کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ یعنی جب داراشکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ گرفتار ہو کر آیا تو اس نے اورنگ زیب سے یہ گزارش کی تھی کہ مجھے قتل کر دیا جائے، لیکن قید کر کے پوست (افیون کی کلیاں) نہ پلایا جائے۔ پوست اس لیے پلائی جاتی تھی کہ دماغی توازن خراب ہو جاتا تھا اور آہستہ آہستہ آدمی مر جاتا ہے۔ اورنگ زیب نے وعدہ کیا کہ نہیں تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا، لیکن سلیمان شکوہ کو گوالیار کے قلعے میں قید کیا۔ ایک سال تک اسے پوست پلائی گئی۔ جب وہ نہیں مرا تو اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا۔ یہ تھے ہمارے اورنگ زیب عالم گیرؒ برکاتہٗ۔ اس شخص سے زیادہ ظالم اور جابر تو شاید چنگیز اور تیمور بھی نہیں تھے کہ چنگیز اور تیمور کے بارے میں ظلم کی کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی جس میں اس نے باپ، بھائی اور بھتیجے کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔

پوری مغل تہذیب میں داراشکوہ سے زیادہ سیکولر مزاج کا عالم و فاضل کوئی شخص نہیں تھا۔ اس کے یہاں اکبر کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کے ساتھ ساتھ علم وفضل کی جو شان ملتی ہے، وہ مغلوں کے کسی کردار کو میسر نہیں آئی۔ اورنگ زیب کا سارا علم sectarian تھا۔ وسعتِ قلب اور سیر چشمی کے الفاظ سے وہ شخص ناواقف تھا۔ داراشکوہ کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی پوری زندگی میں کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کنیزیں اس کی خلوت کا زیور بنی ہوں۔ قندھار کے محاصرے میں اس نے جس وسیع النظری کا ثبوت دیا، وہ اپنی مثال آپ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام مغل شہنشاہوں کی طرح اور بڑے کرداروں کی طرح داراشکوہ پر نجومیوں وغیرہ کا بھی اثر تھا۔ مثلاً وہ شگن لیتا تھا۔ شگن مولوی صاحب (اورنگ زیب) بھی لیتے تھے۔ ثبوت بھی موجود ہے۔ مہاراجہ جودھ پور جو کہ داراشکوہ کے حکم پر اورنگ زیب کا راستہ روکنے چلا تھا، اجین کے قریب دونوں کے لشکر کھڑے ہوئے۔ اورنگ زیب کی سیاست یہ تھی کہ مہاراجہ کو پوری طرح تباہ کر دیا جائے، لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ لڑائی کا سارا الزام راجہ پر آئے۔ مہاراجہ نے صلح کی جو شرائط پیش کیں، ان پر گفتگو کے لیے اورنگ زیب نے ایک سہ ہزاری منصب دار بھیجا۔ مہاراجہ اکڑ گیا کہ میں ہفت ہزاری میں سہ ہزاری منصب دار سے کیا بات کروں اور لڑنے پر تیار ہو گیا۔ اورنگ زیب تو لڑنے کو تیار تھا ہی۔ ایک روز اس کا کوئی جنگی ہاتھی بگڑ گیا۔ اورنگ زیب اپنے کیمپ سے باہر نکلا اور اس نے اپنے ہاتھی کو ڈانٹا۔ ہاتھی ڈانٹ سنتے ہی بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب نے فوراً حملے کا حکم دیا کہ اس وقت میرا ستارہ عروج پر ہے، فوراً حملہ کرو اور حملہ ہوا اور مہاراج کو شکست ہوئی۔ اس فتح نے داراشکوہ پر نفسیاتی دباؤ ڈالا اور پہلی بار داراشکوہ کو اورنگ زیب سے خوف محسوس ہونے لگا۔

داراشکوہ کو اس کے مشیروں اور مولویوں نے سمجھا رکھا تھا کہ جناتوں کا لشکر آئے گا اور قندھار کو فتح کر لے گا۔ بھولا بھالا شہزادہ، ہم جلیسوں کے اس بیان سے مطمئن تھا اور یقین کیے بیٹھا تھا کہ جناتوں کا لشکر قندھار کو فتح کر کے اس کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ کردار کی اس کمزوری نے داراشکوہ کو ایک بڑی ناکامی سے ہم کنار کیا۔ میدانِ جنگ میں بھی داراشکوہ کا جو انداز شامل تھا، وہ عالموں کا تھا، سپاہیوں کا نہیں تھا۔ مثلاً جب وہ ساموگڑھ کے میدان میں عالم پسند نامی ہاتھی پر سوار ہونے کے لیے بڑھا تو کہا غریب معاف، مغرور مرگ اس قول کے مقابلے میں اورنگ زیب کا قول ملاحظہ کیجیے، جو ہاتھی پر سوار ہوتے ہوئے نعرہ لگاتا ہے: ''آج اپنا سر نہیں، یا دشمن نہیں۔'' اس نعرے میں جو ہیبت ہے وہ داراشکوہ کے قول میں کہاں ہے۔ شکست کے بعد داراشکوہ فرار تھا۔ اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو کہیں قلعے میں رکھ دے، لیکن بیوی نے یہ منظور نہیں کیا۔ داراشکوہ کو اس فرار میں بیوی کی وجہ سے بہت سی زحمتیں اُٹھانی پڑیں، لیکن اس نے اس کو چھوڑنا منظور نہیں کیا۔ ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ اگر وہ اپنی بیگم کو کہیں چھوڑ دیتا تو ایران پہنچنے میں اس کو آسانی ہوتی، لیکن داراشکوہ کی محبت نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

راشد: قاضی صاحب! صرف اسی بنا پر میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ بحیثیت تخلیق کار آپ اپنے خیالات اور تاثرات سے آگاہ فرمائیں۔ کیوں کہ تخلیق کار کے محسوسات، نقاد کے نظریات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں اور جو باتیں سامنے آتی ہیں، وہ تنقیدی محاسبے میں کسی طرح نہیں آپاتیں۔ داراشکوہ کے حوالے سے ابھی آپ نے جتنی باتیں بھی بیان کیں، وہ مغل تہذیب کے اس قدرے مختلف شہزادے کی تفہیم میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس انداز سے ناول ''داراشکوہ'' میں نہیں آئی ہیں، لیکن آپ کے بیان سے جن نکات کی وضاحت ہوئی ہے، انھیں پیشِ نگاہ رکھیں تو ہمیں داراشکوہ کے کردار کو زیادہ بہتر

طریقے سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تخلیق کار کے خیالات سے متن کے مرکزی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے پس منظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کس تناظر میں تخلیق کار نے مخصوص متن کو خلق کیا ہے۔ ''داراشکوہ'' کی طرح آپ کے ناول صلاح الدین ایوبی نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ ہندوستانی تاریخ سے متعلق فکشن کا ایک بے مثل نمونہ پیش کرنے کے بعد آپ اسلامی تاریخ کی جانب کیسے راغب ہو گئے، کیوں کہ صلاح الدین ایوبی کے بعد آپ نے خالد بن ولید کی تخلیق بھی کی جو اسلامی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے۔ پہلے آپ صلاح الدین ایوبی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

قاضی عبدالستار: جب میری والدہ نے میرا ''بادل'' ناولٹ پڑھا تو انھوں نے برجستہ فرمایا کہ جب تم ہاتھی پر لکھ سکتے ہو تو تمھیں صلاح الدین ایوبی پر ضرور لکھنا چاہیے۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ لکھوں گا اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ شعبے میں میری تدریس کی بھی شہرت تھی۔ اس شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے پڑھنا پڑتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے شاگرد پورے وقت دم بخود بیٹھے رہیں۔ اس لیے مواد کی خاطر پڑھنے کو بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی صلاح الدین ایوبی کے بارے میں جو کچھ بھی میسر آیا وہ سب میں نے پڑھ ڈالا۔ اس کردار نے مجھے اس لیے متاثر کیا کہ یہ پہلا فاتح ہے جس نے مفتوحہ شہروں کو مکمل امان دی اور ایک ایک فرد کی حفاظت کی۔ حالاں کہ اس زمانے کا رواج تھا کہ عیسائی فاتح جس شہر کو فتح کرتے، اسے خاک و خون میں نہلا دیتے۔ ایک بات جو سلطان کی مجھے بہت پسند آئی کہ اس نے مفتوح رعایا پر کبھی ظلم نہیں کیا۔ اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ ایک ملک کی عیسائی رعایا پر دوسرے ملک کے عیسائی حاکم نے جو مظالم کیے تھے، اس کو سزا دینے کے لیے پوری ایک لڑائی لڑی گئی۔ یہ خیال اس لیے بھی آتا تھا کہ سلطان کی رعایا میں تو عیسائی اور یہودی تھے، مگر ان کی قتل و غارت گری کا کوئی واقعہ پڑھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے

فسادات نے بھی سلطان کی اس خوبی کو بہت زیادہ روشنی دی اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ پروفیسر آل احمد سرور جو "ہماری زبان" کے ایڈیٹر بھی تھے، فرمایا کہ جب ''صلاح الدین ایوبی'' مکمل ہو جائے تو مجھ کو دینا کہ میں ہماری زبان کے تخلیقی نمبر میں پورا ناول شائع کر دوں گا۔ میں نے مکمل کرنے کے بعد ناول ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے پڑھا اور معذرت کر لی۔ اسی زمانے میں سلیمان اریب آئے ہوئے تھے۔ ان کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ یہ ناول میں ان کو دے دوں۔ وہ رسالہ ''صبا'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ''صبا'' کے پورے ایک شمارے میں وہ ناول شائع کر دیا جائے گا۔ اس کی اشاعت میں اقبال متین کا دخل تھا۔ جب یہ شائع ہوا تو اس کے تعارف میں یہ لکھا گیا کہ یہ دلچسپ ناول ہے۔ تھوڑے دنوں بعد غلام ربانی تاباں صاحب علی گڑھ تشریف لائے، اور مجھے حکم دیا کہ میں وہ شمارہ ان کی خدمت میں پیش کروں اور اشاعت کے پہلے اجازت نامہ لکھ دوں۔ تاباں صاحب نے وہ ناول مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع کیا جس کے وہ کنوینر تھے، اور مجھے بارہ سو روپے دیے۔ یہ دلچسپ ناول حیدرآباد کے ایک سیاسی جماعت کے سربراہ کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے مجھے سرکار دو عالم کا جو دن منایا جاتا تھا حیدرآباد میں، اس کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ وہ خط میں نے اپنی والدہ کو دے دیا۔ انھوں نے پڑھتے ہی حکم دیا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ جو اتنے بڑے منصب پر فائز کیے جاؤ۔ فوراً معذرت نامہ لکھو اور میں نے معذرت نامہ لکھ دیا۔ اس ناول پر مجھے پہلا ''غالب ایوارڈ'' ۱۹۷۳ء میں ملا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔

میں نے صلاح الدین ایوبی کے بارے میں جتنے ناول پڑھے، ان میں ایلی نور ملکۂ فرانس کے عشق کا بیان ملا۔ یعنی ملکہ سلطان پر عاشق تھی اور شراب کا بھی ذکر ملا۔ میں نے ملکہ کے تعلقِ خاطر کا ذکر کیا ہے، جسمانی قربت کا بھی

ذکر کیا ہے اور ملکہ کی بادہ نوشی کا بھی ذکر کیا ہے۔ خفیف سا ذکر ہے۔ آخری زمانے میں سلطان سے ایک جنزل ''الہکاری'' نے جوان سے بے تکلف تھا، سوال کیا کہ آپ نے کبھی شراب پی۔ سلطان خاموش رہے، سلطان نے انکار نہیں کیا۔ انکار نہ کرنا ایک خوب صورت اقرار ہے۔ یہ ہمت کسی میں نہیں تھی کہ وہ ایلی نور کے بارے میں سوال کرتا، اس لیے اس کا ذکر نہیں آیا۔ جب ملکل عادل جو نائب سلطنت تھے، انھوں نے جب یورپ پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی تو صرف اس وقت سلطان کی اجازت کا مسئلہ درپیش تھا۔ سلطان کے آخری زمانے میں جب وہ بیمار تھے تو ملکہ ایلی نور نے اپنے بیٹے رچرڈ کی رہائی کے لیے جس کو اس کے چھوٹے بھائی ''جان'' نے گرفتار کر لیا تھا، سلطان کے پاس سفیر بھیجا تھا اور سلطان ایک عجیب وغریب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بالآخر اس نے یورپ نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسی کش مکش کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی اس کا کلائمکس ہے۔ سلطان کا قول تھا کہ ہم نے ہمیشہ دین کی حفاظت کے لیے تلوار نکالی ہے۔ شوقِ جہاں بانی کو یہ شرف عطا نہیں کیا گیا اور یورپ پر حملہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک اشتہار دیا تھا کہ دنیا میں کوئی شخص اگر سلطان کی تلوار دے سکے، یا اس کا پتہ بتا سکے تو ہم اسے دس لاکھ ڈالر دیں گے۔ میں نے یہ ذکر جب پڑھا تو میں سوچتا رہا کہ میں سلطان کی تلوار کا کیا کروں اور میرا یہ دعویٰ بھی تھا کہ میرا ناول تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ تلوار کو دفن کر دینا چاہیے اور میں نے تلوار کو دفن کر دیا۔

راشد: اس سے بہتر صورت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی آپ نے تخلیقی ذہانت کا عمدہ ثبوت پیش کیا۔ اسی رویے کی بنا پر تاریخی ناول کا دعویٰ بھی برقرار رہا اور ناول میں در آئے ایک اہم مسئلے سے نجات بھی مل گئی۔ تاریخی حقائق کی پیش کش اور اس کی اہمیت سے کسی بھی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، لیکن تخلیقی فن کار

اگر اپنے فن پاروں میں تخلیقی ذہانتوں کے نمونے پیش کرتا ہے تو مختلف سطحوں پر اسے سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔ ''صلاح الدین ایوبی'' کی اشاعت کا معاملہ بھی نشیب و فراز سے دوچار رہا، لیکن جب وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تو اسے غالب ایوارڈ کے لیے منتخب کرلیا گیا، اور وہ بھی پہلا ''غالب ایوارڈ'' آپ کے حصے میں آیا۔ ظاہر ہے اس اعزاز سے آپ کو زبردست تحریک ملی ہوگی اور ایک بار پھر آپ نے اسلامی تاریخ کے ایک اہم کردار خالد بن ولید کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ خالد بن ولید کی تاریخی شخصیت ہر لحاظ سے متاثر کن رہی ہے۔ اس کردار کے کن پہلوؤں نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ ناول لکھنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

قاضی عبدالستار: اماں نے جب میرا ناول صلاح الدین ایوبی پڑھا تو اپنی خوشی کا اظہار تو مجھ سے نہیں کیا، لیکن بہت خوش ہوئیں، اور مجھ سے فرمایا کہ اب تم خالد بن ولید پر لکھو۔ میں نے پڑھنا شروع کیا، لیکن صحرا میری گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ خواہش تھی کہ میں عرب کا صحرا دیکھ سکتا اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا سفیر ہندوستان سے کہ ہم قاضی صاحب کو عرب بھیج سکتے ہیں، لیکن ہمارے سفیر نے فرمایا کہ وہ خود ہم کو عرب بھیج دیں گے، لیکن وہ بات آئی گئی ہوگئی۔ تاہم ایک بار میں راجستھان گیا اور جیسلمیر سے تیس چالیس کیلومیٹر کا سفر صحرا میں کیا اور کچھ اندازہ ہوگیا۔ جب تاریخ پڑھ رہا تھا تو یہ احساس ہوا کہ حضرت عمر نے خالد بن ولید کو معزول کر کے جلال کا اظہار کیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے خیال ہوتا تھا کہ حضرت عمر فاروق اعظم، امیرالمومنین کے ساتھ ساتھ آمرالمومنین بھی تھے مگر ان کی عظمت کا لحاظ کر کے میں نے یہ بات واشگاف الفاظ میں نہیں لکھی۔ سیف اللہ کے کردار کی اسلامی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ سیف اللہ نے سولہ لڑائیاں لڑیں اور ہر جنگ میں فتح پائی۔ تاریخ عالم کا ایسا کوئی دوسرا جنرل پیدا نہیں ہوا۔ اتنا بڑا جنرل، اتنا بڑا سپاہی محض ملت کے نظم ونسق

کے لیے اپنی توہین گوارہ کر لے، اس کی بھی نظیر نہیں ہے۔ جتنی کتابیں میں نے پڑھیں ان کے بین السطور میں یہ بات موجود تھی کہ اگر سیف اللہ نے حضرت عمر کے خلاف تلوار کھینچ لی ہوتی تو عرب میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی لیکن یہ سب سیف اللہ کے کردار کی عظمت تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ فرماں روائے ایران اور قیصر روم دونوں اس انتظار میں مبتلا تھے کہ سیف اللہ کی بغاوت کی خبر آئے اور وہ جشن منائیں لیکن ان کو یہاں بھی ناکامی ہوئی۔ حضرت علیؓ کا جو بیان ہے وہ لفظ لفظ تاریخ میں موجود ہے اور انھیں کے بیان نے شاید حضرت عمر کو خالد کے خلاف کسی اقدام سے باز رکھا اور معزولی پر اکتفا کی۔

قبیلہ بنو تمیم کی ایک دوشیزہ کو حضرت خالد نے عکاظ کے میلے میں دیکھا اور شاید متاثر ہو گئے، لیکن اس کی شادی مالک بن نویرا سے ہو گئی۔ سرکارِ دو عالم کے وصال کے بعد ارتداد کی جو آندھی چلی اس کو ختم کرنے کے لیے نائب رسول اللہ نے حضرت خالد کو نامزد کیا۔ حضرت خالد فتوحات کا پرچم لہراتے ہوئے مالک بن نویرا کے قبیلے تک پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ مالک بن نویرا بھی مرتد ہو گیا ہے۔ سیف اللہ نے حملہ کیا اور مالک بن نویرا گرفتار ہو گیا۔ حضرت خالد نے اسے قید کر دیا۔ اس خیال سے کہ اس کو صبح دربار خلافت کے لیے روانہ کر دیا جائے گا، لیکن ان کے کچھ جوشیلے نائبین نے مثلاً حضرت ضرّار نے زبان کی ذرا سی تفہیم کی لغزش کی بنا پر مالک بن نویرا کو قتل کر دیا۔ ان کی بیوہ کا جب سامنا ہوا تو سیف اللہ نے کہا کہ تم میرے آباد گھر کو مزید آباد کر سکتی ہو۔ وہ تیار ہو گئیں۔ سیف اللہ نے عدت کے پورے دن گزار کر ان سے نکاح کر لیا۔ مالک بن نویرا کا ایک بھائی بہت اچھا شاعر تھا۔ اس نے مالک بن نویرا کی موت پر ایسا زبردست مرثیہ لکھا کہ حضرت عمر اس کو سن کر بے قرار ہو گئے اور حضرت ابوبکر سے اصرار کیا کہ خالد کو معزول کر دیا جائے۔ خلیفہ اکبر نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ خدا نے نبی کی اُمت کی حفاظت کے لیے جو

تلوار علم کی ہے، اسے نیام کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ تاہم سیف اللہ کو دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم بھیج دیا۔ سیف اللہ نے اپنی جو صفائی پیش کی وہ نائب رسول اللہ نے قبول فرمائی لیکن شاید حضرت عمرؓ نے منظور نہیں کی اور جب وہ نائب رسول اللہ ہوئے تو جو پہلا حکم نامہ لکھا وہ خالد کی معزولی کا لکھا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعید الظفر چغتائی نے خالد بن ولید پر جو مضمون لکھا، اس میں ان سے سہو ہوا اور انھوں نے ہندہ کو سیف اللہ کے تعلق خاطر کا مرکز بنا دیا۔ اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے اتنی احتیاط سے ان چیزوں کا بیان کیا ہے کہ اگر آدمی بہت غور سے نہ پڑھے تو سہو ہونے کا امکان ہے۔ ابوسفیان نے خاص کوشش کی کہ سیف اللہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں اور بنوامیہ بھی ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے خلاف تلوار چلائے، لیکن سیف اللہ کی استقامت کے آگے کوئی کامیاب نہیں ہوسکا۔

سید والا تبار کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں خالد بن ولید پر ناول لکھ رہا ہوں تو انھوں نے طلب فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہر چند ''تہذیب الاخلاق'' میں اس کی بالاقساط اشاعت سے آپ کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن میری خواہش ہے کہ آپ پورا ناول اس میں شائع ہونے دیں۔ چنانچہ اس کی قسطیں ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے لگیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بند بند الفاظ میں فرمایا کہ ہر حال کے ایک کمرے میں کچھ لوگ ہر قسط پڑھتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے کہ اس میں کوئی تاریخی غلطی نکل آئے۔ میں نے عرض کیا کہ جناب والا مجھے اس کا احساس ہے، لیکن آپ اطمینان رکھیں کیوں کہ کوشش کے باوجود لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ دہلی میں جامعہ ہمدرد میں کوئی کانفرنس تھی۔ میں شرکت کے لیے گیا۔ سید والا تبار ہال کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ جب میں نے انھیں سلام کیا تو جواب میں ذرا سا ٹھٹھک کر فرمایا۔ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ دو مرتبہ یہی جملہ فرمایا۔

راشد: آپ نے ثابت کر دیا کہ نہ صرف تاریخ سے آپ کو غیر معمولی دلچسپی ہے بلکہ اسلامی تاریخ کے رموز و نکات سے بھی آپ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ مذہب کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ کوئی بھی بات کہنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لینا ضروری ہوتا ہے، اور بعض معاملات میں تو تحقیق شدہ باتوں کو بھی نزاکت کے پیش نظر بیان کرنے میں خاصی دقت پیش آتی ہے۔ آپ ان تمام مرحلوں سے گزرے اور کامیابی کے ساتھ گزرے۔ آپ نے اس بات سے بھی واقف کرایا کہ اسلامی تاریخ کے دو عظیم کرداروں سے متعلق دونوں ناول آپ نے والدہ محترمہ کی تحریک پر خلق کیے۔ آپ کو ادبی ماحول وراثت میں نہیں ملا، نہ ہی گھر میں ادب کا کوئی ماحول تھا، لیکن والدہ محترمہ سے آپ کو خاصی عقیدت تھی اور ان کی شخصیت کا رعب شروع سے ہی آپ کے وجود پر غالب رہا۔ اگر گھر میں ادبی ماحول پہلے سے موجود نہ ہو لیکن گھر کا کوئی اہم فرد، فن کار کے تخلیقی مرحلوں میں دلچسپی لے، اس کی تخلیقات کو دلچسپی سے پڑھے اور بعض موقعوں پر اہم مشورے بھی دے تو غضب کی تحریک ملتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے آپ کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور آپ نے صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولید کی شکل میں دو اہم ناول تخلیق کیے۔ ناول اور تاریخی ناول کے ذیل میں بہت سی باتیں ذہن میں آ رہی ہیں، لیکن سرِ دست میں آپ کے ناولوں سے متعلق گفتگو کو مکمل کرنا چاہتا ہوں تا کہ ایک تسلسل قائم رہے۔ دوسری تمام باتیں لازمی طور پر اس کے بعد گفتگو کا حصہ بنیں گی۔ آپ نے ادبی تاریخ کے ایک اہم کردار غالب کو بھی ناول کے لیے منتخب کیا اور ایک کامیاب ناول لکھا۔ اپنے ناول ''غالب'' کے حوالے سے کچھ ایسی باتوں کا بیان کیجیے جو نہ صرف پس منظر کو سمجھنے میں معاون ہو، بلکہ ناول کی تفہیم کا بنیادی سرا بھی ہاتھ آ سکے۔

قاضی عبدالستار: ''غالب'' ناول تو میں نے فرمائش پر لکھی۔ ہوا یہ کہ جب فخر الدین علی احمد صاحب نے جو غالب انعام کمیٹی کے وائس چیئرمین تھے، مجھے غالب ایوارڈ دیا

تو یہ فرمایا تھا کہ آپ غالب پر ناول لکھیے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ بنگلہ کے ایک ادیب سے جو پدم بھوشن بھی تھے، وزیر موصوف نے فرمائش کی تھی اور وہ غالب کی دلّی کی Topography کے لیے دلّی میں قیام پذیر بھی ہوئے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے معذرت کر لی تھی۔ طالب علمی کے زمانے سے میرا خیال تھا کہ غالب جیسا مغرور اور مغل تہذیب کا زرّیں نمائندہ ایک ڈومنی پر کیسے عاشق ہوسکتا ہے۔ وہ اس کے شہوانی تعلق میں تو مبتلا ہوسکتا ہے، لیکن اسے محبوبہ کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اپنی منھ بولی بہن بیگم حمیدہ سلطان کی زبانِ مبارک سے جب میں نے یہ سنا تھا کہ غالب کسی ایرانی رسالدار کی بیوہ کی اصلاح فرماتے تھے اور اچانک اس کا انتقال بھی ہوگیا تو مجھے غالب کی محبوبہ مل گئی۔ میں نے اس عہد کے سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود صاحب سے اس ایرانی بیوہ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں بیگم حمیدہ سلطان کے بیان پر یقین نہیں کرتا، لیکن آپ کو ناول لکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں، اس لیے کہ آپ غالب کی سوانح عمری نہیں لکھ رہے ہیں، غالب پر ناول لکھ رہے ہیں اور غالب کے معاشقے کے لیے ایرانی رسالدار کی بیوہ یقیناً بہت مناسب کردار ہے۔ میں نے جب منٹو کی لکھی ہوئی فلم غالب دیکھی تو مجھے افسوس بھی ہوا تھا، اور اس کی وہ غزل۔ ''شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں + ختم تھی اس پر وفا کی پردہ داری ہائے ہائے'' جب پڑھتا تھا تو جیسے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شعر ڈومنی کے لیے کہا گیا ہے۔ ابھی میں اس کش مکش میں مبتلا تھا کہ غالب کا ایک اور شعر مل گیا۔ ''ہاں غالبِ خلوت نشیں بیم چناں عیشِ چنیں + جاسوسِ سلطاں در کمیں معشوقِ سلطاں در بغل''، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ڈومنی غالب کی معشوقہ تھی تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ وہی ڈومنی سلطان کے بغل میں تھی۔ رہا یہ اعتراض کہ شعر ہمیشہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس شعر کا کیا جواز ہے..... ''شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے۔'' ہمارے پاس شاعروں کے اشعار کے علاوہ ثبوت نام کی اور

کون سی چیز ہوسکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر زمانے میں خطوط بازی ہوئی ہو اور اگر خطوط بازی ہوئی بھی تو اس کا ملنا ناممکن ہے۔ اس لیے میں نے غالب کی ہیروئن ترک بیگم کو مان لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ نواب شمس الدین کی پھانسی کا واقعہ بھی میں نے بیان کیا ہے، جس نے غالب کی زندگی کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ غالب نے نواب شمس الدین کی مخبری کی ہے۔ نواب شمس الدین اس قدر بے وقوف تھا کہ بھرے دستر خوان پر انگریز ریزیڈنٹ کی موت کا ذکر کرتا ہے۔ ایک شخص اور وہ بھاگ کر انگریز کی حدود میں داخل ہو کر پوری رام کہانی سناتا ہے تو پھر غالب پر شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ میں نے نواب شمس الدین کا واقعہ پڑھا تو معلوم نہیں کیوں مجھے اس وقت بھی یقین تھا اور آج بھی ہے کہ نواب شمس الدین نے ریزیڈنٹ کو قتل کرنے کا جو فیصلہ کیا، وہ کسی بہت بڑے سبب کا نتیجہ تھا۔ مثلاً نواب شمس الدین کے والد نواب فیروز پور جھر کا اور ریزیڈنٹ میں خاصی دوستی تھی۔ اس کا امکان ہے کہ انگریز ریزیڈنٹ نے نواب کی کسی بیگم کو دیکھ لیا ہو اور عشق میں مبتلا ہو گیا ہو اور نواب شمس الدین کی غیرت نے اس کے قتل کا منصوبہ بنا لیا ہو۔ میں ان باتوں کو ناول میں اس لیے بیان نہیں کر پایا کہ اس کے لیے Archieves تک کی رسائی حاصل کرنا پڑے گی جس کی نہ فرصت تھی، نہ دماغ، ورنہ میں ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا ناول ضرور لکھتا۔ غالب ناول کے سہارے ہی مجھے یہ بتلانا مقصود تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام کیوں ہوئی۔ میدانِ جنگ کا بیان تو میں نہیں کر سکا، اس لیے کہ موقع نہیں تھا، تاہم خوں ریزی کا بیان موجود ہے اور بہادر شاہ ظفر کی مجبوری، معذوری اور صلابت کا بھی بیان موجود ہے۔

پروفیسر عبدالعظیم ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے غالب ناول کا ایک باب پڑھنے کے لیے جلسے کا اہتمام کیا۔ سید والا تبار نے صدارت قبول فرمائی، اور صدارتی کلمات میں فرمایا کہ لکھنؤ کے بیان کے سلسلے میں اب تک میں 'یادوں کی برات' کو

حرفِ آخر سمجھتا تھا لیکن غالب کا یہ باب سن کر مجھے اپنی رائے میں تبدیلی کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

راشد: قاضی صاحب! آپ نے تخلیقی عمل سے متعلق بہت بنیادی بات کہی کہ سوانح نگاری کے دوران ہم تاریخی حقائق کو تبدیل نہیں کر سکتے، لیکن اگر ہم ناول کی تخلیق کر رہے ہیں تو بحیثیت ناول نگار ہمیں کچھ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ آپ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ اگر کچھ فکشن بھی تاریخ میں شامل کرتے ہیں تو وہ اس قدر حقیقی ہوتے ہیں کہ ہمیں پیش کیے گئے واقعے میں ہی اصل تاریخ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ تمام باتیں ناول اور تاریخی ناول کے حوالے سے گفتگو میں زیرِ بحث آئیں گی۔ سرِ دست آپ اپنے ناول ''تاجم سلطان'' اور ''حضرت جان'' کے متعلق کچھ فرمائیں جنھیں ہم عصر تنقید نے کچھ حد تک نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

قاضی عبدالستار: ''تاجم سلطان'' ضرورت سے زیادہ بالغ عمر کی کہانی ہے۔ میری عمر ۳۶ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، جب تاجم سلطان با قاعدہ مجھے میسر آئی۔ آٹھ سال تک ہم دونوں ملنے اور نہ ملنے کی کش مکش میں مبتلا رہے، لیکن جب وہ ملی تو محسوس ہوا جیسے ہم مدتوں سے اسی کے منتظر تھے۔ اس کی بے خود سپردگی اور بے محابہ محبت، بے پناہ قربت سب خواب ناک سا تھا۔ میں جب ذرا تنہا ہوتا تو سوچا کرتا کہ ایسا تو کسی افسانے میں بھی نہیں پڑھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے اور اسی کیفیت میں میں اس کی قربت سے شرابور رہتا۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سب خواب ہے۔ ابھی ہم کو ابوالحسن کی طرح بیدار کر دیا جائے گا اور ہم پھر علی گڑھ کی زندہ بدصورت زندگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ اس بیماری نے ایک حقیقت ہم پر واضح کر دی کہ اس کو اس کے نکاح کی بشارت مل چکی تھی۔ اس نے اپنے عاشق کا استقبال نہیں کیا تھا، اپنے دولہا کا استقبال کیا تھا۔ اپنا آپ، اپنے شوہر کو پیش کیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ساری زندگی میں یہ تماشا ہوتا رہا کہ جب ایک خوشی نصیب ہوئی تو اس کے

ساتھ غم بھی لگا رہا۔ جب یہ راز فاش ہوا اس کے فوراً بعد زہر کا اثر اس پر طاری ہونے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کروں یا اپنی بدبختی کا ماتم کروں۔ وہ باون دن جو تاجم سلطان کی قربت میں بسر ہوئے، ساری عمر کے لیے ایک روگ بن گئے۔ ساری زندگی اس کی رنج و محن کے تاثر سے غم ناک ہوگئی۔ آج بھی میرے تخیل پر اور خوابوں پر اس الم ناک کیفیت کا اثر ہے۔ ایک مدت گزر گئی لیکن آج بھی کبھی کبھی راتوں میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ نیند سے غنودہ آنکھوں میں اس کی پرچھائیوں کا جشن برپا ہو جاتا ہے۔ ساعت اس کے تکلم کی دولتِ بے بہا سے امیر ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے شانے پر سر رکھ دیا اور شانے پر کچھ نمی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں اسے سونگھتا تو اس کی خوشبو سے پوری شخصیت معطر ہو جاتی۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک جگمگاتی پرچھائیں دروازے میں غروب ہوگئی۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا ہو۔ دھیرے دھیرے دروازہ کھل رہا ہو، چپکے چپکے رو رہا ہو، اور میں آنکھیں مل کر جب غور سے دیکھتا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوتا، کچھ بھی نہیں۔

جہاں تک ''حضرت جان'' کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتوں کا انکشاف ضروری سمجھتا ہوں۔ بہت دن ہوئے جب حیات اللہ انصاری صاحب راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے تھے اور ویسٹرن کورٹ میں قیام فرماتھے، میں ان سے ملنے گیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ بہت خوش ہوئے۔ اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ چلتے وقت فرمایا کہ اب کی جب آیئے تو ایک دن ہمارے پاس قیام کیجیے۔ میں دوسرے یا تیسرے مہینے جب دہلی گیا تو سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ویسٹرن کورٹ میں وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھے۔ میرا بستر انھیں کے کمرے میں تھا۔ جب ان کے بیٹے سدرت اپنی بیگم کے ساتھ خواب گاہ میں چلے گئے تب انصاری صاحب اُٹھے، کنجی سے ایک دراز کھولی اور ایک فائل جو ایک بڑے لفافے میں بند تھی، نکال کر مجھے دی اور

کہا میں نے یہ نوٹس لیے ہیں یہاں کی ہولناک زندگی کے متعلق۔ خواہش تھی بلکہ آرزو تھی کہ میں اس پر ایک ناول لکھوں، لیکن عمر جیسے تخیل پر اور تخلیقیت پر غالب آچکی ہے۔ ہمت نہیں پڑتی، نہ میں اتنی محنت کرنے کی قابل رہ گیا۔ اکثر یہ خیال آیا کہ آپ اس پر لکھ سکتے ہیں۔ ہر چند کہ جنس آپ کا موضوع کبھی نہیں رہا، لیکن استعاروں کی دولت تو آپ کے پاس ہے۔ اس کے وسیلے سے آپ کیسی بھی، کوئی بھی بات خوب صورتی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس کو اپنے بیگ میں رکھ لیجیے۔ اطمینان سے پڑھیے اور ضائع کر دیجیے، یہ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا۔ میں نے عرض کیا انصاری صاحب اگر آپ حکم دیں تو میں اسی شب میں اسے پڑھ لوں اور آپ کے سامنے اسے ضائع کر دوں۔ نہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اطمینان سے پڑھیں۔ میں نے بڑی محنت سے بہت وقت لے کر حضرت جان لکھا۔ اس کی اشاعت کو کافی دن ہو چکے تھے جب میں قرۃ العین حیدر کی خدمت میں حاضر ہوا اور دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں Horror پر ایک ناول لکھوں۔ قرۃ العین حیدر نے برجستہ فرمایا، وہ تو آپ لکھ چکے۔ حضرت جان سے بڑا Horror اور کیا ہوگا۔ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور یہ محسوس ہوا کہ میری محنت سوارت ہوگئی۔ قرۃ العین حیدر، بڑے بڑوں کو نظر انداز کرتی رہیں یا ٹیڑھے میڑھے جملوں میں ٹرخا دینے کی عادی رہی ہیں، لیکن مجھے فخر ہے کہ میری تحریروں کو انھوں نے ہمیشہ ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ یہاں میں اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انصاری صاحب کے پورے نوٹس کا میں استعمال نہیں کر سکا، اس لیے کہ مجھے اپنے بیوی بچوں کو منھ دکھانا تھا۔

راشد: قاضی صاحب! اب کچھ باتیں آپ کے ناولٹ کے حوالے سے ہونی چاہئیں۔ ''مجو بھیا'' اور ''بادل'' کے عنوان سے دو ناولٹ آپ کے قلم سے وجود میں آئے۔

اس سے پہلے کہ میں ناول اور ناولٹ کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتیں آپ سے جاننے کی کوشش کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں ناولٹ سے متعلق بھی اپنے خیالات مختصر طور پر ظاہر کریں۔ ان دونوں ناولٹ میں آپ نے اپنی انفرادیت کس طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

قاضی عبدالستار: ہاں ناول اور تاریخی ناول یا ناول اور ناولٹ سے متعلق بنیادی باتوں کی تفصیل آ گے آئے گی۔ میں پہلے اپنے دونوں ناولٹ سے متعلق مختصر طور پر کچھ باتیں بیان کرنا چاہوں گا۔ ''مجو بھیا'' میں ایک نوجوان معمولی زمین دار، ایک رئیس کے گھوڑے پر عاشق ہوتا ہے اور اسے اپنے جاں نثاروں کے ذریعے چوری کرا لیتا ہے۔ اس کا رنگ بدل دیتا ہے اور اس ضمن میں جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے، اسے قتل کر دیتا ہے یا اجاڑ دیتا ہے۔ ساری کہانی صرف دو باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ گھوڑے کا حصول اور اقتدار کی سلامتی۔ ''بادل'' کو میں نے زمین داری کی علامت بنایا ہے۔ وارث علوی اور باقر مہدی دونوں نے اسے علامتی ناولٹ کہا ہے اور یہ بھی ناولٹ ہے۔ یہاں بھی ایک زمین دار، دوسرے زمین دار کے ہاتھی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے شادی بھی کرتا ہے اور دلہن کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ ظاہری کہانی کے اندر باطنی کہانی بھی چلتی رہتی ہے۔ چوں کہ زمین داری نظام کو برباد ہونا ہی ہے، اس لیے ہاتھی کے ذریعے دو گھر برباد ہوتے ہیں اور ہاتھی خود بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیریں تو دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں کم و بیش مل بھی سکتی ہیں، لیکن ''غبارِ شب'' کی کہانی اپنی طرح کی نرالی کہانی ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر زمین داروں نے ہجرت تو کی ہے اور سینکڑوں ہزاروں نے کی ہے، لیکن غبارِ شب کے جمیل میاں نے جھام پور میں اپنی ریاست اور حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر دیا اور اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔

اس سے پہلے کہ میں ناول اور ناولٹ کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتیں آپ سے جاننے کی کوشش کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں ناولٹ سے متعلق بھی اپنے خیالات مختصر طور پر ظاہر کریں۔ ان دونوں ناولٹ میں آپ نے اپنی انفرادیت کس طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

قاضی عبدالستار: ہاں ناول اور تاریخی ناول یا ناول اور ناولٹ سے متعلق بنیادی باتوں کی تفصیل آگے آئے گی۔ میں پہلے اپنے دونوں ناولٹ سے متعلق مختصر طور پر کچھ باتیں بیان کرنا چاہوں گا۔ ''مجو بھیا'' میں ایک نوجوان معمولی زمین دار، ایک رئیس کے گھوڑے پر عاشق ہوتا ہے اور اسے اپنے جاں نثاروں کے ذریعے چوری کرالیتا ہے۔ اس کا رنگ بدل دیتا ہے اور اس ضمن میں جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے، اسے قتل کر دیتا ہے یا اجاڑ دیتا ہے۔ ساری کہانی صرف دو باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ گھوڑے کا حصول اور اقتدار کی سلامتی۔ ''بادل'' کو میں نے زمین داری کی علامت بنایا ہے۔ وارث علوی اور باقر مہدی دونوں نے اسے علامتی ناولٹ کہا ہے اور یہ بھی ناولٹ ہے۔ یہاں بھی ایک زمین دار، دوسرے زمین دار کے ہاتھی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے شادی بھی کرتا ہے اور دلہن کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ ظاہری کہانی کے اندر باطنی کہانی بھی چلتی رہتی ہے۔ چوں کہ زمین داری نظام کو برباد ہونا ہی ہے، اس لیے ہاتھی کے ذریعے دو گھر برباد ہوتے ہیں اور ہاتھی خود بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیریں تو دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں کم و بیش مل بھی سکتی ہیں، لیکن ''غبارِ شب'' کی کہانی اپنی طرح کی نرالی کہانی ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر زمین داروں نے ہجرت تو کی ہے اور سینکڑوں ہزاروں نے کی ہے، لیکن غبارِ شب کے جمیل میاں نے جھام پور میں اپنی ریاست اور حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر دیا اور اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔

میرا اودھ کے نظام زمین داری کا جو مطالعہ ہے اس میں زمین دار صرف اپنے بیٹے کا قاتل ہی نہیں ہے، بلکہ اپنی حکومت اور ریاست کو برقرار رکھنے کے لیے مذہب کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ ایک زمین دارزادہ آیا جس کا باپ اچانک مر جاتا ہے۔ ہما شما اس کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان پر حاوی رہتا ہے، لیکن ایک کردار جو آزاد ہندوستان میں ہندو ہونے کی حیثیت سے، اس کی رقابت، اقتدار، طاقت کو چیلنج کرتا ہے اور اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں مسلمان رہ کر نہ صرف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ مسلمانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی مسجدوں اور درگاہوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اور وہ جھام پور گاؤں کے رئیس کی حیثیت سے ہندو ہو جاتا ہے اور اپنا نام جھام سنگھ رکھ لیتا ہے اور اب جھام پور میں کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکے۔

راشد: قاضی صاحب! واقعی آپ نے جو باتیں بتائی ہیں، ان کی صداقت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ 'مجو بھیا'، 'بادل' اور 'غبارِ شب' میں آپ نے زمین دارانہ ماحول کی جس طرح تصویر کشی ہے، اس کی نظیر اردو ناول اور ناولٹ میں مشکل سے ملے گی۔ زمین دارانہ ماحول کی جزئیات کو دوسرے فن کاروں نے بھی اُجاگر کیا ہے، لیکن آپ نے بنیادی صداقتوں کو قدرے مختلف زاویوں سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسی بنا پر اس ماحول کی جو زندہ تصویریں آپ کی تحریروں میں جھلکتی ہیں، وہ دوسرے فن کاروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ چوں کہ آپ کے ناول اور ناولٹ کے حوالے سے بنیادی باتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، لہٰذا اب ناول اور ناولٹ کے فرق سے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ جب ہم ناولٹ کی اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں تو بہت سی چیزیں ہمارے ذہن میں واضح نہیں ہو پاتی ہیں۔ ناول سے فرق قائم کرنے کے لیے ہم ناولٹ کی اصطلاح کا سہارا لیتے ہیں، لیکن فن کی حیثیت سے ان دونوں کے مابین فرق کی وضاحت مشکل ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختصار کی بات دہرائی جا سکتی ہے،

لیکن موضوع کی پیش کش کا معاملہ تو کم و بیش ایک جیسا ہی ہوتا ہے، تو کیا ناول اور ناولٹ میں صرف ضخامت کا فرق ہی قائم رہتا ہے یا کچھ اور باتیں بھی دونوں کا فرق قائم کرتی ہیں۔ آپ نے چوں کہ ناول اور ناولٹ دونوں ہی لکھے ہیں اور حسنِ اتفاق سے آپ کی تنقیدی نگاہ بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے، لہٰذا یہ ضرور بتائیں کہ آپ ناول اور ناولٹ کے فرق کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

قاضی عبدالستار: میری ناچیز رائے میں ناول اور ناولٹ میں کینوس کا فرق ہوتا ہے، تناظر کا فرق ہوتا ہے، زندگی کی وسعت اور اختصار کے ساتھ پیش کش کا دخل ہوتا ہے۔ کینوس سے میرا مطلب ہے کہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی ضروری تفصیل کا بھی ذکر ناول میں آئے گا۔ اسی موضوع پر لکھے ہوئے ناولٹ میں جزئیات نگاری محض نمائندگی کی حد تک ہوگی۔ یہاں قلم کو بے پناہ نہیں ہونا چاہیے، جب کہ ناول میں قلم کی بے محابہ نگاری ضروری ہے۔ کرداروں کی پیش کش میں بھی جہاں تک ناول کا سوال ہے، پوری وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ بیان ہوگا جب کہ ناولٹ بڑی حد تک واضح اور ممکن اور زیادہ تر اشاروں پر مبنی ہوگا۔ یہیں افسانے کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ہم نے بار بار کہا ہے اور لکھا ہے کہ افسانہ چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن ہے۔ یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی کو سمیٹ لینے کا آرٹ ہے۔ یہاں الفاظ اشاروں کا کام کرتے ہیں، رنگوں کا کام کرتے ہیں۔ محض علامتوں کا کام کرتے ہیں۔ کسی چیز کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ شاید اسی خامی کی بنا پر افسانے کو بعض لوگوں نے چھوٹا آرٹ کہا ہے جو ہر طرح غلط ہے۔ جدیدیت کا جب ہنگامہ برپا ہوا تو اس کے ایک ''مبلغ کبیر'' نے فرمایا کہ افسانہ چھوٹا آرٹ ہے اور شاعری پیغمبروں کی زبان ہے اور بڑا ادب ہے۔ میں نے دہلی میں عرض کیا تھا کہ اس شاعر کا نام بتایئے جس پر پیغمبری نازل ہوئی ہے۔ اس پیغمبر کا نام بتایئے جس نے دیوان لکھا ہو۔ راشد صاحب یہ باتیں آپ کے خلاف جا رہی ہیں، لیکن مجبوری ہے۔ جہاں تک

افسانے کا سوال ہے، تمام صحائف آسمانی خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، افسانوں سے معمور ہیں۔ اس لیے افسانہ نہ صرف الوہی صنف کہی جا سکتی ہے بلکہ اس میں فن کی تکمیل کے تمام امکانات پوشیدہ ہیں۔ خود قرآن پاک میں موجود ہے کہ افسانہ کہتے رہو تا کہ لوگ کچھ تو غور کریں۔ یہاں افسانہ، افسانے کا وجود بھی ہے اور افسانے کی defination بھی ہے۔ یعنی افسانہ وہ ہے جسے سن کر لوگ غور کرنے پر مجبور ہوں۔

راشد: درست فرمایا آپ نے۔ کینوس اور تناظر کے فرق کو سامنے رکھا جائے تو ناول اور ناولٹ کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وسعت اور اشاروں کی بات ہی بامعنی ہے اور اسی تناظر میں ان دونوں اصطلاحوں کو فن کی سطح پر دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ آپ نے کچھ باتیں افسانے کے متعلق بھی کی ہیں اور افسانوں کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے قرآنِ کریم کا حوالہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اور وضاحتیں پیش کریں تو خوشی ہو گی۔

قاضی عبدالستار: عروض کے بعض ماہرین نے قرآن کریم میں مختلف بحور کی نشان دہی کی ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ قرآن کریم مختلف بحور میں ہے۔ شاعری نے قرآن کے فقروں سے بحور کو وضع کیا ہے اور قرآن کی نقل میں قافیہ جو شاعری کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کا عرفان حاصل کیا ہے، اور اس پر اپنے فن کی بنیاد رکھی ہے۔ شاعری کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسے گایا جا سکے۔ قرآن کی کوئی آیت گائی نہیں جا سکتی، بہ آواز بلند پڑھی جا سکتی ہے، انسان کو للکار سکتی ہے، پھنکار سکتی ہے لیکن مزامیر کے ساتھ گانا ممکن نہیں ہے۔ یعنی شاعری نے قرآن کی نثر سے اپنے زیورات حاصل کیے، نثر اوّل، نثر آخر۔ بات ختم۔

راشد: قاضی صاحب! آپ نے زمین دارانہ ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے جہاں یادگار ناول اور افسانے لکھے وہیں تاریخی ناولوں کے ذریعے بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔ آپ نے اپنے کئی افسانوں میں بھی تاریخی شعور کو کامیابی کے ساتھ

پیش کیا ہے۔ تاریخی ناول میں بھی دو شقیں آپ کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تاریخی ناول تو اسلامی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے جب کہ دوسرا تاریخی ناول ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے نشیب و فراز سے متعلق ہے۔ دونوں نوعیت کی تاریخی صداقتیں، تخلیقی سطح پر قدرے مختلف پیش کش کا تقاضا کرتی ہیں۔ آپ نے دونوں طرح کے تاریخی ناولوں میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ فن کی حیثیت سے آپ یہ بتانے کی زحمت کریں کہ تاریخی ناول میں کون سی بنیادی باتیں ناگزیر حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ دوسرے فن کاروں نے بھی تاریخی ناولوں کو اپنی تخلیقی ترجیحات میں شامل رکھا ہے اور مختلف نوعیت کے تاریخی ناول لکھے ہیں۔ آپ نے تخلیقی سطح پر دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں کون سا مختلف راستہ اختیار کیا ہے؟

قاضی عبدالستار: میں پہلے ناول اور تاریخی ناول کے فرق پر بات کروں گا۔ ناول اور تاریخی ناول کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ناول میں کرداروں کی تخلیق اور ان کی پیش کش میں تخیل بے محابہ ہوسکتا ہے، لیکن تاریخی ناول میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ناول میں جو کردار ہوتے ہیں وہ عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اور انھیں کو ناول میں پیش کیا جاتا ہے جو قدرے آسان اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے لاحقے اور سابقے سب آپ کی نظر میں ہوتے ہیں۔ تاریخی ناول کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کوئی چیز نظر کے سامنے نہیں ہے۔ سب کچھ الفاظ کے پردوں میں گم ہوتا ہے اور آپ کو وہ پردے ہٹا کر کردار کی زندگی میں جھانکنا پڑتا ہے۔ اس کی اردگرد کی زندگی کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ ٹالسٹائی نے لکھا ہے کہ ۱۸ برس میں میں نے ایک ناول لکھا War and Peace لکھا۔ سوا برس صرف فضا کی تخلیق میں صَرف ہوگئے۔ بہت معمولی معمولی باتیں فضا کی تخلیق میں معاون ہوتی ہیں۔ War and Peace میں Prince Andreu جو کمانڈر جنرل ہے، وہ میدانِ جنگ میں مارا جاتا ہے۔ نپولین ادھر سے گزرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ

کمانڈر جنرل، آدھا گرے ہوئے، مرے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر ہے اور آدھا زمین پر۔ ایک ہاتھ میں جھنڈا ہے اور دوسرے ہاتھ میں خون آلود تلوار۔ نپولین گھوڑے سے اُترتا ہے، سیلوٹ کرتا ہے، اور کہتا ہے What a splended death?۔ ٹالسٹائی نے اس کو بیان کرنے میں کتنا وقت دیا ہوگا، اس واقعے کو پیدا کرنے میں اور اس کی پیش کش میں کتنی دقت نظری کا ثبوت دیا ہوگا، تصور کیا جاسکتا ہے۔ جب کوئی War and Peace کا نام لیتا ہے تو جو چند واقعات فوراً ذہن میں جگمگانے لگتے ہیں، ان میں ایک یہ واقعہ ہے۔ اردو کے تاریخی ناول نگار خواہ وہ شرر ہوں یا ان کی پیروی کرنے والے، سبھوں نے حاصل پر زور دیا ہے۔ حصول میں کیسی کیسی دقتیں اور مصیبتیں راستے میں آتی ہیں، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں فضا نہیں ہے۔ وہ ناول ترکی کا بھی ہوسکتا ہے، شام کا بھی ہوسکتا ہے اور عرب کا بھی ہوسکتا ہے۔ میں دوسری مثال دیتا ہوں۔ شان الحق حقی اور مجنوں گورکھ پوری دونوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھیے تو ان کا وہی تاثر ہوتا ہے جو ہونا چاہیے، لیکن ان ترجمہ شدہ ڈراموں کو پڑھیے تو مغز تو ہاتھ میں آجاتا ہے، لیکن مغز کے لاحقے اور سابقے اور اس کی پوری فضا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتی ہے۔ اس لیے یہ ترجمے ناکام ہیں۔ میں تیسری مثال دیتا ہوں۔ بڑے سے بڑا رئیس کھانا طلب کرتا ہے، یا کھانے کے وقت کچھ اظہار کرتا ہے اور اس کے خدام دسترخوان یا میز لگا دیتے ہیں۔ مغل شہنشاہ کھانا نہیں مانگتا۔ داروغۂ مطبخ صرف حاضر ہوکر اپنی صورت دکھا دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مغل شہنشاہوں کا مطبخ تین سطحوں پر قائم ہوتا ہے۔ پہلا کھانا بارہ بجے تیار ہوگیا۔ وہی کھانا ایک بجے کے لیے بھی تیار ہے، اور دو بجے کے لیے بھی تیار ہے۔ یعنی اگر شہنشاہ نے بارہ بجے کھانا نہیں کھایا تو ایک بجے تک اس کا مزہ کم ہوجائے گا۔ اس لیے دوسری پتیلی حاضر ہے۔ اگر اس نے ایک بجے بھی نہیں کھایا تو دو بجے کے لیے

دوسرا برتن موجود ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغل شہنشاہ کے کھانے کا بیان کرتے ہوئے مصنف کو ان نزاکتوں کا علم ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان نزاکتوں کا بیان بھی کیا جائے، لیکن علم ضرور ہونا چاہیے۔ خالد بن ولید کی فتوحات کا بہت بڑا راز میدانِ جنگ میں ان کے تیر کی پیش کش تھا۔ وہ غنیم کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ صبح سے لشکر کھڑا ہے، حملہ نہیں ہو رہا ہے۔ جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا اور سیف اللہ نے محسوس کیا کہ اب غنیم کا لشکر دوپہر کے کھانے کے لیے بے قرار ہوگا، نہ صرف سپاہی اور جنرل بلکہ گھوڑے تک بھوکے ہوں گے۔ عین اسی وقت سیف اللہ نے یلغار کر دی۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ غنیم کے پاس دوگنی اور تین گنی فوج ہے، ان کے سپاہی عربوں سے زیادہ لمبے چوڑے اور آہن پوش ہیں، ان کے گھوڑے عرب گھوڑوں سے زیادہ اونچے اور صلاح پوش ہیں مگر مقابلے پر پیٹھ دکھا جاتے ہیں۔ مانا کہ مسلمان لشکر کا جوش و خروش اور ہیبت وسطوت اور نعرۂ تکبیر کی برکت سب اس کی پشت پر ہے، لیکن یہ بات بھی ہے کہ غنیم کے بھاری بکتر بند سوار اور گھوڑے اس پھرتی اور تیزی اور طراری کے ساتھ میدانِ جنگ میں جنبش نہیں کر سکتے، جس تیزی اور طراری کے ساتھ عرب لشکر اظہار کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ عرب لشکر کو بھوک کیوں نہیں لگتی۔ عربوں کا زیادہ تر لشکر اونٹ پر ہوتا ہے اور اگر گھوڑے پر بھی ہے تو ان کے پاس سوکھا اناج، میوے موجود ہیں۔ انھوں نے دو مٹھی بھنا ہوا چنا چبالیا، پانی پی لیا اور تازہ دم ہو گئے، لیکن غنیم کے سپہ سالار زرکار دسترخوان کے منتظر ہیں اور سپاہ عمدہ کھانے کا انتظار کر رہی ہے۔

فضا آفرینی تاریخی ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر کوئی ناول نگار فضا کی تخلیق پر قادر نہیں ہے تو وہ ناکام تاریخی ناول نگار ہے۔ فضا کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات اور معمولی سے معمولی جزئیات کا علم بھی ہو، اور اس کے انتخاب کا سلیقہ بھی ہو۔ یہ تو سب جانتے

ہیں کہ کیا لکھنا ہے، یہ صرف بڑا ادیب جانتا ہے کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔ جب مغل اعظم فلم آئی تو بہت مقبول ہوئی۔ ظاہر ہے کہ تاریخی طور پر وہ واقعہ صحیح نہیں ہے، لیکن جس طرح پیش کش ہوئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اختر الایمان کو بھی اس کے لکھنے میں شمولیت کا موقع ملا تھا اور ان کو کوئی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ میں جب بمبئی گیا تو داراشکوہ کی شہرت موجود تھی۔ اختر الایمان نے مجھے کھانے پر بلایا اور دورانِ گفتگو 'مغل اعظم' پر باتیں کیں۔ میں نے تعریف کی۔ اختر الایمان نے پوچھا کہ خامی بتایئے تو میں نے عرض کیا کہ بیسیوں ہیں۔ مثلاً میدانِ جنگ میں اکبر کہتا ہے کہ ''یلغار ہو۔'' یہ ''ہو'' کیا چیز ہے؟ لکھنے والے کو نہیں معلوم کہ مغل شہنشاہ بہت کم بولتے تھے۔ جب بولتے تھے تو زمین و آسمان خاموش ہو جاتے تھے۔ یلغار کا لفظ کافی ہے۔ توپ کے حملے کے لیے ضرب کا لفظ کافی ہے۔ نعرے لگانے کی ضرورت نہیں۔ یا انارکلی کی والدہ سے اکبر ٹکرا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرے منھ پر آنکھیں نہیں ہیں۔ تاریخی طور پر نہیں، بیان کے لحاظ سے یہ پورا واقعہ غلط ہے۔ اکبر سے وہ عورت ٹکرائی کیسے؟ اس روش پر جس پر وہ ٹہل رہا ہے، وہ آئی کیسے؟ اور اگر بہ فرضِ محال یہ سب کچھ ہو بھی گیا تو اکبر کے منھ سے یہ جملہ کیسے نکلا کہ تیرے منھ پر آنکھیں نہیں ہیں، لاحول ولاقوۃ۔ اگر اکبر کے منھ سے یہ جملہ نکل گیا ہوتا تو اس کی آنکھیں نکال لی گئی ہوتیں۔ ایک بات اور۔ جب پریسیڈنٹ آف انڈیا مغل گارڈن میں ٹہلتا ہے تو کس کی مجال کہ وہ دس فٹ کے آربٹ میں داخل ہو جائے اور اگر وہ ہوتا ہے تو اسے گولی لگ جانا ضرور ہے۔ چہ جائیکہ اکبر اعظم۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اکبر داڑھی بنواتا ہوگا، کلیاں کرتا ہوگا، دسترخوان پر بیٹھ کر ہنستا بولتا بھی ہوگا کہ بہر حال آدمی تھا، لیکن مصور نے کوئی تصویر ایسی نہیں بنائی جس میں اکبر کو لال کپڑا باندھے، گردن اُٹھائے، حجام کے اُسترے سے داڑھی بنواتا ہوا دکھایا گیا ہو۔ اس چیز کو تاریخی ناول نگار کو یاد رکھنا چاہیے۔ تاریخی ناول نگار کو اپنے کرداروں کے مزاج

کے بارے میں بھی علم ہونا چاہیے۔ مثلاً کوئی صاحب چنگیز کو یا تیمور کو یا عالم گیر کو قہقہہ لگاتے ہوئے پیش کریں تو قابلِ رحم ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی شریعت میں تبسم حرام ہے۔ پورے پچاس سال کی حکومت میں اورنگ زیب کو صرف ایک بار مسکراتے ہوئے دیکھا گیا۔ تیمور، چنگیز کے سلسلے میں ایسا کوئی حادثہ ایک بار بھی نہیں ہوا۔ یہ بات تیمور، چنگیز اور عالم گیر پر لکھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے، ورنہ وہ انصاف نہیں کر سکیں گے۔

راشد: قاضی صاحب! آپ نے بہت تفصیل کے ساتھ ناول اور تاریخی ناول کے فرق کی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ تاریخی ناول نگار لکھنے کے دوران کن باتوں کو اپنے پیش نگاہ رکھے تا کہ وہ موضوع سے انصاف کر سکے۔ ناول نگار اگر زبان و بیان پر گرفت رکھتا ہے اور نفسیاتی پہلوؤں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے تو فن کے بہترین نمونے وجود میں آتے ہیں، لیکن اس مرحلے پر بھی اسے بعض ناگزیر پہلوؤں پر بہ طور خاص توجہ مرکوز کرنی چاہیے تا کہ قصے کے بیان میں منطقی توجیہ بھی شامل ہو سکے۔ آپ نے بہت بنیادی باتوں کی جانب اشارے کیے۔ ناول نگار اگر تاریخی ناول لکھنے کے دوران ان باتوں کو نظر انداز کرے گا تو وہ خود اپنے لیے تضحیک کا سامان فراہم کرے گا۔ میں آپ کی توجہ ایک اور بنیادی پہلو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کے مابین فرق کی نشان دہی کریں۔ زمین دارانہ ناول اور جاگیردارانہ ناول کی بات بھی عام طور پر کی جاتی ہے۔ کیا یہ دونوں ناول ایک جیسے ہوتے ہیں یا ان میں بھی کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ زمین دار اور جاگیردار میں تو بہر حال فرق ہوتا ہے اور آپ نے اس کی وضاحت بھی کی ہے، لیکن دونوں ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے ناولوں میں اس ماحول کے فرق کو کس طرح برقرار رکھا جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار: بھئی سب سے پہلے تو ناول نگار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ زمین دار صرف اپنے لیے زندہ رہتا ہے، اس کا نہ باپ ہوتا ہے، نہ بیٹا، نہ بیوی، نہ بچے۔ میری

ناچیز رائے میں زمین دار محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر کی معنوی اولاد ہوتا ہے جسے صرف اپنی حکومت، اپنی عشرت، اپنی انا ہی عزیز ہوتی ہے۔ اب اس کے بیان میں سات چیزیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، کسی نہ کسی صورت میں نظر آنا ضروری ہے۔ زمین دار اگر مسلمان ہے تو اس کا مختار ہندو ہوگا۔ یہ قانون تھا، اور زمین دار اگر ہندو ہے تو اس کا مختار مسلمان ہوگا۔ جیسے یہ ان کا لکھا قانون ہے جس پر تعلق داری نظام کا انحصار تھا۔ ترقی پسند تحریک نے تعلق دار کو ایک طبقے کی طرح بیان کیا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے، لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ ہر زمین دار اور تعلوقے دار پہلے ایک فرد ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی طبقاتی مجبوریاں ہوتی ہیں جس کی پیش کش ترقی پسند تحریک کے کسی لکھنے والے نے نہیں کی۔ اس بیان کی جسارت صرف خاکسار نے کی۔ ہر چند کہ شروع میں میری شدید مخالفت ہوئی، لیکن بالآخر میری شہرت اور مقبولیت نے اسے دفن کر دیا۔

جاگیردارانہ زندگی کی پیش کش اردو کے کسی ناول میں موجود نہیں ہے۔ صرف عزیز احمد اس زندگی کو پیش کر سکتے تھے، لیکن شاید نظام کی ہیبت نے ان کے قلم کی آزادی اور تخلیقیت کو متاثر کیا۔ جاگیردارانہ زندگی درحقیقت حکمراں ریاست کے حاکم کا بیان ہوتی ہے جو بڑی حد تک بادشاہوں کے بیان کی نقالی ہوتی ہے، اور یہ اس وقت تک بیان نہیں کی جا سکتی جب تک اس زندگی سے پوری طرح سابقہ نہ پڑا ہو۔ اگر مجھے تاجم سلطان کی قربت نصیب نہیں ہوئی ہوتی اور میں نے اس کے محل کی زندگی کو دیکھا نہ ہوتا، برتا نہ ہوتا تو میں تاجم سلطان کی سماجی زندگی کی پیش کش کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ دولت اور ریاست کا بے محابہ اظہار صرف اس زندگی میں ملتا ہے۔ یہاں کوئی قدغن نہیں ہے، کوئی خوف نہیں ہے، کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ تاجم سلطان نے ایک موقع پر کہا تھا کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میں سیر دو سیر موتی تو خرید سکتی ہوں لیکن دو خوب صورت

جملے مجھے کہاں سے میسر آئیں گے۔ اب یہ سیر دو سیر موتیوں کی خریداری کا تصور ہی میرے تخیل کے لیے ناپید تھا۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ ہارون رشید نے ابتدائی تاریخوں کا چاند دیکھ کر کہا تھا کہ یہ سونے کا بجرا ہے جو آسمان کے سمندر پر تیر رہا ہے۔ اس کے درباری شاعر نے عرض کیا یا امیر المومنین! اگر میں نے سونے کا بجرا دیکھا ہوتا تو میں بھی یہ تشبیہ دے سکتا تھا۔ یعنی تخیل کتنا ہی دولت مند ہو، بنیاد کے لیے کسی حقیقت کی ضرورت ہے، اس زمین کو یقیناً تلاش کرنا پڑے گا جس پر کھڑے ہو کر وہ اپنی تخلیق کی پتنگ اڑائے گا۔ صرف خواب و خیال سے زندگی کی پیش کش نہیں ہو سکتی۔

راشد: قاضی صاحب! ناولوں کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ افسانوں سے متعلق بھی کچھ ایسی باتیں کی جائیں جن کا تعلق آپ کے ذاتی تجربے سے ہو۔ آپ کے بہت سے افسانوں کو پڑھنے کے دوران یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں آپ نے اپنی زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو پیش کر دیا ہے۔ مثلاً آپ کے مشہور افسانوں میں رضو باجی اور پیتل کا گھنٹہ میں اس کیفیت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کیا ان افسانوں میں آپ نے واقعی اپنی زندگی کے تجربات کا بیان کیا ہے، یا پھر تخیل کی ہنر مندی کے سبب ان افسانوں میں حقیقت کی لازوال تصویریں پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

قاضی عبدالستار: بھئی، پیتل کا گھنٹہ تو واقعہ ہے جس پر افسانے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ قاضی انعام حسین اور دادی ہر تعلوقے داری کی زوال میں مل جائیں گی۔ رضو باجی کسی کی حقیقی کہانی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ ''میں'' کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا تو وہ زیادہ قابلِ قبول ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ اس نے دیکھا تھا۔ اس لیے میں نے میں کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن یہ میری کہانی نہیں ہے۔ میں نے عشق پر کہانیاں لکھی ہی نہیں۔ دو ایک ناولوں میں اس کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں،

لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں عشق کی کہانیاں لکھ ہی نہیں سکتا۔ اپنے ناولوں اور افسانوں میں میں عشق کی کہانیاں لکھ ہی نہیں پایا۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ مجھے اپنی ماں اور اپنے بچوں کا سامنا کرنا ہے، میں ان کی نظروں میں سبک ہونے پر رضامند نہیں۔ اب جیسے ''مالکن'' ہے وہ میرے گھر کی کہانی نہیں، لیکن دور دراز کے خاندان کی کہانی ہے جسے میں نے پیش کر دیا ہے۔ میں عشق پر کہانیاں لکھ ہی نہیں سکتا۔

راشد: ادبی مباحث کے سلسلے میں انانیتی ادب کے متعلق گفتگو بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ادب انکساری تو ضرور سکھاتی ہے، لیکن انانیت کا درس بھی دیتی ہے۔ وہ انانیت جو خود کی شناخت کے مثبت پہلو سے منسلک ہو۔ اگر ادیب و شاعر اس جذبے سے سرشار نہیں ہے تو وہ ادب کی تخلیق کیسے کرے گا، خاص طور پر اس ادب کی جس کے مستحکم نقوش دلوں پر ثبت ہو سکیں۔ اگر ایک ادیب چاہتا ہے کہ دنیا اس کی اہمیت تسلیم کرے تو سب سے پہلے اسے خود اپنی اہمیت سے واقف ہونا پڑے گا۔ اگر وہ انکساری میں اپنے آپ کو سب سے کم تر ظاہر کر رہا ہے تو دنیا کیسے اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گی۔ لہٰذا انانیت کا ہونا ناگزیر ہے۔ ہاں وہی انانیت جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو خود پسندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تکبر اور گھمنڈ آ جاتا ہے جو کہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ انا اور انانیت کا جذبہ چوں کہ آپ کے مزاج میں بھی لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہے، اس لیے آپ ذرا تفصیل سے بتانے کی زحمت کریں کہ انا اور انانیت کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں اور ادب میں اسے کس زاویے سے دیکھا جانا چاہیے۔

قاضی عبدالستار: بعض کم پڑھے لکھے لوگ انانیت کے صحیح معنی نہیں جانتے اور اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اردو ادب میں سب سے بڑے انانیتی ادیب ابوالکلام آزاد ہوئے ہیں۔ جامع مسجد پر جو تقریر انھوں نے کی وہ انانیتی ادب کی بہترین مثال ہے۔ ہر تخلیقی فن کار میں انا ضرور ہوتی ہے۔ اس کا سبب ہے۔ جو کچھ لکھا

جا رہا ہے اگر وہ اس سے مطمئن ہے تو وہ کیوں لکھے گا، کیوں پڑھے گا۔ وہ قلم اس وقت اُٹھائے گا جب وہ یہ طے کرے گا کہ یہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے، کم تر ہے۔ میں اس سے بہتر لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا۔ انانیت صرف ادیبوں میں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ شیر، ہاتھی اور طاؤس کی انانیت مشہور ہے۔ شیر اپنے حدود میں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتا۔ ہاتھی جب اپنی مادہ کے قریب ہوتا ہے اور کوئی انسان پہنچ جائے تو اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ طاؤس سب سے اونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بسیرا کرتا ہے اور جب چنگھاڑتا ہے تو پورا جنگل لرز اُٹھتا ہے۔ جناب راشد صاحب آپ نے پہلی غزل اس وقت کہی ہوگی جب آپ نے اپنے ہم عمروں کی سنی ہوئی غزلوں سے بہتر کہنے کا حوصلہ محسوس کیا ہوگا۔ یہ سب کیا میں غزل کہوں گا۔ ''میں'' کا کثیر استعمال غلط ہے، لیکن میں کا استعمال صحیح ہے۔ میدانِ جنگ کا رجز کیا ہوتا ہے، انانیت کی بہترین مثال ہوتا ہے۔ سیف اللہ خالد نے میدانِ جنگ میں فرمایا موت میری تلوار کا لقب ہے، فتح میرے گھوڑے کی جھپٹ کا خطاب ہے۔ یہ میدانِ جنگ کا رجز بھی ہے اور انانیتی ادب کی مثال بھی۔ انکساری اور خاکساری اچھی چیز ہے، لیکن موقع اور محل کے لحاظ سے اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ میدانِ جنگ میں فوجیں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک شخص رجز پڑھتا ہوا نکلتا ہے۔ مخالف فوج سے بھی دوسرا شخص نکلتا ہے۔ دونوں اگر خاکساری اور انکساری کا اظہار کرنے لگیں کہ حضور پہلے آپ، وہ کہے کہ نہیں حضور پہلے آپ تو اس کا قوی امکان ہے کہ دونوں کے سپہ سالار دونوں کی گردنیں اُڑا دیں۔ تو جناب راشد صاحب انانیت ایک بہت اہم تخلیقی اور مقدس جذبہ ہے جسے تخلیق ادب میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

راشد: قاضی صاحب! افسانے اور ناول کی تخلیق میں مختلف مراحل ایسے آتے ہیں جب کسی دوسرے کا متن اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے ضروری محسوس

ہوتا ہے۔ بیشتر ادیب اپنی تحریروں میں ایسے متن کا بلا جھجک استعمال کر لیتے ہیں جو ان کے مخصوص خیالات کی ترجمانی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ افسانے میں تو اس کی گنجائش ذرا کم ہی ہوتی ہے لیکن ناول میں تفصیل اور طوالت کے باعث اس کی خاطر خواہ گنجائش ہوتی ہے کہ مخصوص فضا خلق کرنے کے لیے کوئی لوک گیت، کوئی نظم جو موقع سے یاد آجائے، اسے موقعے کی مناسبت سے تحریر میں فطری طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی بہت سے ناول ایسے لکھے ہیں جہاں ایک مخصوص فضا کی ترجمانی کے لیے ایسے متون کے استعمال کی خاطر خواہ گنجائش رہی ہے، خاص کر آپ کے جتنے ناول دیہی ماحول اور زمین دارانہ معاشرے کی ترجمانی کرتے ہیں، ان میں اس نوعیت کے متون کی شمولیت کی گنجائش ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں آپ اپنے خیالات سے واقف کرائیں کہ ایسے موقعوں پر آپ نے کب اور کس طرح دوسرے متون کو شامل کیا ہے۔

قاضی عبدالستار: راشد صاحب یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے اور یہ بات میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی افسانے، کسی ناول میں، کسی شاعر کا کوئی گیت، کوئی نظم نقل نہیں کی۔ وہ داراشکوہ ہو یا صلاح الدین ایوبی یا خالد بن ولید میں سارے رجز میرے لکھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بادل ناولٹ میں جو اودھی کا گیت ہے وہ میرا لکھا ہوا ہے۔ آپ گیت بھی سن لیجیے:

اوئی لسکر پُر کے مالک بیٹھے ہیں
جون کریں باگھن سے ٹھکرائی
بادل کا بادل دھرے کاندھے پر
اور ہاتھ ماجھدھر جیسے چمکے بجری
انگریجن کے کیسے کیسے گھوڑا ہاتھی
کاٹ کے پھیکن

جیسے کھیرا اگکڑی
اب جب دیکھن گورے ان پر لو ہانا ہیں چلت
تب بکت موتت بھاگے بانس بریلی
اوئی لسکر پُر کے مالک بیٹھے ہیں
جون کریں باگھن سے ٹھکرائی

لکھنؤ میرے اعصاب پر سوار تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر علیم، پروفیسر نورالحسن (وزیر تعلیم) نے مجھے متاثر کیا، لیکن ظاہر ہے میں نے علی گڑھ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ میں اگر لکھتا تو ذرا سخت ہو جاتا، تلخ ہو جاتا، اس لیے میں نے نظر انداز کر دیا۔

راشد: آپ کا بیشتر تخلیقی سرمایہ ماضی کی بازیافت پر مشتمل ہے۔ اپنے فن میں تخیل کی آمیزش کرنے کے بجائے آپ نے ماضی کے مشاہدات اور تجربات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا تخلیقی عمل میں ماضی کا دخل اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر تخلیقی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکے۔

قاضی عبدالستار: یقیناً ماضی کے بغیر زندگی اور تخلیقی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ماضی، حال اور مستقبل کو تقسیم کریں تو مستقبل دیوانے کا خواب ہے، اور حال ایک خیال ہے۔ جب حال اتنا لمحاتی ہوتا ہے تو پھر بچا کیا، ماضی ہی بچا اور میرے ہی یہاں کیا، دنیا کا کون بڑا رائٹر ہے جو ماضی سے اپنے آپ کو بچا سکا ہے۔

راشد: آپ ناول کے بے مثل فن کار ہیں، لیکن آپ نے کئی یادگار افسانے لکھ کر بھی اردو افسانے کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ ناول اور افسانے میں کون سی صنف آپ کے مزاج سے زیادہ میل کھاتی ہے۔

قاضی عبدالستار: دونوں اصناف مجھے پسند ہیں۔ یہ اصل میں موضوع کا مسئلہ ہوتا ہے۔ بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ ہی لکھا جا سکتا ہے، ناول نہیں۔ بعض موضوعات اتنے بڑے ہوتے ہیں، اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ

نہیں لکھا جا سکتا، ناول ہی لکھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں میں ناول کی صنف میرے مزاج سے زیادہ میل کھاتی ہے۔ اب میرے مزاج سے خاموشی زیادہ میل کھاتی ہے۔ میں اب تھکنا نہیں چاہتا۔

راشد: آپ نے تاریخ کو فکشن اور فکشن کو ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ تاریخی ناول لکھنے کے لیے ناول نگار کو فکشن کی کتنی آزادی حاصل ہوتی ہے اور مختلف نوعیت کی بندشیں اس کی راہوں میں کس طرح حائل ہوتی ہیں۔

قاضی عبدالستار: تاریخ پر ایمان داری کے ساتھ ناول لکھنا بہت مشکل ہے۔ میں نے اپنے ناولوں کے لیے کہا ہے کہ میں ہر سطر کے لیے تاریخ کے سامنے جواب دہ ہوں۔ مشکل اس لیے ہے کہ ناول میں تخیل بے لگام ہو سکتا ہے، لیکن تاریخ میں نہیں۔ تاریخ، تاریخی کردار قدم قدم پر اپنی شہرت و مقبولیت کے ساتھ قلم کو زنجیر بھی پہناتا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جس عہد کی تاریخ پر ناول لکھا جا رہا ہے، لباس، ہتھیار، آداب، تہذیبی پیچ وخم سب کچھ اس عہد کے مطابق ہونا چاہیے۔ یعنی ہزار سال کی گزرتی ہوئی تاریخ کو دوبارہ خلق کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جہاں تک سوال کا دوسرا حصہ ہے، میں نے تاریخ کو فکشن نہیں بنایا۔ تاریخ کو تاریخ ہی رہنے دیا اور ناول لکھا اور اس ٹھاٹ سے لکھا کہ جو شخص ناول کے پہلے صفحے کو پڑھ لے گا وہ آخری صفحے تک پڑھتا چلا جائے گا۔ یعنی ناول کی قرأت کی دلچسپی کا تعلق میرے اسٹائل سے ہے یا میری پیش کش سے ہے۔ ایک اور صاحب نے بھی لکھا تھا (خالد اشرف یا ہمایوں اشرف) کہ قاضی صاحب تاریخ کو خلق کرتے ہیں، پھر ناول لکھتے ہیں۔ ان سے میری ملاقات نہیں ہے لیکن اب میں انھیں سے مخاطب ہوں کہ میرے چار تاریخی ناول ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک تاریخی واقعہ وہ بیان فرمائیں جو میں نے خلق کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تاریخ پر لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ مجھ سے سوال کریں کہ کیا ضرورت ہے۔ میرے قلم کو ضرورت ہے،

میری پسند کو ضرورت ہے، میری تخلیقیت کو ضرورت ہے۔ میں صرف ان کے سامنے جواب دہ ہوں، ایک بات۔ دوسری بات میرے ہر ناول کے بین السطور میں آج ہی کی بڑی بڑی problems ہیں جنھیں تاریخ کی قبا پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو مصنف معذور ہے۔

راشد: آپ کے افسانوں میں رضو باجی، پیتل کا گھنٹہ اور طویل افسانہ مجو بھیا کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور افسانے ہیں جنھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا آپ نے اپنی زندگی کے حقیقی واقعات، بھرپور تاثر کے ساتھ قلم بند کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنے تاثرات سے نوازیں۔

قاضی عبدالستار: یہ سچ ہے کہ میرے فکشن میں میری اپنی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، لیکن ہر افسانے اور ہر ناول میں نہیں۔ مثلاً غبارِ شب جس کے لیے وارث علوی اور باقر مہدی دونوں نے لکھا ہے کہ یہ اردو کا پہلا علامتی ناول ہے، تو ایسا نہیں ہے کہ سب کچھ میری زندگی کا ہے، میرا مشاہدہ بھی ہے۔ مطالعہ نہیں مشاہدہ ہے۔ حیات اللہ انصاری جب راجیہ سبھا کے ممبر تھے تو ایک محفل میں ملے اور فرمایا کہ آپ دلّی آتے ہیں، میرے پاس کبھی نہیں آتے۔ اس وقت وہ ویسٹرن کورٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں ملنے گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا میں نے آپ کے تاریخی ناول پڑھے۔ بہت اچھے ہیں، قابلِ فخر ہیں، لیکن کوئی قاضی عبدالستار پیدا ہو سکتا ہے وہ ''خالد بن ولید'' اور ''صلاح الدین ایوبی'' اور ''داراشکوہ'' اور ''غالب'' لکھ سکتا ہے لیکن اب کوئی قاضی عبدالستار پیدا نہیں ہوگا جو ''پہلا اور آخری خط'' لکھے، ''شب گزیدہ'' لکھے، ''مجو بھیا'' لکھے اور ''غبارِ شب'' لکھے۔ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اودھ پر اور لکھیے۔ اودھ پر کسی نے نہیں لکھا اور لکھ بھی نہیں سکتا۔ صرف آپ لکھ سکتے ہیں اور لکھیے۔ میں نے پوچھا انصاری صاحب ساری شادیاں اودھ میں گرمیوں میں کیوں ہوتی تھیں۔ ہندوؤں کے یہاں بھی، مسلمانوں کے یہاں بھی۔ سوچتے رہے، سوچتے رہے،

پھر بولے آپ ہی بتایئے۔ میں نے کہا گرمیوں میں چیت کی فصل کٹتی ہے، جیبیں بھری ہوتی ہیں، ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر خاندان میں غریب عزیز بھی ہوتے ہیں۔اب گرمیوں میں شادی ہوئی۔آج سے کچھ پہلے کے زمانے میں، میرے لڑکپن میں ایک شخص نے پانچ روپیہ قرض مانگے۔ دوروپے میں کرتا پائجامہ بنایا، جوعمدہ بنتا تھا۔ایک روپیہ بارہ آنے کا جوتا خریدا، (آج کی نسل کے لیے یہ بیان ناقابلِ یقین ہے) ایک روپیہ کرایے کا رکھا، ایک روپیہ نیوتے کا دیا۔ تین دن سیر ہوکر پلاؤ زردہ کھایا اور جب چلنے لگا تو صاحبِ خانہ نے دس پانچ روپے کا حساب کردیا۔اب اگر یہی شادی جاڑوں میں ہوتی تو بے چارہ غریب آدمی کیا کرے۔ شیروانی ہے تو جوتے نہیں، جوتا ہےتو موزہ نہیں ہے، کیسے شریک ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ تعلقے داروں اور زمین داروں کے یہاں ہمیشہ اگر بارات ایک ہزاری آرہی ہےاور جناتی بھی ایک ہزار ہیں تو کھانا تین ہزار کا پکے گا۔ یہ شان تھی کہ دیگوں کے دیگیں بچ جاتی تھیں، اور وہ غریبوں میں لٹا دی جاتی تھیں۔ جاڑے ہوتے تو باسی کھانوں کی خواہش ہوتی۔ گرمیوں میں ممکن نہیں ہے۔اس زمانے میں فریج بھی نہیں تھا۔ اس لیے تمام شادیاں گرمی میں ہوتی ہیں۔انصاری صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔
کہنے لگے کہ پوری شادی بیان کیجیے۔ میں نے کہا کسی اور وقت کروں گا۔

راشد: افسانے میں استعمال ہونے والی زبان، کیا ناول میں استعمال ہونے والی زبان سے مختلف ہوتی ہے، یا پھران دونوں میں کوئی فرق قائم نہیں ہوتا۔آپ اسے کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: دیکھیے افسانے سے متعلق میرا ہی جملہ ہے کہ افسانہ چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا آرٹ ہے۔کم سے کم الفاظ میں پوری بات واضح طور پر کہی جاتی ہے۔ناول کے بیانیہ میں اتنی سختی نہیں برتی جاتی۔ فلابیر کا مشہور قول ہے کہ تین صفحے کے ناول میں اگر چار صفحے (تین صفحے نہیں، چار صفحے) اگر نکال دیے جائیں اور ناول

برقرار رہے تو ناول دوئم درجے کا ہے، اور اگر تین صفحے کے افسانے میں تین سطریں نکال دی جائیں اور افسانہ برقرار ہے تو افسانہ دوئم درجے کا ہے۔ تو یہ تو فرق رہے گا۔ میرے مشہور افسانے اگر آپ نے پڑھے ہیں اور ناول پڑھ لیجیے تو میری بیان کی ہوئی بات کی وضاحت ہو جائے گی۔ ناول میں خطابت اور قوتِ بیان کا موقع ملتا ہے، افسانے میں نہیں۔ افسانہ تنی ہوئی رسّی پر نٹ کی طرح چلنے کا آرٹ ہے۔ ایک قدم غلط پڑا اور نٹ صاحب زمین پر۔ وہی حال افسانہ نگار کا ہے۔

راشد: ایک قاری اور ناقد کی حیثیت سے آپ اپنے ناولوں کا جائزہ لیں تو تاریخی ناول نگار کی امیج زیادہ مستحکم طور پر ابھرتی ہے یا پھر تہذیبی زوال اور زمین دارانہ معاشرت کی ترجمانی کرنے والا فن کار بھرپور تاثر کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار: اس کا جواب تو حیات اللہ انصاری کے جواب سے بیان میں ہو گیا۔ اس پر میں اپنے منہ سے کیا کہوں۔ آپ دیہات پر لکھے ہوئے میرے کسی ناول کا، اردو میں دیہات پر لکھے کسی ناول سے مقابلہ کر لیجیے، میری بات واضح ہو جائے گی۔ جہاں تک تاریخ کا مسئلہ ہے، شرر کی حیثیت تاریخی ہے۔ وہ ناول نہیں لکھ رہے تھے۔ وہ ناول کے واسطے سے مسلمانوں کی تسلی کر رہے تھے۔ ناول کے واسطے سے وہ مسلمانوں کے احساسِ کم تری کو دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ناول لکھا ہے جو ان سے قطعاً مختلف ہے۔ اس سلسلے میں قمر رئیس کا بیان موجود ہے جو انھوں نے ''نذر قاضی عبدالستار'' میں اپنے انٹرویو میں دیا ہے۔

راشد: حضرت جان اور تاجم سلطان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں وہ قاضی عبدالستار موجود نہیں ہیں، جن سے اردو دنیا واقف ہے۔ اس سلسلے میں آپ اپنے خیالات سے واقف کرائیں۔

قاضی عبدالستار: ان دونوں ناولوں کو بریکٹ کرنا ناعاقبت اندیشی اور ادب فراموشی ہے۔ حضرت جان شروع سے آخر تک سیکس پر بیان کیا گیا ناول ہے اور تاجم سلطان

ایک حکمراں ریاست کی اندرونی زندگی کی پیش کش ہے جس کا موازنہ اور مقابلہ عزیز احمد کی ''ایسی بلندی ایسی پستی'' سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت جان بے چارے کی کیا حیثیت۔ تاجم سلطان اردو کا پہلا ناول ہے جو کسی حکمراں ریاست کی زندگی کو پورے تام جھام اور شانِ شکوہ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

راشد: ادبی رسالوں میں آپ نے ''نقوش'' کا ذکر کیا جس کے ذریعے ادبی حلقوں میں ایک خاص ہلچل ہوا کرتی تھی۔ کچھ اور رسالوں کا ذکر کریں جن کے ذریعے ماقبل کی ادبی صحافت کا انداہ ہو سکے، یا ان رسائل کی نمایاں کارکردگی سامنے آسکے جس کی بنا پر کوئی مخصوص رجحان، تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور ادب کو بہر حال اس سے فائدہ پہنچا۔

قاضی عبدالستار: دیکھیے مجھ پر تحریکات وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ بڑا ادیب خود تحریک ہوتا ہے۔ پریم چند اور اقبال کو میں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اس لیے اگر آپ کو یہ توقع ہے کہ میں ''شب خون'' یا اس قبیلے کے دوسرے جرائد کا ذکر کروں گا تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ پاکستان میں ''نیا دور'' بھی نکلا ہے، کراچی سے ''سیپ'' اور ''فنون'' جیسے رسالے بھی نکلے ہیں جنھوں نے قابلِ قدر خدمت کی ہے، لیکن ان کا معیار ہمارے یہاں نکلنے والے رسالوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس طرف ہندوستان میں پٹنہ سے ''آمد'' کی آمد کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس رسالے میں وہ شان ہے کہ جو صرف ادب کے بوتے پر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس رسالے کی ایک سطر بھی امریکہ یا برطانیہ یا اسرائیل کے احکامات کی تعمیل نہیں ہے۔ اس لیے اس رسالے اور اس جیسے دوسرے رسالوں کا میں احترام کرتا ہوں۔ جیسے ''تحریر نو''، ''نیا ورق'' وغیرہ۔ میں ''ادب ساز'' کا بھی لحاظ کرتا ہوں، لیکن اس طرف وہ ذاتی پرستش کے شکار معلوم ہوتے ہیں، اس لیے میں ان کا نام حذف کرتا ہوں۔

راشد: قاضی صاحب! مقبولیت جس کے حصے میں آتی ہے اسے مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پوری اردو دنیا آپ کی پرستار تھی اور ہے۔ آپ کی مخالفت علی گڑھ میں تو مسلسل ہوتی رہی، لیکن کیا علی گڑھ کے باہر بھی ایسا کوئی سلسلہ دیکھنے کو ملا۔

قاضی عبدالستار: میں نے ''خالد بن ولید'' میں لکھا ہے ''جہاں شہرت و اقبال کی سواری اُترتی ہے وہاں حسد کے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔'' علی گڑھ کے صرف شعبۂ اردو میں ایک گروہ نے میری مخالفت کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عذیر، ڈاکٹر ظہیرالدین علوی، پروفیسر مسعود حسین خاں وغیرہ نے مجھے شفقت اور قربت دونوں عطا فرمائی۔ علی گڑھ خاص میں میری کوئی مخالفت نہیں ہوئی بلکہ مجھے محبت نصیب ہوئی۔ کسی دوسرے شہر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پٹنہ، ممبئی، حیدرآباد وغیرہ میں میں نے ایک لفظ بھی اختلاف کا نہیں پایا۔ ہاں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود اور اختر اورینوی کے پٹنے میں عابد رضا بیدار نے ایک جلسہ برپا کیا تھا۔ اس میں ایک صاحب زادے نے کچھ بدتہذیبی فرمائی تھی۔ تھوڑے دنوں بعد شمئل احمد نے مجھے بتایا کہ قاضی صاحب جس لڑکے نے آپ سے بدتمیزی کی تھی وہ ایک جلسے میں جوتوں سے پیٹا گیا۔ میں نے کہا اس خبر سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ پٹنے والے سے ہمدردی ہے۔
ایک بات اور، یہ عام بات ہے کہ ہر شخص کو ہر کتاب پر اعتراض کرنے کا حق ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اعتراض کرنے والے نے کچھ پڑھا ہے، کچھ لکھا ہے، یا درجن بھر کتابوں کے مصنف پر بے ادبی اور بدتہذیبی کی سنگ باری کے شوق میں مبتلا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اشد: اپنے ہم عصروں میں آپ کس فکشن رائٹر سے زیادہ متاثر ہوئے اور کیوں؟ ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ اپنے ہم عصروں میں آپ کس فکشن نگار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کیوں؟

قاضی عبدالستار: میں آل عبا آوارہ صاحب کے علاوہ اردو میں کسی سے متاثر نہیں ہوں اور میری تحریر اس کا ثبوت ہے۔ ہاں عالمی ادب میں میں ٹالسٹائی کا عاشق ہوں اور ٹالسٹائی کو دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار مانتا ہوں، اور یہ حسرت رہی کہ کاش میں بھی ''وار اینڈ پیس'' جیسی کوئی کتاب لکھ سکتا۔ ہم عصروں میں ایک پوری بھیڑ ہے۔ ایک دو نہیں ہیں، نصف درجن کے قریب نام ہیں، لیکن میں کسی سے بھی متاثر نہیں ہوں الحمدللہ۔

راشد: موجودہ عہد کو فکشن کا عہد کہا جاتا ہے۔ آپ معتبر فکشن نگار کے ساتھ اردو شاعری کے عاشق بھی ہیں۔ کیا بڑے ادب کی تخلیق اب شاعری میں ممکن نہیں۔

قاضی عبدالستار: جناب والا میں نجومی نہیں ہوں، لیکن ہندوستان کے جو قرائن ہیں، جس طرح نسلیں فارسی اور عربی سے نابلد اردو میں آرہی ہیں، ان سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کوئی جوشؔ و فراقؔ بھی پیدا نہیں ہوگا اردو میں۔ بڑی شاعری کے لیے فارسی پر نظر ہونا ضروری ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج کا اردو شاعر، ہندی کی شاعری، بنگلہ کی شاعری، مراٹھی کی شاعری وغیرہ سے کسبِ نور کرسکتا ہے، لیکن ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ برخلاف اس کے کہ اردو افسانہ اور ناول دونوں ہندی افسانے اور ہندی ناول سے کسبِ فیض کر رہے ہیں۔ ایک بات اور۔ ہندی شاعری اتنی ثروت مند نہیں ہے کہ جو اردو شاعری کو کچھ دے سکے، لیکن ہندی کا فکشن اتنا دولت مند ہے کہ وہ اردو کو کچھ دے سکتا ہے۔

راشد: قاضی صاحب! ادبی زندگی کا کوئی ایسا انوکھا واقعہ سنائیں جو اب تک آپ کے ذہن سے محو نہیں ہو پایا۔

قاضی عبدالستار: دو چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ میرا پہلا ناول ''نقوش'' نے پورا شائع کیا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ چھپی ہوئی چیزیں نہیں چھاپتا تھا، لیکن میرا ناول محمد طفیل نے شائع کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اسے پڑھا اور نقوش کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ محمد طفیل نے جواب دیا یہ جوشؔ کے قبیلے کے

صاحب زادے ہیں۔ میں آپ کا خط ان کو بھیجے دیتا ہوں۔ آپ خود سوال کیجیے۔ جوش کا ذکر انھوں نے اس لیے کیا کہ نقوش میں جو پہلی تصویر جوش کی شائع ہوئی، اس میں وہ فیروزی ہیمرو (ایک قیمتی حیدرآبادی کپڑا) کی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میں نے جو تصویریں بھیجیں اس میں ایک ہیمرو کی شیروانی میں تھی اور ایک جامہ دار میں۔ طفیل نے ہیمرو والی تصویر شائع کی۔ قرۃ العین حیدر کا خط آیا۔ مجھے بہت عجیب لگتا ہے جب وہ لوگ جن کا قرۃ العین حیدر سے تعارف بھی نہیں ہوگا، کبھی ان سے تخاطب سے مشرف نہیں ہوئے ہوں گے، لیکن عینی آپا، عینی آپا کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ خیر وہ علی گڑھ تشریف لائیں۔ اتفاق سے سرور صاحب، جذبی صاحب اور خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب اور نسیم قریشی اور خاکسار موجود تھے۔ وہ سیدھی چیئرمین کی کرسی کے پاس یعنی سرور صاحب کے پاس گئیں اور پوچھا قاضی عبدالستار کون ہے؟ سرور صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ مجھ سے وہ بہت گرم جوشی سے ملیں۔ کسی سے مخاطب نہیں ہوئیں۔ مجھ سے صرف اتنا کہا میں امیر نشان میں جرار حیدر صاحب کی کوٹھی پر ٹھہری ہوئی ہوں، آپ پہلی فرصت میں وہاں تشریف لائیں، بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ میں شام کے ٹھیک پانچ بجے جرار حیدر کی کوٹھی پر پہنچ گیا اور گیارہ بجے رات تک باتیں کیں۔ جرار حیدر کی بیگم خود بھی ادب شناس تھیں اور قرۃ العین حیدر کی عزیزہ تھیں۔ ان کے بے حد اصرار پر میں نے کھانا بھی کھایا جو میرے مزاج کے خلاف تھا۔ یہ بات مجھے نہیں بھولتی۔ قرۃ العین حیدر جس طرح جوش و خروش اور لپک کر مجھ سے ملیں وہ آج بھی میرے لیے حیرت انگیز ہے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ پٹنہ سے ایک خط آیا۔ بہت موٹا لفافہ۔ غالب کے صد سالہ جشن کا دعوت نامہ بھی تھا اور بیگم شکیلہ اختر کا نامۂ گرامی بھی تھا جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ انھوں نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنالیا ہے، اور میں اپنی

آمد کی تاریخ اور ٹرین سے متعلق فوراً مطلع کروں۔ خیر میں کالکا سے گیا۔ جب اسٹیشن پر اُترا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ شکیلہ آپا، بھائی صاحب اختر اورینوی اور فضل میاں جو اس وقت ڈی آئی جی پولیس تھے، سب مجھے لینے آئے تھے۔ خیر گھر پہنچے۔ کھانے کی میز جو لگی تو معلوم ہوا دس بیس آدمی کھانا کھائیں گے۔ میز پر بیٹھے صرف تین آدمی۔ بھائی صاحب، آپا اور خاکسار۔ چھ قسم کا گوشت، پرندوں اور مچھلی سمیت رکھا ہوا تھا۔ دو قسم کا پلاؤ تھا۔ تین قسم کی شیرینی۔ آپا میرے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کان میں کہا۔ آپا میرا خسر بہت بڑا تعلوقے دار ہے، مگر اس نے ایسی میز میرے لیے کبھی نہیں لگائی۔ آپا بے حد خوش ہوئیں۔ کان میں کہا اس کو ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ صبح صد سالہ جشن کا پہلا جلسہ تھا۔ کلیم الدین احمد جو اس وقت وائس چانسلر تھے، قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، عبدالقادر سروری اور معلوم نہیں کون کون۔ اردو ادب کی پوری کہکشاں موجود تھی۔ پروفیسر اختر اورینوی کنوینر بھی تھے، مائک پر تشریف لے گئے۔ فرمایا، افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لیے میں قاضی عبدالستار کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اختر اورینوی اور دوسرے صاحبان نے فوراً تائید کی۔ ہم کرسی پر بیٹھتے لرزتے کانپتے بیٹھے رہے۔ ہماری تقدیر سے جلسہ دیر میں ختم ہوا۔ جب ہم خطبۂ صدارت کے لیے گئے تو ہم نے بجائے خود تقریر فرمانے کے اعلان کیا کہ چوں کہ وقت کم رہ گیا ہے، اس لیے میں جلسے کے ختم ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ بہت تالیاں بجیں۔ یہ دو واقعات میں کبھی نہیں بھولتا۔ ایسی عزت اور شہرت مجھے کبھی نہیں ملی۔ اگر لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں تو بے چاروں کو کرنا چاہیے کہ ان کی مجبوری ہے۔ خدا مجھ پہ بہت رحیم و کریم ہے۔

راشد: آپ نے عصمت، بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر وغیرہ کو قریب سے دیکھا جو اردو فکشن کے نمائندہ دستخط ہیں۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت فن کار ان شخصیتوں کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔

قاضی عبدالستار: جناب راشد انور راشد صاحب، یہ جو نام نامی آپ نے لیے ہیں، ان میں سے قرۃ العین کو چھوڑ کر سبھی سے میری ملاقاتیں محدود رہیں۔ یہ لوگ میرے گھر تشریف لائے۔ میں نے چائے پلائی، یا کھانا کھلایا اور رسمی گفتگو ہوئی۔ اس لیے میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان کا قرب حاصل تھا۔ یہ تمام لوگ اپنے زمانے کے، اپنے زمانے کے کیا، مجموعی طور پر ادب کے مقبول اور مشہور لوگ تھے، نمائندہ فن کار تھے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کے بارے میں کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

راشد: جب آپ دیہی زمانے کی کہانیاں لکھتے ہیں تو علاقائی بولیوں پر آپ کی زبردست گرفت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن جب آپ تاریخی عہد کو فکشن میں نمایاں کرتے ہیں تو شاہانہ رعب اور جلال زبان سے اُجاگر ہوتا ہے۔ دیہی زبان تو دوسرے بھی لکھتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں، لیکن تاریخی فکشن میں جو زبان آپ لکھتے ہیں وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ زبان آپ کی دسترس میں کیسے آئی؟

قاضی عبدالستار: دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ دعویٰ نہیں ہے کہ ہیں، ہو سکتے ہیں۔ میرے دادا دسرکار قاضی فیاض علی پر لکھنؤ کی ایک نواب زادی جو بیگم سرکار کہی جاتی تھیں، عاشق ہوئیں اور خاموشی سے نکاح بھی ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا وہ شیعہ تھیں اور مچھریٹہ جب آتی تھیں تو بڑی دھوم دھام سے محرم کے مراسم ادا فرماتی تھیں۔ اس وقت ان کے قریب صرف میں ہوتا تھا اور میں ان کی باتیں، ان کا غصہ، ان کا مذاق سب سنتا رہتا تھا اور حیرت زدہ بیٹھا رہتا تھا۔ اس لیے کہ ویسی گفتگو کوئی نہیں کرتا تھا مچھریٹہ میں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میری عمر پانچ چھ برس تھی۔ پھر لکھنؤ میں وہ مجھے تھوڑے دنوں کے لیے لے گئیں اور اپنے پاس رکھا۔ ایک سبب یہ ہو سکتا ہے۔ دوسرا سبب ہو سکتا ہے میرا مطالعہ۔ میں نے داستانیں بھی پڑھی ہیں، ابوالکلام آزاد کو بھی پڑھا ہے، محمد حسین آزاد کو بھی پڑھا ہے۔ پڑھنے سے

میری مراد ہے گھول کر پی لیا ہے اور تاریخ کا میرا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ شاید اس لیے خدا نے مجھے یہ زبان عطا فرمائی۔

راشد: عام طور پر فکشن رائٹر کو یہ شکایت رہی ہے کہ فکشن تنقید کے بنیادی اصول وضع ہی نہیں کیے گئے جس کی بنا پر فکشن کا بہتر محاسبہ نہیں ہو پایا۔ افسانے اور ناول کو پرکھنے کے لیے بھی شعری تنقید کے اصول کو ہی کام میں لایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بحیثیت فکشن رائٹر آپ کا کیا ردِ عمل ہے؟

قاضی عبدالستار: آپ کے سوال ہی میں آپ کے سوال کا جواب پنہاں ہے۔ یہ بات صدفی صد درست ہے کہ شاعری کی تنقید کے اوزاروں سے ہی فکشن کا محاکمہ کیا جاتا ہے۔ اگر نقاد حضرات خفا نہ ہوں اور شاعر حضرات مجھے معاف کریں تو میں کہوں کہ بھوسے کی ترازو سے جواہرات تول رہے ہیں۔ اب تک فکشن کا کوئی باقاعدہ نقاد پیدا ہی نہیں ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فکشن پر اچھی تنقید لکھی ہے لیکن غیر معمولی نہیں لکھی۔ گوپی چند نارنگ نے بڑے انتخابات شائع کیے لیکن پچاس صفحے ایسے نہیں لکھ سکے کہ آدمی کو میر و غالب کی تنقید یاد آ جائے۔ اسی ہنگامے میں وارث علوی پیدا ہوئے۔ انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر فکشن کا میدان انتخاب کیا، اس تصور کے ساتھ کہ میں فکشن پر تنقید لکھ کر لافانی ہو جاؤں گا لیکن اگر وہ ناخوش نہ ہوں (اس انٹرویو کے دوران وارث علوی زندہ تھے) تو میں بہت ادب کے ساتھ عرض کروں کہ میں جب ان کو پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پنڈلی پر کلیجی باندھ کر ایوانِ ادب کی سیڑھیوں پر کھڑے شہرت اور مقبولیت کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کا تنقیدی شعور بھی قابلِ قدر ہے۔ آپ کے مطابق فکشن کو پرکھنے کے لیے کیا tools استعمال کیے جانے چاہئیں۔ یعنی فکشن تنقید کے اصول وضوابط کیا ہوں جس کی روشنی میں فکشن تنقید کو بہتر طور پر پرکھا جا سکے۔

قاضی عبدالستار: آپ کے اس سوال کے جواب کا میں اہل نہیں ہوں، ٹوٹا پھوٹا فکشن تو لکھ لیتا ہوں لیکن اس سوال کا جواب وہ Genius دے سکتا ہے جس نے داستانوں سے لے کر حسین الحق تک کو پڑھا ہو اور دریا ساگر کی طرح اپنے علم کو ہضم کیا ہو، اور ہریش چندر کی طرح انصاف کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔

راشد: آپ کے فکروفن کے حوالے سے ادب کی مقتدر شخصیتوں نے جم کر لکھا ہے اور ''نذر قاضی عبدالستار'' (مرتبہ پروفیسر غیاث الدین) میں انھیں سلیقے سے شائع کر دیا گیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ فکشن کے پارکھوں نے جب آپ کے فن پاروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا تو ان کی کاوشیں آپ کو کس حد تک مطمئن کر پائیں۔ قرۃ العین حیدر کو تو ہمیشہ ہی یہ شکایت رہی کہ ناقدوں نے ان کے فن کو سمجھا ہی نہیں۔

قاضی عبدالستار: خیر میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ناقدوں نے مجھ فقیر کو سمجھا ہی نہیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے پڑھنے میں بہت عجلت فرمائی گئی۔ مثلاً تاجم سلطان میں تاجم سلطان کو خوش دامن نے پان میں زہر دیا اور وہ مرگئی۔ کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کوئی سمجھ ہی نہیں پایا۔ اس کا سبب عجلت میں میرے ناولوں کو پڑھنا ہے۔ میں کیا، کسی کی تحریر بھی اگر عجلت میں پڑھی جائے تو بنیادی باتیں گرفت میں نہیں آئیں گی۔ خالد بن ولید، مالک بن نویرا کی منگیتر سے متاثر تھے۔ میں نے بہت احتیاط اور اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ ایک نقاد نے مالک بن نویرا کی منگیتر کے بجائے ہندہ کا نام اس طرح لیا گویا کہ خالد بن ولید ہندہ سے متاثر تھے۔ اس کا سبب ہے۔ تنقید نگار خود اپنی تنقید سے مخلص نہیں ہوتے۔ پانچ برس پہلے ناول پڑھا ہے۔ اب لکھنے بیٹھ گئے۔ حافظہ چکمہ دینے لگا۔ مجھ پہ کئی لوگوں نے لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ اب میں فرداً فرداً سب کا نام تو نہیں لے سکتا۔ ہاں ایک نام کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ میرے عزیز شاگرد غیاث الدین نے

نہ صرف کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ جو مضامین مجھ پہ لکھے وہ قابلِ قدر ہیں۔ عجیب بات ہے اس کتاب میں مجھ پر بہترین مضامین ایک پروفیسر نصیر احمد خاں کو چھوڑ کر جتنے لکھے گئے، سب بہار کے لکھنے والے تھے، یہ عجیب بات ہے۔

راشد: قرۃ العین حیدر سے آپ کے معاشقے کی خبر بھی ایک زمانے میں خوب گردش کرتی رہی۔ آپ ایمان داری سے یہ بتائیں کہ اس خبر میں کوئی سچائی تھی یا پھر بعض لوگوں نے آپ کی امیج مسخ کرنے کے لیے یہ افواہ اُڑائی تھی۔

قاضی عبدالستار: ۱۹۵۵ء میں یونین ہال میں ایک سمینار ہوا تھا۔ میں نے اس میں قرۃ العین حیدر پر مضمون پڑھا تھا، جسے سن کر سب سے پہلے اولاد احمد صدیقی (پروفیسر آل احمد سرور کے برادرِ خورد) نے مجھ پر الزام لگایا کہ آپ کی تحریر سے عشق کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے بہت توبہ تِلّا کی لیکن وہ چٹ پٹا جملہ بہت دیر تک اور دور تک اپنا خراج وصول کرتا رہا۔ پھر قرۃ العین حیدر جب علی گڑھ آئیں اور بہت اہتمام کے ساتھ جرار حیدر کے گھر لے گئیں اور کئی دنوں تک گھنٹوں باتیں کرتی رہیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ایک بار قرۃ العین حیدر سیتاپور تشریف لے گئیں اور میرے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین احمد ایڈووکیٹ سیتاپور کے ساتھ مچھریٹہ تشریف لے گئیں اور میرے چچا قاضی محمود علی رئیس مچھریٹہ سے بھی میرے بارے میں گفتگو کی۔ ان باتوں نے بھی اس احمقانہ خیال کی تبلیغ کی، لیکن سچائی یہ ہے کہ میں ان کے قلم کا عاشق ہوں، ان کے بدن کا نہیں۔ پہلے بھی میں ان کے قلم کا عاشق تھا، آج بھی ہوں۔ باقی جو ہے سب خرافات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے میرے بارے میں میرے ماموں صاحب اور میرے چچا جان سے جو گفتگو کی اس کی حیثیت ایک طرح کی ستائش ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں ان کا احترام کرتا تھا، اتنا احترام میں نے اپنے زمانے کے کسی ادیب کا نہیں کیا۔

۷۹-۱۹۷۸ء میں مجھے اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کی کتابوں کی اشاعت کے لیے گرانٹ مقرر کرتی ہے۔ اس کے چیئرمین چمن صاحب تھے جو شاید وزیر دفاع تھے یا وزیر خارجہ تھے۔ جلسہ ہوا، چمن صاحب نے فرمایا کہ ہر زبان کے ادیب کو حد سے حد ایک لاکھ روپیہ دیا جا سکتا ہے۔ ہندی کے کسی ادیب کو ۸۰ ہزار دیا گیا۔ مراٹھی کے ادیب کو بھی ایسے ہی دیا گیا۔ جب مجھ سے انھوں نے پوچھا تو میں نے بہت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ جنابِ والا قرۃ العین حیدر اردو کی سب سے بڑی ادیبہ ہیں اور ان کی کتاب بہت ضخیم ہے، اور ان کو کوئی پبلشر ایسا نہیں ملتا جو ایک بڑی رقم کے بغیر یہ کتاب شائع کر سکے۔ اس لیے جنابِ والا سے میری گزارش ہے کہ ایک لاکھ روپیہ منظور فرمایا جائے۔ میرے لہجے سے جو خاصا خوشامدانہ تھا، اور جو میرے لیے خاصا اجنبی بھی تھا، چمن صاحب متاثر ہوئے اور فرمایا قاضی صاحب ایک لاکھ روپیہ میں نے کسی کو دیا نہیں ہے تو میں نے عرض کیا کہ جنابِ والا یہ تو بالکل میرا حق نہیں ہے۔ میں تو صرف گزارش کر رہا ہوں۔ اگر جنابِ والا اسے منظور فرما لیں تو احسان ہوگا۔ چمن صاحب نے ایک لاکھ روپیہ منظور کر دیا۔ میں نے کبھی قرۃ العین حیدر سے اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ میرا طریقہ نہیں ہے لیکن انھیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ خوش ہوئی ہوں گی۔ دوسروں نے اس پر حاشیے چڑھا لیے۔

راشد: قاضی صاحب! آل احمد سرور اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے جب بھی آپ کے اختلافات شدت اختیار کر گئے تو آپ نے یہ کہہ کر ان دونوں کو نظر انداز کیا کہ شاعری کو میں دوئم درجے کی اور تنقید کو سوئم درجے کی چیز سمجھتا ہوں۔ یہ تو خیر وقتی ردِ عمل ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ تمام فنونِ لطیفہ میں شاعری کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے، لیکن آپ یہ بتائیں کہ تنقید کیا ادب کی تفہیم میں کوئی رول ادا نہیں کرتی۔

قاضی عبدالستار: جہاں تک شاعری کا سوال ہے، میں شاعری کے خلاف نہیں ہوں۔ نہ تھا، نہ ہوں، نہ ہو سکتا ہوں۔ معلوم نہیں تنہائی کی کتنی راتیں جس شخص نے غالب،

اقبال، انیس اور میر کے شعر پڑھتے پڑھتے گزاری ہوں، وہ آدمی شاعری کی نفی کیسے کر سکتا ہے۔ ہاں میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر آل احمد سرور کی شاعری کو اوسط درجے کی شاعری کہتا ہوں اور قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہ یاد رکھیے کہ ہندوستان میں اردو کے جو حالات ہیں، اسے مدنظر رکھتے ہوئے، نجومی نہ ہونے کے باوجود، ایسا کہا جا سکتا ہے کہ اب کوئی انیس و اقبال، میر و غالب تو کیا، جوش اور فراق بھی پیدا نہیں ہوگا۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں ''آمد'' پڑھ رہا تھا۔ کچھ شاعروں کی غزلوں کے کچھ اشعار اچھے لگے تھے لیکن کچھ شاعروں کے کچھ اشعار۔ ایک بات اور، شعر کی پہلی تعریف یہ ہے کہ اسے گایا جا سکے۔ کاکلِ کائنات کا کوئی پیچ وخم ایسا نہیں ہے جو نثر میں موجود نہ ہو۔ اسے بہ آواز بلند پڑھا جا سکتا ہے۔ دلوں پر قیامت بھی گزر سکتی ہے بہ آواز بلند پڑھنے سے۔ میں مثال دوں۔ میں بہت چھوٹا تھا، شاید آٹھ سال کا۔ میرے بابا میاں قاضی فرخند علی رئیس مچھریٹہ کے سالانہ فاتحے میں لکھنؤ کے قاری نے ''فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن'' ایسے درد سے پڑھا کہ میں ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔ یہ نثر کی تاثیر ہے۔ نثر کو بہ آواز بلند پڑھے جانے کی تاثیر ہے، لیکن اسے گایا نہیں جا سکتا کہ دلوں کے تار ہلنے لگیں۔ یہ صرف شاعری کا شرف ہے۔ جہاں تک تنقید کا سوال ہے، تمام نقادوں سے بہت ادب کے ساتھ دست بستہ معذرت کے ساتھ میرا ناچیز خیال ہے کہ ادب کو تنقید کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایشیائی ادب کے بہترین شاہکار اس وقت پیدا ہوئے جب تنقید نام کی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرے تھے اور تذکروں میں تنقیدی اشارے تھے۔ تو عرض ہے کہ جناب والا تذکرہ ہاتھ سے لکھا گیا اور اس کی چند جلدیں نقل کی گئی ہوں گی۔ چند ہادیوں سے ہاتھوں میں پہنچی ہوں گی۔ احتمال ہے کہ جن شاعروں کی تعریف اس میں ہوئی ہوگی ان شاعروں تک بھی وہ تحریر نہیں پہنچی ہوگی۔ اس لیے تذکروں کا ذکر اس سطح پر کرنا زیادتی ہے۔ ایک بات اور،

نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی سے ناخوش تھے۔ حیدرآباد کے نظر حیدرآبادی کو جوش کے مقابلے میں کھڑا کیا اور بڑے معرکے کے مضامین لکھے، لیکن کہاں ہیں نظر حیدرآبادی۔ ابھی سامنے کی بات ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی، قرۃ العین حیدر سے ناخوش ہیں، گوپی چند نارنگ، مشتاق احمد یوسفی سے ناراض ہیں، مگر قرۃ العین حیدر اور مشتاق احمد یوسفی تو اپنے اپنے مقام پر قائم ہیں اور قائم رہیں گے۔

راشد: قاضی صاحب! آل احمد سرور کی شاعری سے متعلق آپ کے خیالات سے تو اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری تو رد نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں اگر آپ کوئی منطقی توجیہ پیش کریں تو خوشی ہوگی؟

قاضی عبدالستار: پروفیسر آل احمد سرور کے بارے میں راہی معصوم رضا کا قول ہنسنے ہنسانے کے لیے بہت اچھا ہے۔ ممبئی میں مشاعرہ تھا۔ راہی معصوم رضا نظامت کر رہے تھے۔ مینا کماری جب مائک پر تشریف لائیں غزل پڑھنے کے لیے تو راہی نے کہا کہ مینا کماری صاحبہ کی غزل اور ہمارے استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور کی غزل کا ادبی معیار یکساں ہے۔ جہاں تک خلیل صاحب کا سوال ہے تو میں ان کو ایک مصرع کا شاعر مانتا ہوں —"ایک سے ایک ابو جہل ہے، کس کس سے لڑیں۔" ان کی نظموں اور غزلوں کو ان کے ہم عصروں کی نظموں اور غزلوں میں خلط ملط کر دیجیے، ناموں کو مٹا دیجیے، اس کے بعد آپ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کو نکال سکیں تو میں ان کو شاعر مان لوں گا۔ یہ تو سچ ہے کہ میری رائے میں کچھ تعصب ہے اور اگر وہ نہ ہوتا تو میں ولی اللہ ہوتا۔ مجھے اپنے تعصب سے کوئی انکار نہیں، مگر میرے نزدیک شاعری کی پہچان وہی ہے جو میں نے بیان کی۔

ر: آج جو لوگ ادب لکھ پڑھ رہے ہیں، ان میں سنجیدگی کے ساتھ محنت اور غور و فکر کے رجحان میں جو کمی آئی ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس رویے کی بنا پر شاعروں ادیبوں کا جو نقصان ہوا ہے وہ اپنی جگہ، ادب کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ صحافت اور ادب کی تفریق ہی مٹ گئی۔ شاعری کے ساتھ اب فکشن میں

بھی صحافیانہ زبان استعمال ہونے لگی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے تاثرات جاننے کا خواہش مند ہوں۔

قاضی عبدالستار: یہ قدر زمانے کی دین ہے۔ جب ہم پڑھتے تھے تو تفریح کے نام پر ہاکی اور فٹ بال کھیلتے تھے یا حضرت گنج کی چہل قدمی ہمارے معمولات میں شامل تھی۔ باقی وقت پڑھنے لکھنے میں صَرف ہوتا تھا۔ آج کی نسل ٹی وی کی نسل ہے بلکہ کمپیوٹر اور موبائیل کی نسل ہے اور ان تفریحات میں اتنی لذت ہے جس کے سامنے تخلیق ادب کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اپنے خوردوں کو دو دو بجے رات تک موبائیل پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے، تو آپ سوچیے کہ طالب علم کہاں تک متاثر نہیں ہوگا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ امتحانات میں نمبر لانے اور اپنا کیریئر بنانے کے شعور نے ابھی ہماری لائبریریز کو آباد کر رکھا ہے، لیکن یہ کب تک۔ معلوم نہیں کب ہمارے طالب علم اس عذاب سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ خدا کرے وہ دن میری زندگی میں نہ آئے۔ میں تو بدنام ہوں کہ میں زبان پر بہت زور دیتا ہوں۔ آپ نے صحافت کا جو ذکر کیا ہے اور ادب کے درمیان خطِ فاصل قائم کی ہے، یہ بہت منحنی ہے۔ بہت سے ادیبوں کی زبان، ناول کی زبان، تنقید کی زبان، مشہور اخباروں کے اداریوں سے کم تر ہوتی ہے۔ اس کا سبب ہے جو تھوڑا سا بیان ہو چکا ہے۔ زبان کلاسیکس (classics) کو پڑھنے کے بعد آتی ہے۔ زبان سیکھنے کے لیے داستانوں کو پڑھیے۔ میر امن، رجب علی بیگ سرور، سرشار، محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کو پڑھیے۔ اگر آپ نے ان کو نہیں پڑھا ہے تو آپ کو زبان پر کبھی قدرت نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب وشاعر، رات میں لکھتے ہیں اور صبح اشاعت کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ میں بہت معمولی، چھوٹا سا ادیب ہوں، لیکن صرف ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ میں ''غالب'' لکھ رہا تھا اور میں یہ منظر بیان کرنا چاہتا تھا کہ غالب کی محبوب ایک بُرج میں لیٹی ہے جو پانی کے اندر بنا ہوا ہے

اور اس کے بال پانی پر پڑے ہوئے ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سر کس چیز پر دکھایا جائے۔ دہلیز یا چوکھٹ، یہ دونوں الفاظ لکھے جا سکتے ہیں، لیکن میری نثر کے مزاج کے خلاف ہیں۔ سخت پریشان رہا۔ معین احسن جذبی صاحب سے ذکر کیا۔ وہ ٹہلتے رہے، سوچتے رہے اور فرمایا ''استاد لفظ کو بنانا پڑے گا۔'' دو تین راتوں کی فکر کے بعد ایک فقرہ ہاتھ لگا کہ اس کا سر فرش اور پانی کے خطِ تقسیم پر رکھا تھا اور بال پانی میں پڑے تھے۔ جذبی صاحب کو میں نے سنایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا، آج تم کو چائے نہیں پلاؤں گا، حلوہ بھی کھلاؤں گا۔ میرا جی خوش کر دیا۔ راشد صاحب کیا ہمارے لکھنے والے ایک لفظ کی تلاش میں اتنی مشقت کر سکتے ہیں، یا ان کے پاس موجودہ حالات میں اتنی مشقت کا وقت ہے؟

راشد: آپ نے اپنے ناول ''غالب'' کے حوالے سے بعض دلچسپ باتوں کا انکشاف کیا۔ غالب کی زندگی نشیب و فراز سے مسلسل دوچار رہی اور اس بنا پر ایک دلچسپ ناول کا جواز فراہم کرتی ہے، لیکن آپ کے تاریخی ناول ''غالب'' کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو دارا شکوہ، شب گزیدہ اور خالد بن ولید کے حصے میں آئی۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

قاضی عبدالستار: اس کی وجہ صاف ہے۔ منٹو کی لکھی ہوئی فلم اس کی بنیادی وجہ رہی۔ وہ غالب جو منٹو نے پیش کیا ہے وہ فلم دیکھنے والوں کے حواس پر طاری ہے۔ میں نے جس غالب کو پیش کیا، وہ مغل تہذیب کا کڑھا ہوا، سجا ہوا آخری نمائندہ ہے۔ میرے یہاں غالب کے وسیلے سے مغل تہذیب کا بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جو اس کا حق تھا۔ پڑھنے والوں کے ذہن پر منٹو کا غالب، غالب رہا۔ ویسے ناول غالب کے سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جب سید والا تبار حامد صاحب وائس چانسلر تھے تو ان کے اشارے پر ایک جلسہ ہوا جس میں وہ تشریف لائے اور میں نے ''غالب'' ناول کا وہ حصہ پڑھا جو

لکھنؤ پر تھا۔ سید والا تبار نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ میں ابھی تک ''یادوں کی برات'' میں لکھنؤ کا جو ذکر ہے اس کو لکھنؤ کے بیانات میں حرفِ آخر سمجھتا تھا، لیکن آج قاضی عبدالستار کو سن کر میں نے اپنی رائے بدل دی۔ یہ tributeانھوں نے مجھے دیا ہے۔

راشد: ایک زمانہ تھا جب ادب کے سنجیدہ شعرا مشاعروں کی زینت ہوا کرتے تھے، لیکن وقت اور زمانے نے اس تیزی کے ساتھ کروٹ بدلی کہ سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ اب مشاعرے باز شعرا اسٹیج پر حاوی نظر آتے ہیں اور سنجیدہ شعرا کا وجود پسِ پشت جا پڑا ہے۔ اگر کبھی سنجیدہ شعرا مشاعروں کے اسٹیج پر موجود بھی ہوتے ہیں تو ان کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مشاعرے مقبول ہو رہے ہیں، لیکن شاعری کا معیار کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ سنجیدہ شعرا کو حاشیے پر جگہ دی جانے لگی ہے۔ یہ اقدار کی شکست و ریخت نہیں تو اور کیا ہے؟

قاضی عبدالستار: جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو سیتاپور جیسی چھوٹی جگہ پر کڑکڑاتے جاڑوں کی تھرتھراتی راتوں میں شامیانے کے نیچے دو دو ہزار کا مجمع صبح کاذب تک بیٹھا مشاعرہ سنتا رہتا تھا اور اس مجمع میں کم از کم سو شیروانی پوش سامعین ہوتے تھے۔ جب میں یونیورسٹی میں آیا تو مشاعرے کا مجمع کم ہونے لگا۔ تاریخ کی ایک کروٹ نے اردو تہذیب کے پیروں کے نیچے سے زمین چھین لی۔ مشاعرے کی روایت جو ہماری تہذیب کی علامت تھی، وہ بری طرح متاثر ہوئی۔ یہ تو تاریخ کا جبر تھا، لیکن یہ بھی ہوا ہے کہ کچھ گھٹیا شاعر لیکن بڑے افسر اور دولت مند اور بااثر حضرات مشاعرہ پڑھنے لگے اور مجمع نے انھیں ہوٹ کردیا۔ انھوں نے اپنی اصلاح تو نہیں کی، لیکن مشاعرے کو برباد کردیا۔ عام طور پر محفلوں میں کہا جانے لگا کہ مشاعرے میں کم پڑھے لکھے لوگ، گا بجا کر شہرت حاصل کر رہے ہیں اور انھیں حضرات میں سے کچھ نے رسالے نکالنے شروع کیے اور اپنی کمزور غزلوں کو جریدوں میں سنہری روشنائی سے چھاپنا شروع

کر دیا اور تاثر دیا کہ یہ ادبی غزلیں ہیں۔ ہندی کے کچھ لوگ بھی مشاعروں کی مقبولیت سے چراغ پا تھے۔ ان کو بھی مشاعروں کو ناکام کرنے کا سنہرا موقع میسر آ گیا۔ وہ سامعین میں بیٹھ کر واہ واہ کے ایسے نعرے لگانے لگے کہ داد و بے داد کا فرق ختم ہو گیا اور مشاعرہ ایک مضحکہ خیز عمل بن گیا اور یہ حالت بڑھتی چلی گئی۔ جو صورت آپ کے سامنے ہے، یہ پوری ایک فصل ہے۔ یہ اسی بیج کی پیداوار ہے جس کا ذکر میں نے کیا۔ آج بھی بہت سے اچھے شاعر ہیں جو مشاعروں میں جاتے ہیں، داد بھی سمیٹتے ہیں اور ادب میں بھی اپنا مقام بناتے ہیں، لیکن وہ افسر شاعر، دولت مند شاعر، بااثر شاعر، جن کی غزلیں مشاعروں میں ناکام ہو گئیں، وہ مشاعرے پر تبرّہ بھیجنے میں مصروف ہیں۔ ہر زمانے میں مشاعروں سے بہت اہم کام لیے جاتے رہے ہیں، اور آئندہ بھی لیے جاتے رہیں گے۔ بس ذرا اسی حماقتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے یا کم ہو جائے تو بہتری کے آثار ضرور پیدا ہوں گے۔

راشد: قاضی صاحب! تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے سے کس طرح منسلک اور کس حد تک مختلف ہیں۔ بحیثیت فکشن رائٹر آپ نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں انھیں کس طرح برتا ہے؟

قاضی عبدالستار: راشد صاحب، اگر آپ علی گڑھ کے طالب علم ہوتے تو میرے اسٹوڈنٹ ہوتے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جب ناول یا افسانہ لکھتا ہوں تو بالارادہ طور پر تہذیب کو پیش کرتا ہوں، نہ ثقافت کو پیش کرتا ہوں۔ میں اپنی کہانی کو پیش کرتا ہوں، اپنے کرداروں کو پیش کرتا ہوں۔ ان کے اردگرد جیسی زندگی ہے، اسے پیش کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے فکشن میں تہذیب خود بخود در آتی ہے، میں اسے باندھ کر نہیں لاتا۔ اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

راشد: جاگیردارانہ تہذیب کی اقدار جواب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں، انھیں تازہ کریں

تو خوشی ہوگی۔

نی عبدالستار: وہ تو آپ میرے افسانے اور ناول پڑھ لیجیے۔ میں ان اقدار کو مچھلی بازار میں مچھلیوں کے اقسام کی طرح الگ الگ پیش کرنے اور بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

شد: ایوارڈ یا اعزاز، کس شاعر و ادیب کے ادبی مرتبے میں بھلے ہی اضافے کا باعث نہیں ہوتا، لیکن اس کی مجموعی شخصیت اس سے بہرحال متاثر ہوتی ہے۔ ایوارڈ یا اعزاز کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔

ضی عبدالستار: بہت ٹیڑھا ترچھا سوال ہے اور بہت سچا سوال ہے اور بہت مشکل سوال ہے۔ میرے لیے ایوارڈ روپے کی قیمت رکھتا ہے۔ میرے مصارف، میری پنشن اور مجھر بیٹے کی آمدنی کے باوجود پورے نہیں ہوتے، لیکن جب کوئی ایوارڈ ملتا ہے تو میرے باورچی خانے میں بہار آ جاتی ہے۔ میرے نزدیک ایوارڈ کی سب سے بڑی قیمت یہی ہے۔ اردو ادب میں ایوارڈ بکتے ہیں۔ آپ اس شخص یا اس کمیٹی کے افراد کو خوش کر دیجیے اپنی خدمات سے، یا خرید لیجیے ان کی رائے کو، آپ کو ایوارڈ مل جائے گا۔ نارنگ ساقی نے اپنی کتاب میں کئی ایوارڈ کی روداد بیان کی ہے۔ اسے پڑھیے تو حیرت ہوگی، افسوس ہوگا۔ یہ سب تو ہے لیکن ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے لوگ کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں، یہ روداد نہیں لکھی جا سکتی۔ ہمارے دوست وہاب اشرفی ایوارڈ کے لیے بے چین تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہاب صاحب آپ اردو کے ہر ایوارڈ سے بلند ہیں۔ اردو کے تمام ایوارڈ آپ کے لیے چھوٹے ہیں۔ آپ کو کیا فکر ہے، لیکن ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ جب ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ان کو ملا تو ان کو غیر معمولی مسرت ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ غالب ایوارڈ حاصل کرنے کے چکر میں کاواک نگاری کا شکار ہوئے۔ غالب ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے ایک صاحب کو وہاب اشرفی نے صاحبِ طرز ادیب لکھ دیا، جو بے چارے صحیح نثر لکھنے سے بھی عاجز ہیں۔ اس

امید پر لکھ دیا کہ شاید یہ صاحب مجھے ایوارڈ دلا دیں۔ میں وہاب اشرفی سے بہت محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں، لیکن مجھے ان کے ایوارڈ حاصل کرنے کی ابتلاع میں مبتلا ہونے کا ہمیشہ غم رہا۔ اس ایک مثال سے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کے ادیب و شاعر کس کس طرح کاسہ لیسی کرتے ہیں۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ ایوارڈ یا اعزاز سے متعلق آپ کے خیالات واقعی بے حد تلخ ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کئی جگہوں پر، شعوری یا لاشعوری طور پر آپ کو نظر انداز کیا گیا۔ اس بنا پر آپ کا غصہ یا شدید ردِ عمل عین فطری ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی بڑے اور اہم انعامات آپ کے حصے میں بھی آئے۔ انعامات حاصل کرنے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں اور جن کا آپ نے ابھی ذکر کیا، ان باتوں کے پیش نظر آپ کو دیے گئے ایوارڈ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

قاضی عبدالستار: جہاں تک میرا سوال ہے، صرف دو ایوارڈ ہیں جن کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ ایوارڈ ملنے سے پہلے مجھے اطلاع مل گئی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں قاضی عبدالودود صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ آیا (وہ پوسٹ کارڈ ہی لکھتے تھے، افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنی دولت اور ثروت کے باوجود وہ پوسٹ کارڈ لکھتے تھے)۔ اس کا خط اتنا مہین تھا اور قریب قریب تھا کہ میں پڑھ نہیں پایا۔ میں نسیم قریشی صاحب کے پاس گیا جو خط شکستہ وغیرہ سے واقف تھے۔ انھوں نے بہت توجہ سے پڑھا اور مجھے بتایا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے آپ کو اطلاع دی ہے کہ غالب کمیٹی نے متفقہ طور پر آپ کو فکشن کا پہلا غالب ایوارڈ عطا کیا۔ بہت دنوں کے بعد میرے شاگرد پروفیسر نصیر احمد خاں نے مجھے مطلع کیا کہ آپ کو بہادر شاہ ظفر ایوارڈ مل گیا۔ اس کے علاوہ بڑے ایوارڈ کیا، چھوٹے چھوٹے ایوارڈس کے بارے میں بھی مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ مجھے کیسے مل گیا۔

مری بات روکھی، مری چال ٹیڑھی

مجھے میر جانا ہے یاں کم کسو نے

میری حالت تو یہ ہے کہ مجھ پر غالب کا وہ شعر صادق آتا ہے:

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

ان سب صفات عالیہ سے باوجود اگر مجھے ایوارڈ ملے تو خدا گواہ ہے کہ خدا کا شکر گزار ہوں اور پوری انکساری اور خاکساری کے ساتھ ہی نہیں، حیرت زدگی کے ساتھ ایوارڈ قبول کرتا ہوں۔ اس کا ادبی مرتبے سے کوئی تعلق نہیں۔

راشد: شہریار کے متعلق کسی بڑے نقاد نے غالباً علی گڑھ میں ہی کہا تھا کہ ان کی شہرت میں دانش گاہ علی گڑھ کا خاص دخل رہا ہے۔ اگر ان کا تعلق کسی قصبے یا ادب کے غیر مرکزی علاقے سے ہوتا تو وہ بھی ان سینکڑوں ہزاروں شاعروں کی طرح گم نام ہوتے۔ آپ شہریار کی شاعری کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں جنھیں ادب کا سب سے بڑا اعزاز گیان پیٹھ دیا گیا؟

قاضی عبدالستار: یہ خیال شمس الرحمٰن فاروقی نے علی گڑھ میں ظاہر کیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی بہت سی باتوں سے میں اختلاف کرتا ہوں لیکن ان کے اس قول سے میں پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور کو شہریار نے اپنے شیشے میں اُتار لیا تھا اور اس طرح اُتارا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے شہریار کی لکچرارشپ کی سلیکشن کمیٹی میں یہ فرمایا کہ شہریار کی تھیس منظور ہو چکی ہے۔ اس لیے میں ان کا نام recommend کرتا ہوں۔ پورا علی گڑھ جانتا ہے کہ شہریار کی تھیس پروفیسر ثریا حسین کے زمانے میں مکمل ہوئی اور مشہور ہے دروغ بر گردنِ راوی کہ ان کی تھیس کی تیاری میں پروفیسر نورالحسن نقوی کی قلمی مزدوری کا بڑا دخل رہا ہے۔ سرور صاحب جب صاحبِ اختیار تھے اور ساہتیہ اکیڈمی ان کے قبضۂ اقتدار میں تھی تو انھوں نے بھی ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دینے میں انصاف نہیں کیا۔ مثلاً کرشن چندر کو ایوارڈ نہیں ملا، عصمت کو ایوارڈ نہیں ملا،

حیات اللہ انصاری کو ایوارڈ نہیں ملا، لیکن اختر الایمان کو ایوارڈ ملا۔ میں نے ''ہماری زبان'' میں اس ایوارڈ کے خلاف سخت مضمون لکھا تھا اور استاد محترم نے اسے مسکرا کر شائع کیا تھا۔ جب گوپی چند نارنگ ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہوئے تو جن دو ایک حضرات کا وہ بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے، ان میں سرور صاحب سرفہرست تھے۔ جب تک سرور صاحب زندہ رہے، انھوں نے شہریار کے سلسلے میں جتنی امداد ممکن تھی وہ سب کی۔ شہریار کو خدا نے ایک ملکہ دیا تھا کہ وہ آدمیوں کی ایسی خدمت کرتے تھے کہ وہ شہریار کی بات مان لیا کرتا تھا۔ اس کی بہترین مثال خاکسار ہے۔ سرور صاحب کے شاگردوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے شہریار کی مدد نہ کی ہو۔ ان کی شاعری کے انگریزی ترجمے سرور صاحب کی عنایت کی مثال ہیں۔ یہ ذکر میں نے اس لیے کہ گیان پیٹھ کی کمیٹی میں جو صاحب زادے جج ہو کر گئے تھے انھوں نے اس بات پر بہت زور دیا تھا کہ ان کی شاعری کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے۔ جہاں تک شمس الرحمٰن فاروقی کے قول کا سوال ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے، اس لیے کہ سرور صاحب مشاعرے میں بھی شہریار کا نام بھیجتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ بلائے جائیں۔ ایک آدھ مشاعرے کا دعوت نامہ میری موجودگی میں آیا۔ ہاں آپ نے ایوارڈ کا بھی ذکر کیا تھا۔ سرور صاحب ریٹائر ہو چکے تھے، کافی دن ہو چکے تھے۔ جب ان کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اور مسکرا کر مبارک باد قبول کرتے تھے، تو دوسروں کا کیا ذکر۔ شہریار اگر قصبے میں نہیں، لکھنؤ میں ہوتے تو بھی اردو کے سو پچاس شاعروں میں کہیں شمار ہوتا۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کی بے باکی سے گھبراہٹ بھی ہوتی ہے کہ پتہ نہیں کون، کب اور کس طرح آپ کی تنقید کی زد میں آجائے۔ ایسا گمان گزرتا ہے کہ اس قدر تلخ رائے کا اظہار یا قدرے بے باکی کیا۔ ابتدائی محرومی کی بنا پر شروع سے

آپ کے مزاج کا حصہ رہی، یا پھر مخصوص ماحول یا مخصوص شخصیات کا شعوری یا لاشعوری اثر قبول کرتے ہوئے آپ کا مزاج بھی اسی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔

میں نے سنا ہے کہ قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد جو اچھے اچھوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے، ان لوگوں سے بھی آپ کے بہتر مراسم تھے۔ جب اس معیار کے لوگ کسی کو اہمیت دیتے ہوں تو اس کے مزاج میں ٹیڑھ پن کا آجانا عین فطری ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا سوچتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: یہ دونوں شخصیات اردو ادب کی بڑی شخصیات تھیں۔ مجھے ان سے بہت قریب رہنے کا موقع نہیں ملا۔ چند ملاقاتیں رہیں، لیکن ان دونوں نے ہی مجھے بہت عزت دی۔ میں نے آمد کے کسی شمارے میں ایک خط عزیزم خورشید اکبر کے نام لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے، اسے پڑھ لیجیے۔ یہاں اتنا عرض کر دوں کہ جب قاضی عبدالودود نے مجھے کھانے پر یاد فرمایا تو بھائی صاحب پروفیسر اختر اورینوی نے مسکرا کر مجھ سے فرمایا تھا کہ ذرا احتیاط برتیے گا۔ یہ کہہ کر ہنسے تھے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ ہم سب مشتاق ہو گئے سننے کے۔ فرمایا قاضی صاحب نے کرشن چندر کی بھی دعوت کی تھی۔ ابھی کرشن چندر بریانی نوش فرما رہے تھے کہ ان کے منہ سے نکل گیا قاضی صاحب کیا آپ نے مجھے پڑھا ہے۔ انھوں نے کہا جی ہاں۔ میں نے آپ کو خاصا پڑھا ہے۔ کرشن چندر بہت خوش ہوئے۔ بولے آپ اپنی رائے کا اظہار فرما سکتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا جی ہاں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ لکھنا بند کر دیجیے اور ماسٹر رائٹرز کو پڑھنا شروع کر دیجیے۔ اختر بھائی نے پھر قہقہہ لگایا اور فرمایا کرشن چندر کے ہاتھ کانپنے لگے۔ شیرینی کا شوق کرنے سے محروم رہ گئے۔ میں ڈرتے ڈرتے اختر بھائی صاحب اور شکیلہ آپا کی معیت میں بھنور پوکھر پہنچا۔ زینے پر قاضی صاحب استقبال کے لیے تشریف فرما تھے۔ ہم لوگ دس بارہ آدمی تھے۔ سب لوگوں کو بے حد کشادہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ کچھ پُر تکلف باتیں کیں جس میں شرکت میری بساط سے زیادہ تھی۔

خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ ہم سب کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں سوپ آیا۔ انگلش کراکری میں سوپ آیا۔ پیالے تو چینی کے تھے، سوپ کے چمچے بھی چینی ہی کے تھے، بلکہ ہوتے ہی چینی کے ہیں۔ پھر کھانے کے لیے ہم لوگ تیسرے کمرے میں لے جائے گئے۔ بہترین کراکری اور چاندی کی کٹلری کے ساتھ کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ چوتھے کمرے میں آ گئے۔ یہاں بہت ہی نفیس کافی سیٹ میں کافی پیش ہوئی، سگریٹ پیش ہوئی، پان پیش ہوئے۔ ظاہر ہے میں کسی چیز کو چھونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ آج کے لوگ ہوتے تو کم از کم پان ضرور کھا لیتے۔ جب رخصت کرنے کے لیے قاضی صاحب نیچے تشریف لائے تو میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ہم بھی قاضی ہیں، اس رشتے سے اب کی جب آیئے، ہمارے ساتھ قیام کیجیے۔ اس تفصیلی ملاقات کے بعد جب مختصر ملاقاتیں اور ہوئیں جن کے ذریعے ان کی محبت، ان کا خلوص ذہن میں نقش ہو گیا۔

کلیم الدین احمد صاحب کا جب انتقال ہوا تو ان کی بیگم کا خط آیا کہ آپ کلیم صاحب پر مضمون لکھیے۔ میرا جی تو چاہا، لیکن انکساری اور خاکساری نے قلم نہیں اُٹھانے دیا۔ کلیم صاحب کا رعب ایک زمانے تک قائم رہا۔ لوگ ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ تحقیق کے مقالے تو وہ اکثر و بیشتر reject کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ سرور صاحب ہم سے ناخوش ہو چکے تھے۔ میری نگرانی میں بھوپال کے ایک طالب علم ہارون ایوب نے پی ایچ ڈی کی تھیسس مکمل کی۔ Board of Studies کی میٹنگ میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور نے پوچھا کس کو Examiner مقرر کروں۔ آپ نام بتائیے۔ میں نے عرض کیا جناب والا جس کو چاہیں، مقرر فرما دیں۔ پان کی گلوری منہ میں رکھی۔ مسکرائے کلیم الدین کا نام لکھ دوں۔ سرور صاحب کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں ان کے یہاں چائے پی چکا ہوں۔ میں نے بظاہر کچھ

پریشان ہو کر عرض کیا۔ لکھ دیجیے، اور دوسرا نام۔ میں نے کہا جو آپ کا جی چاہے۔ پروفیسر اعجاز حسین کا نام لکھ دوں۔ جی لکھ دیجیے۔ پورے ڈپارٹمنٹ کو یقین تھا کہ میں برباد ہو گیا۔ دونوں میں کوئی ایسا نہیں جو مہینوں سے پہلے تھیسس کے پہنچنے کا اقرار کرتا ہو۔ پندرہ دن ہوئے تھے کہ کلیم صاحب کی رپورٹ آ گئی۔ رجسٹرار آفس میں میرا ایک شاگرد اسی سیکشن میں تھا۔ چند روز بعد اس نے اطلاع دی کہ پروفیسر اعجاز حسین کی رپورٹ بھی آ گئی۔ میں نے اس کی انتہائی کوشش کی بنا پر سہولت حاصل کی کہ رپورٹ پڑھ لوں۔ رپورٹ پڑھی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے تھری پیس پہنا اور شام کو پروفیسر کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ اطلاع دی کہ جناب والا رجسٹرار آفس سے خبر آئی ہے کہ دونوں رپورٹ آ گئیں۔ سرور صاحب بدحظ ہوئے، لیکن خاموش رہے۔ میں کلب چلا گیا۔ دوسرے دن مجھے بلایا۔ ہارون ایوب کو یہاں آنے میں کب سہولت ہوگی۔ Viva-Vocee کے لیے آتا ہے۔ میں نے عرض کیا، میرا خیال ہے بیس دن دے دیے جائیں۔ بھوپال سے آئے گا۔ خیر دفتری approval مل گیا۔ اسی دوران سرور صاحب ریٹائر ہو گئے اور پروفیسر خورشید الاسلام صدر شعبہ ہو گئے۔ کلیم صاحب تشریف لائے۔ گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ صبح ڈپارٹمنٹ آئے۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے انتہائی بدتہذیبی کا اظہار کرتے ہوئے شعبے میں آنے سے انکار کر دیا۔ صرف میں تھا۔ ہارون ایوب جب سامنے کرسی پر بیٹھے تو کلیم صاحب کی ہیبت سے نرکل کے درخت کی طرح کانپ رہے تھے۔ کلیم صاحب نے ان کو دیکھا۔ مجھے حکم دیا کہ میں چائے منگواؤں۔ پہلی پیالی ہارون ایوب کو دی گئی۔ انھوں نے چند گھونٹ لیے تھے۔ کلیم صاحب نے کہا میں اپنی رپورٹ بھیج چکا ہوں۔ آپ پی ایچ ڈی ہو گئے۔ یہ تو محض دفتری کارروائی ہے۔ آپ اطمینان سے جواب دیجیے۔ ایسا لگا جیسے ہارون ایوب زندہ ہو گیا ہے، اور کانپتے تھرتھراتے ہوئے اس نے جواب دیے۔ حکم ہوا کہ

رپورٹ لکھیے۔ میں نے کہا سر آپ کے سامنے رپورٹ لکھنا کتنی بے ادبی اور بدتہذیبی ہے۔ تبسم خفی کے ساتھ پیڈ اُٹھایا۔ پورے ایک صفحے پر رپورٹ لکھی۔ پھر میں ان کو گیسٹ ہاؤس پہنچانے گیا۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ لنچ میں شرکت کی۔ وہیں کلیم صاحب نے فرمایا کہ آپ کو اردو فکشن کا پہلا غالب ایوارڈ ملا ہے۔ آپ کو اطلاع ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ قاضی صاحب کا خط آ چکا ہے۔ فرمایا مجھے اردو تنقید کا پہلا ایوارڈ ملا ہے۔ اب آپ سے دہلی میں ملاقات ہوگی اور وہ ٹیکسی سے دہلی چلے گئے۔ پھر ڈیڑھ مہینے کے بعد غالب ایوارڈ کی Investu are ceremony ہوئی۔ پہلا نام کلیم صاحب کا پکارا گیا۔ دوسرا نام خاکسار کا۔ تیسرا نام گیان چند جین کا۔ ان کو اردو تحقیق کا پہلا غالب ایوارڈ ملا تھا، لیکن وہ اتنے ناشکرے نکلے کہ ''ایک زبان اور دو لکھاوٹ'' میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں کلیم صاحب کے ساتھ ان کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب لنچ تھا۔ انعامات آنریبل اندرا گاندھی وزیراعظیم ہندوستان کے ہاتھ سے دیے گئے۔ لنچ بھی انھیں کی طرف سے تھا۔ کلیم صاحب سفید شیروانی، بڑے پائنچے کا پائجامہ، سیاہ موزہ، سیاہ جوتے پہنے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ آف وائٹ سلک کی ساڑی باندھے ہوئی تھیں۔ میں نے ابھی اپنی پلیٹ کی خدمت کی ہی تھی کہ بیگم صاحبہ نے کان میں کہا کلیم صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں فوراً لپک کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسکرائے، فرمایا۔ میڈل کی ڈبیا میری ہے۔ اس کے اندر میڈل آپ کا ہے۔ میں نے کہا سر میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ تو میرا اعزاز ہے کہ آپ کے نام کا میڈل میرے ہاتھ میں آ گیا۔ جی تو چاہتا ہے کہ نہ دوں لیکن بے ادبی کا مرتکب بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے پیش کرتا ہوں۔ کلیم صاحب خوش ہوئے۔ بیگم صاحبہ ان سے زیادہ خوش ہوئیں۔ چلتے وقت حکم دیا کہ پٹنہ آئیے گا تو ملیے گا۔ کرم کا یہ اعزاز مجھے نصیب ہوا، جس پر میں ناز کرتا ہوں، فخر کرتا ہوں۔ یہ وہی کلیم صاحب ہیں کہ جب استاد محترم آل احمد

سرور پٹنہ تشریف لے گئے تو کلیم صاحب سے ملنے گئے۔ کلیم صاحب نے پوچھا آپ کب تشریف لائے۔ دوسرا سوال کیا، آپ کا قیام کب تک ہے۔ تیسرا جملہ فرمایا بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، خدا حافظ۔ تو ایسے لوگوں نے جب خاکسار کو اہمیت دی تو ہما شما سے میں کیسے مرعوب ہو سکتا ہوں۔

راشد: تو گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے اندر انانیت ہے۔ انانیت کو اگر خود کی شناخت کے مثبت پہلوؤں سے تعبیر کیا جائے تو اس سے تخلیقی فن کار کی شخصیت مزید نکھرتی ہے۔ ہاں انانیت اگر بے جا انانیت میں تبدیل ہو جائے تو اس کے مضر اثرات سامنے آتے ہیں۔ آپ کے مزاج اور رویے میں جو انانیت ہے، اسے آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

قاضی عبدالستار: ہمارے شعبے میں ایک مغبچہ، قرطاس وقلم اور یونیورسٹی کے ایک پیر فرتوت کو انانیت سے بہت نفرت پیدا ہوئی۔ اصل میں کم لوگ انانیت کے معنی جانتے ہیں۔ انانیت کا تخلیق سے وہی تعلق ہے جو سرسید کا علی گڑھ سے ہے۔ اگر انانیت نہیں ہے اور سب کچھ صحیح لکھا جا رہا ہے تو آپ کو شعر کہنے اور افسانہ لکھنے اور تنقید پر رقم طراز ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ آپ قلم اس وقت اُٹھاتے ہیں جب آپ کا دل کہتا ہے کہ میں اس سے بہتر شعر کہہ سکتا ہوں، میں اس سے بہتر افسانے لکھ سکتا ہوں، میں اس سے بہتر تنقید رقم کر سکتا ہوں، تبھی آپ لکھتے ہیں۔ یعنی انانیت اور تخلیق لازم و ملزوم ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انانیت ہر کس و ناکس میں بھی ہوتی ہے۔ جانور تک اس سے محفوظ نہیں ہے۔ شیر، ہاتھی اور طاؤس کی گرجن سے اس کی انانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہاں چوہے، چھچھوندر اور چھپکلی اس صفتِ عالیہ سے محفوظ ہیں۔

شد: قاضی صاحب! وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویوں میں بنیادی تبدیلیاں آتی ہیں، لیکن زندگی میں منصب حاصل کرنے کے بعد وہ سابقہ چیزیں فراموش کر دیتے ہیں۔ یعنی تعلقات کا سلسلہ اسی وقت تک جاری رہا ہے جب تک

کسی نہ کسی کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی امید برقرار رہتی ہے۔ کام مکمل ہوا اور جس لمحے بھی یہ اندازہ ہوا کہ اب آئندہ فلاں شخص سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی جاتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کی سرشت میں شامل ہیں، لیکن ایک ادیب جس کی امیج ہر لحاظ سے آئیڈیل ہوتی ہے جب وہ اس نوع کے کارنامے انجام دیتا ہے تو کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوتی ہے۔ اس نفسیات پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالیں۔

قاضی عبدالستار: بالکل درست فرمایا آپ نے۔ یہ چیزیں بہت حد تک انسانی سرشت کا حصہ ہیں۔ کچھ لوگ اس سے مبرا بھی ہوتے ہیں، لیکن ہاں زیادہ تر لوگ اسی زمرے میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے کئی لوگوں سے میرا واسطہ رہا ہے، یہاں صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ بہت دن ہوئے ایک صاحب زادے پہلی بیوی کو چھوڑ کر دیوبند کی سند تھام کر، منھ پر داڑھی لگا کر علی گڑھ تشریف لائے۔ یہاں آئے تو احساس ہوا کہ داڑھی اقلیت میں ہے اور یہ بھی کہ مہ جبینوں کا ہجوم داڑھی کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ پہلی ہی فرصت میں فارغ البال ہوگئے۔ انھوں نے پہلی فرصت میں یہ اندازہ لگالیا کہ ڈپارٹمنٹ میں گھسنے کے لیے قاضی عبدالستار جیسے منھ پھٹ آدمی سے بنا کر رکھنا چاہیے، اور یہ بھی کہ پروفیسر آل احمد سرور، ناخوش ہونے کے باوجود قاضی عبدالستار کے مشوروں کا لحاظ کرتے ہیں۔ عزیزی نے سب سے پہلے مجھے 'ابا' کہہ کر پکارا۔ خیر، خدا کے فضل و کرم سے وہ لکچرار ہوگئے۔ جب وہ ریڈرشپ کی آرزو میں مبتلا ہوئے تو میں ابا سے چچا ہوگیا۔ جب وہ پروفیسر شپ کی سیڑھیوں پر چڑھنے والے ہوئے تو میں چچا سے بڑا بھائی ہوگیا۔ پروفیسر ہونے کے بعد میرے ان کے تعلقات مساویانہ ہوگئے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں اور نیرنگئ زمانہ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔

راشد: زمین دارانہ زوال تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چوں کہ آپ

خود اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو اس زوال کے منفی اثرات سے آپ کی زندگی کس طرح متاثر ہوئی۔

قاضی عبدالستار: جدیدیت کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک کے چند کروڑ عوام نے انقلاب برپا کیا اور دنیائے ادب میں زلزلہ آ گیا، لیکن ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ جو یورپ کی مجموعی آبادی کا دوگنا ہوگا، اچانک آزاد ہوا یعنی زمین داری کا Abolution ہو گیا۔ خاتمہ زمین داری ہو گیا۔ کروڑوں انسان آزاد ہوئے۔ زمین دار حکم دیتا تھا فلاں گاؤں میں جاؤ، چار گاڑیاں اور دس آدمی لے آؤ۔ آدمی جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ اب گاؤں میں کوئی آدمی نہیں ہے۔ سب کے نام ہیں۔ یہ معمولی انقلاب ہے؟ لیکن اتنے بڑے انقلاب کی آہٹ آپ کو اردو ادب میں نہیں ملے گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے خاتمۂ زمین داری روز کا معمول ہو۔ کتنے لوگوں نے اس پر ناول یا افسانے لکھے ہیں؟ آپ خود سوچیے۔ خاتمۂ زمین داری سے صرف زمین دار ہی برباد نہیں ہوا، بلکہ ایک تہذیب برباد ہو گئی، شیروانیاں منظر نامے سے غائب ہو گئیں، آداب و تسلیمات کا رواج اُٹھ گیا، کھانے پینے کے آداب تبدیل ہو گئے۔ جو چیزیں تہذیب سے وابستہ تھیں وہ غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ خالی رہ گئی۔ اس کا ادیب کو بھی احساس نہیں ہے۔ کیوں احساس نہیں ہے؟ یہ بات حیرت ناک ہے۔ یہ تو سب کہتے ہیں کہ قاضی عبدالستار نے پریم چند سے بہت مختلف اور منقلب دیہات پر لکھا ہے، لیکن تفصیل نہیں بتاتے کہ کسی اور نے بھی لکھا ہے؟

راشد: وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں آتی ہیں اور یہ تبدیلیاں بہت حد تک فطری بھی ہوتی ہیں، لیکن انسان کو عموماً اپنے زمانے کی باتیں یاد آتی ہیں اور وہ نئی تبدیلیوں کو منفی زاویوں سے دیکھتا ہے۔ پہلے کا علی گڑھ جس نے دیکھا ہے، اسے آج کا علی گڑھ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ریسرچ کے دوران آپ بھی

علی گڑھ کی اقامتی زندگی سے دوچار ہوئے۔ ہاسٹل لائف کے یادگار لمحوں کو اگر
آپ تازہ کریں تو کون سی یادیں اب تک آپ کے ذہن میں دستک دیتی ہیں۔

قاضی عبدالستار: میرا جواب تو آپ کے سوال میں پوشیدہ ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ
اس کا اپنا زمانہ بہت سنہرا نظر آتا ہے اور بعد کا زمانہ خواہ وہ سنہرا ہی کیوں نہ ہو،
مٹیالہ معلوم ہوتا ہے، لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی آج سے
پچیس برس پہلے جتنی مہذب، مؤدب اور تہذیب شناس تھی، وہ آج نہیں ہے۔
مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب میں آفتاب ہاسٹل اور ممتاز ہاسٹل کے سامنے
سڑک پر کرتا پاجامہ پہنے مسواک کرتے لوگوں کو سڑک پر چلتے اور تھوکتے پاتا
ہوں۔ علی گڑھ کی شان یہ تھی کہ ہر چیز قابلِ رشک تھی۔ جب میں علی گڑھ آیا وہ
ذاکر صاحب کا آخری زمانہ تھا۔ جذبی صاحب نے مجھے ٹہلتے ہوئے بتایا کہ
ایک طالب علم اسٹاف کلب کے سامنے سے شیروانی کے کچھ بٹن کھولے گزر رہا تھا۔
دوسری طرف سے ذاکر صاحب کی گاڑی آرہی تھی۔ ذاکر صاحب فوراً اُترے۔
صاحب زادے کی شیروانی کے بٹن لگائے اور فرمایا اب جایئے۔ میں نہیں
جانتا کہ ذاکر صاحب مسواک کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ طریقہ یہ ہے کہ کوئی
چھوٹا، بڑے سے ملنے آتا ہے تو وہ سلام کرتا ہے۔ بڑا اس کو جواب دیتا ہے،
دعائیں دیتا ہے، خیریت پوچھتا ہے، لیکن اب چھوٹا سلام کو داغ کر اپنا پورا
ہاتھ لمبا کر کے توقع کرتا ہے کہ آپ ہاتھ ملائیں۔ یہ انتہائی بے ادبی ہے، لیکن
شاید وارڈن اور اساتذہ اب تعلیم نہیں دیتے، یا ان کی تعلیم کا اثر نہیں ہوتا۔
دونوں صورتیں قابلِ رحم ہیں۔

راشد صاحب آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ میں صرف چند ماہ ہاسٹل میں رہا ہوں۔
وی ایم ہال کے جبلی وارڈن روم میں اور ایس ایس ہال کے ایس ایس ایسٹ
وارڈن کے روم میں۔ ناشتہ کر کے نکلتا تھا، کبھی کھانا کھا کر، کبھی کھانا کھانے کے
بعد کمرے میں داخل ہوتا تھا دس گیارہ بجے۔ اس لیے ہاسٹل لائف سے میرا کوئی

واسطہ نہیں رہا۔ میری اپنی کمپنی تھی جیسے پروفیسر ابوبکر، پروفیسر اشتیاق حیدر وغیرہ کے ساتھ میرا وقت گزرتا تھا۔ اس لیے میں آپ کے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ عجیب بات ہے کہ میرے احباب میں جذبی صاحب اور باقر مہدی کے علاوہ کوئی ادیب و شاعر کبھی شامل نہیں رہا۔ لکھنؤ میں بھی نہیں اور علی گڑھ میں بھی نہیں۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کے شاگردوں کی لمبی فہرست ہے۔ بعض نے تو خود فکشن کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک استاد اپنے شاگردوں سے ایک داؤ چھپا کر رکھتا ہے۔ کیا آپ نے اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت میں کوئی ایسا رویہ اختیار کیا؟

قاضی عبدالستار: یہ جو قول ہے ایک داؤ چھپا کر رکھنا تو یہ پہلوانوں کے لیے ہے۔ اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اپنے شاگردوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت کی۔ میرے پاس دو جملے بھی ایسے نہیں ہیں جو میں نے ان سے چھپائے ہوں۔ میں تو کھلی کتاب ہوں، جو کہیں سے بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ مثلاً سید محمد اشرف، طارق چھتاری، پیغام آفاقی، سید ابن کنول، انوار علیگی، تنویر نیر اور نصیر احمد خاں وغیرہ سب لکھ رہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ میری ان سب سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

اشد: آپ کا مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے اب تک دیرینہ تعلق قائم ہے۔ آج کل جو لوگ شعبے سے وابستہ ہیں، ان میں کچھ لوگ ادبی سطح پر فعال ہیں۔ موجودہ دور کے اردو ڈپارٹمنٹ کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

ضی عبدالستار: ہمارے شعبے میں ہمیشہ بڑے بڑے نام رہے اور اپنی عمر اور بساط کے مطابق اب بھی ہیں۔ مثلاً تنقید میں صغیر افراہیم، قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین اور ابوالکلام قاسمی برابر لکھ رہے ہیں۔ افسانے میں صرف طارق چھتاری ہیں، لیکن طارق کا فن اب بالیدہ، بالغ اور قابلِ قدر ہو چکا ہے

اور کوئی اگر لکھتا ہے تو مجھے علم نہیں ہے۔ شاعروں میں اب آپ میرے سامنے ہیں اور میں سامنے والے کی تعریف نہیں کرتا، لیکن مجبوری ہے۔ آپ شعر کہہ رہے ہیں، سراج اجملی کہہ رہے ہیں اور اگر کوئی اور کہتا ہے تو میں واقف نہیں ہوں۔ آپ دونوں کی گرفت شعر کے فن پر بہت مضبوط ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑے دنوں میں آپ لوگوں کی قادرالکلامی کا اظہار ہوگا۔ عجب بات ہے ابھی چند روز ہوئے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالرز کے جلسے میں گیا۔ ان کی تخلیقات سنیں، اور حیرت ہوئی۔ دو افسانے سنائے گئے، دونوں افسانے پرابلم افسانے تھے۔ آج کی زندگی کی پیداوار تھے اور محنت سے لکھے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں ان افسانوں کو منگوا کر نوک پلک درست کر کے کہیں چھپنے کے لیے بھیجوں، لیکن بیماری نے اجازت نہیں دی۔ ایک انشائیہ نگار نے بھی اچھا انشائیہ پڑھا۔ وہ اگر ملتے تو میں ان سے کہتا کہ لکھنے کی پوری عمر پڑی ہے۔ آپ ذرا قلم روک کر لکھیے۔ میں بھی نوجوانی میں بہت مشکل پسند تھا۔ میں اس تحریر کو پسند کرتا تھا جو بہت مشکل ہو۔ میرے استاد پروفیسر احتشام حسین نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے میرے کو بڑ نکالے۔

راشد: قاضی صاحب! آپ کا تازہ ناول اشاعت کے مرحلے میں ہے، اور عنقریب وہ شیدائیوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ مناسب سمجھیں تو اس ناول کے حوالے سے کچھ بتائیں۔

قاضی عبدالستار: بھئی وہ ناول مکمل تو کر لیا ہے لیکن ۸۳ برس کی عمر میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ اسے ایک بار دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ کچھ ترمیم و اضافہ کروں یا شائع ہونے دوں۔ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا ہوں۔ وہ کمپوز ہو رہا ہے، کمپوز ہو کر آئے گا تب پتہ چلے گا۔ ناول گاؤں پر ہے اور عجیب و غریب محبت پر ہے۔

راشد: قاضی صاحب! تقریباً چھ مہینوں پر مشتمل گفتگو کا آخری سوال۔ ماشاءاللہ آپ زندگی کی ۸۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں، لیکن میری دانست میں آپ گزشتہ ۳۰ برسوں سے اپنی زندگی تنہا گزار رہے ہیں۔ عمر کی اس منزل میں آپ تنہائی کی اذیت کو کس طرح برداشت کرتے ہیں؟

قاضی عبدالستار: راشد صاحب! یہ سوال نہیں ہے بلکہ میرے زخموں کو جو سر سے پاؤں تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کو کھرچ دیا ہے۔ ایک مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ تنہائی کی زندگی گزارنا ولی اللہ ہوں کا کام ہے۔ میں تو کسی معمولی سے معمولی ولی اللہ کے پاپوش کی گرد بھی نہیں ہوں، لیکن میں نے یہ برس گزارے ہیں۔ میں نے تنہائی کے اذیت ناک لمحے گزارے ہیں۔ تنہائی اگر خود تراشیدہ ہے تو جنت ہے، اور اگر نازل کی گئی ہو تو عذابِ الٰہی ہے۔ میری تنہائی میری تراشیدہ ہے۔ میں تنہائی کو ایک دلہن کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ یاد رکھیے کہ تنہائی تخلیق کی ماں ہے۔ اگر کوئی شخص تنہا نہیں رہ سکتا تو وہ تخلیق بھی نہیں کر سکتا۔

OOO

ترتیب:

نئے افسانے کا معنوی استعارہ

وہاب اشرفی

عاقمہ شبلی

نظم کے تجزیے

تراجم:

سبھاش چندر بوس

ہندوستان کی کہانیاں

پیڑ پودوں کی حکایت

زیر اشاعت:

گیت سناتی ہے ہوا (غزلیں)

افسانوں کے تجزیے (تنقید)

اردو غزل۔ فن، اختصاص

اور ارتقائی تسلسل (تنقید)

امیر المومنین عمر ابن خطاب کا قول ہے متکبرین کے سامنے کبر کا اظہار صدقہ ہے
خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۵۰ء سے آج تک یہ صدقہ دیتا چلا آ رہا ہوں اور اس کی پاداش
میں اپنے کیریر کو شدید نقصان پہنچا چکا ہوں۔ لکچرر شپ سے پروفیسر شپ تک
محرومیوں کی پوری داستان ہے۔ ملازمت کو ختم کرنے کی بھی سازش کی گئی جسے
ڈاکٹر نادر علی خاں؎ کی مداخلت نے ناکام کر دیا
اس کتاب کا مسودہ میں نے بدل کر تیار کرایا ہے۔ اس کے ایک
ایک لفظ کی صداقت کیلئے میں عدالتِ تاریخ کے سامنے جوابدہ ہوں۔
۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی داستان خونچکاں کتنے ہی نرم الفاظ میں
بیان کی جائے کسی نہ کسی کی دل آزاری کا امکان باقی رہتا ہے لیکن مجھے افسوس
اس لئے نہیں ہے کہ میں نے پوری چوتھائی صدی یہ عذاب جھیلا ہے۔

قاضی عبدالستار
۱۵ اپریل ۲۰۱۰ء

؎ نادر علی خاں حضرت نظام الدین کے مرکز تبلیغ میں موجود ہیں۔

Qazi Abdus Sattar: Asrar-o-Guftar

Rashid Anwar Rashid

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com